بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
JUNE 2009

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 3500 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 4500 روپے

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER APNS CPNE

مستقل سلسلے

جون 2009
جلد 23 شمارہ 10
قیمت 40 روپے

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقامِ اشاعت [illegible] پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 2721777, 2726617, 021-2022494 Fax: 0092-21-2766872
Email: info@khawateendigest.com, shuaamonthly@yahoo.com

شعاع کا جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
پاکستان کی تاریخ کا سب سے اہم انسانی المیہ رونما ہو چکا ہے۔ زلزلہ تو قدرتی آفت ہے جس پر انسان کا اختیار نہیں ہے نہ ہی اس کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے لیکن اس آفت کو کیا کہا جائے کہ لاکھوں افراد انتہائی مختصر نوٹس پر بے گھر کر دیے گئے ہیں۔ اپنے ہی وطن میں دربدر ہیں۔ بھرے پُرے گھر، مال مویشی، پھلوں سے لدے باغات اور تیار فصلیں چھوڑ کر آنے والے روٹی کے ایک لقمے اور پانی کے ایک گلاس کو ترس رہے ہیں۔ تپتی، ناہموار اور پتھریلی زمین پر پاپیادہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آنے والے خوشگوار موسموں کے عادی کھلے آسمان تلے چلچلاتی دھوپ میں قدرت کی نیرنگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔
یہ ہمارے اپنے ہیں۔ ہمارے ہم وطن، ہم مذہب ہیں۔ یہ پھول سے بچے، پردہ نشین عورتیں اور غیور مرد جو ہاتھ پھیلانا موت سے بدتر سمجھتے ہیں، حالات کے ستم کا شکار ہیں۔
ایک بار پھر اسی جذبے کی ضرورت ہے جس کا مظاہرہ پوری قوم نے متحد ہو کر زلزلے کے وقت کیا تھا۔ یہ زلزلے سے بھی بڑی آفت ہے۔ اس مشکل وقت کا مقابلہ اسی طرح کیا جا سکتا ہے جب پوری قوم متحد ہو کر ان بے گھر خانماں برباد لوگوں کا ساتھ دے۔ ایک بہت چھوٹا سا اور آسان کام، دن بھر میں کروڑوں روپے کے فضول سے ایس ایم ایس کر دیے جاتے ہیں۔ ان متاثرین کے لیے سوات فنڈ میں ایس ایم ایس کریں تو شاید یہ چھوٹا سا عمل چھوٹی سی نیکی کسی کے لیے زندگی میں کچھ آسانی کا باعث بن جائے۔ اس مشکل گھڑی میں ان لوگوں کو احساس دلائیں کہ پوری قوم ان کے ساتھ ہے اور ان کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ پل صراط،
- اُمِ مریم کا مکمل ناول۔ آباد شہرِ جاں رہے،
- ثمرہ بخاری اور درخشاں نگار عدنان کے ناولٹ،
- عالیہ بخاری اور راحت جبیں کے ناول،
- راحت جبیں، راشدہ رفعت، نعیمہ ناز، سندرہ سحر عمران اور مریم ماہ منیر کے افسانے،
- روبرو۔ آپ کی پسندیدہ مصنفہ نمرہ احمد آپ کے روبرو،
- ٹی وی فنکارہ مرینہ خان کی یادیں باتیں،
- ٹی وی فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ دستک۔
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ ہم نے پوری محنت سے ترتیب دیا ہے۔ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں ضرور بتائیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

تیری یاد کا جب پڑا دل پہ سایا
قلم میں نے تیری ثنا کا اٹھایا

تُو گل میں گلستاں میں جلوہ نما ہے
یہ سچ ہے تُو دونوں جہاں کا خدا ہے

تیرا روپ تاروں میں ہر سُو عیاں ہے
تیرا نور خورشید میں ضوفشاں ہے

تُو دشت و جبل میں تُو کوہ و دمن میں
معطر معطر، کلی میں، چمن میں

عیاں ہر طرف ہے تیری کبریائی
ازل سے ہے قائم تیری بادشاہی

میرے سارے رنج و الم دور کر دے
میرا دل مسرت سے بھرپور کر دے

کہ سہراب رہتا ہے تیری لگن میں
تیرا ذکر ہے اس کے کام و دہن میں

آغا سہراب لدھیانوی

نعت رسولِ مقبولؐ

ارفع ہیں بے مثال ہیں یکتا حضورؐ ہیں
پُرنور دستنیر و اُجالا حضورؐ ہیں

دونوں جہاں کی رونقیں بس آپؐ ہی سے ہیں
کچھ شک نہیں ہے عزت والا حضورؐ ہیں

جو تھے فقیر اُن کو تونگر بنا دیا
ہر ایک بے نوا کا وسیلہ حضورؐ ہیں

میرا تو ورد صبح و مسا اُن کا نام ہے
گویا صداقتوں کا خزینہ حضورؐ ہیں

صحرا بنے ہیں آپؐ کی آمد پر مرغزار
ہر گل میں ہر شجر میں ہویدا حضورؐ ہیں

میں ہوں زہیر اُن کے غلاموں کا بھی غلام
سب ہیں غلام اور شہنشاہ حضورؐ ہیں

زہیر کنجاہی

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

لعان کا بیان

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا۔

''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پوچھ کر بتایئے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی (غیر) مرد کو (گناہ میں ملوث) دیکھے اور (غصے میں آ کر) اسے قتل کر دے تو کیا اسے (قصاص میں) قتل کیا جائے گا؟ ورنہ وہ کیا کرے؟؟''

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ (مسئلہ) دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس قسم کے) سوالات کو ناپسند فرمایا۔ بعد میں حضرت عویمر رضی اللہ عنہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے ملے تو ان سے دریافت کیا اور کہا۔

''تم نے کیا کیا؟''

انہوں نے کہا۔ ''ہوا یہ ہے کہ تجھ سے مجھے بھلائی نہیں پہنچی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو آپ نے سوالات کو ناپسند فرمایا۔''

عویمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''اللہ کی قسم! میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ بات پوچھوں گا۔''

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ آپ پر ان کے بارے میں وحی نازل ہو چکی ہے۔ آپ نے ان دونوں (میاں بیوی) میں لعان کرا دیا۔ عویمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر اب میں اس عورت کو (گھر) لے جاؤں تو (اس کا مطلب ہے کہ) میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔'' چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی اس عورت کو طلاق دے دی، پھر لعان کرنے والوں میں یہی طریقہ جاری ہو گیا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''دیکھو! اگر اس عورت کے ہاں سیاہ فام، سیاہ آنکھوں والا، بڑے سرینوں والا بچہ پیدا ہوا تو میرے خیال میں اس (عویمر رضی اللہ عنہ) نے یقیناً سچ کہا ہے۔ اور اگر اس کے ہاں بیر بہوٹی جیسا سرخ بچہ پیدا ہوا تو میرے خیال میں اس (عویمر) نے ضرور جھوٹ بولا ہے۔''

راوی بیان کرتے ہیں۔ پھر اس عورت کے ہاں بری صورت والا بچہ پیدا ہوا۔

فوائد و مسائل : ○ مرد میں غیرت اچھی صفت ہے لیکن اس کی وجہ سے کسی کو قتل کر دینا جائز نہیں۔ اگر کسی کو اپنی بیوی کے کردار پر قوی شک ہے تو اسے طلاق دے دے۔ ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کو ناپسند کیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور محض شک کی بنیاد پر کسی کو سزا دینا ممکن نہیں۔ ○ اگر مرد بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے تو عورت سے پوچھا جائے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رجم کر دیا جائے، اس صورت میں مرد کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ اسی طرح اگر چار گواہ پیش کر دیے جائیں تو یہ عورت اور اس کا مجرم ساتھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ○ اگر عورت الزام کو تسلیم نہ کرے تو مرد سے کہا جائے کہ الزام لگانا جرم ہے، توبہ کرو۔ اگر وہ تسلیم کر لے کہ اس نے غلط طور پر الزام لگایا تھا تو اسے الزام تراشی کی سزا (حد قذف) کے طور پر اسی (80) کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور عورت کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ ○ اگر مرد اس الزام کے سچا ہونے پر اصرار کرے اور عورت تسلیم نہ کرتی ہو تب لعان کرایا جائے گا۔ لعان کا طریقہ اگلی حدیث میں مذکور ہے۔ ○ بری صورت والے بچے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسی شکل و شباہت والا تھا، جس سے عورت کا جرم ثابت ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود اسے رجم نہیں کیا گیا کیونکہ لعان کے بعد نہ مرد کو قذف کی حد لگائی جاتی ہے، نہ عورت پر بدکاری کی حد جاری کی جاتی ہے۔

لعان کا طریقہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بیوی پر شریک بن سحماء (رضی اللہ عنہ) سے ملوث ہونے کا الزام لگایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر (قذف کی) حد لگے گی۔''

حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں بالکل سچا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ضرور (وحی) نازل فرما دے گا، جس سے میری پیٹھ (حد لگنے سے) بچ جائے گی۔''

تو راوی فرماتے ہیں کہ تب یہ آیات نازل ہوئیں۔

ترجمہ :-

اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور ان کے پاس اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک کی شہادت اس طرح ہو گی کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ سچوں میں سے ہے ○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو ○

اور عورت سے تب سزا ٹلتی ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بلاشبہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹوں میں سے ہے۔

○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ (اس کا خاوند) سچوں میں سے ہو تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوٹے تو ان دونوں کو بلا بھیجا، وہ آ گئے تو ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر گواہی دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

''اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے تو کیا دونوں میں سے کوئی ایک توبہ کرتا ہے؟؟''

پھر خاتون کھڑی ہوئی اور اس نے گواہی دی (اور قسمیں کھائیں) جب وہ پانچویں (گواہی) کے وقت یہ کہنے لگی کہ اگر وہ جھوٹی ہو تو اس پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ تو حاضرین نے اسے کہا۔

''یہ قسم (اللہ کے غضب کو) واجب کر دینے والی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا (یہ سن کر) اس نے توقف کیا، اور پیچھے ہٹی، حتیٰ کہ ہمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ (بے گناہ ہونے کے دعوے سے) رجوع کر لے گی، پھر اس نے کہا۔

''قسم ہے اللہ کی! میں اپنی قوم کو ہمیشہ کے لیے بدنام نہیں کروں گی۔''

(اور پانچویں قسم بھی کھالی۔) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اس (کے ہاں ولادت ہونے) کا انتظار کرو۔ اگر اس نے سرمگیں آنکھوں والا، بڑے سرینوں والا، موٹی پنڈلیوں والا بچہ جنا تو وہ شریک بن سحماء کا ہو گا۔'' (وقت آنے پر) اس کے ہاں ایسا ہی بچہ پیدا ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر اللہ کی کتاب کا حکم نازل نہ ہو چکا ہوتا تو میرا اس عورت سے (دوسرا) معاملہ ہوتا۔''

فوائد و مسائل : ○ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے اللہ پر توکل کیا اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا تو اللہ نے ان کو بری کر دیا۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اور اللہ کی ذات پر اعتماد ظاہر ہوتا ہے۔ ○ پانچویں گواہی کے الفاظ پہلی چار گواہیوں سے مختلف ہیں۔ اس کا مقصد ضمیر کو بیدار کرنا ہے تاکہ فریقین میں سے جو غلطی پر ہے وہ اپنی غلطی کا اقرار کر لے اور دنیا کی سزا قبول کر کے آخرت کے عذاب سے بچ جائے۔ ○ پانچویں قسم واجب کرنے والی ہے' یعنی واقعی اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کی موجب ہے' لہٰذا یہ سمجھ کر قسم کھائیں کہ جھوٹے پر واقعی اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا نزول ہو جائے گا۔ ○ قوم کی محبت و عصبیت انسان کو بڑے گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ اس محبت کو شریعت کی حدود کے اندر رکھا جائے۔ ○ بعض اوقات انسان کسی دنیوی مفاد کے لیے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' جب کہ اس مفاد کا حصول یقینی نہیں۔ اس عورت نے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ علامت کے مطابق بچہ پیدا ہونے سے وہ غلطی ظاہر ہو گئی' جس کو چھپانے کے لیے اس نے اللہ کے غضب کو قبول کیا تھا۔ ○ اس قسم کی صورت حال میں بچے کی شکل و شباہت جرم کو ثابت کرتی ہے لیکن اگر قانونی پوزیشن ایسی ہو کہ سزا نہ مل سکتی ہو تو جج قانون کی حد سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ○ ارشاد نبوی "میرا اس عورت سے معاملہ (دوسرا) ہوتا۔" یعنی اس عورت کا جرم وار ہونا تو یقینی ہے لیکن چونکہ لعان کے بعد سزا نہیں دی جا سکتی' اس لیے اسے چھوڑ دیا ہے' ورنہ اسے ضرور رجم کروا دیا جاتا۔

مرتد ہو جانے والا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اسے قتل کر دو۔"

فوائد و مسائل : ○ دین تبدیل کرنے سے مراد اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا ہے۔ کسی یہودی کا عیسائی ہو جانا یا مجوسی کا یہودی ہو جانا اس میں شامل نہیں۔ ○ مرتد کے لیے توبہ کی گنجائش ہے۔ اگر وہ توبہ کر کے کافروں سے تعلق ختم کر لے تو اس کی توبہ قبول ہے' اس صورت میں اسے سزائے موت نہیں دی جائے گی۔

حدیں جاری کرنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کی مقرر کردہ حدوں میں سے ایک حد جاری کرنا' اللہ عزوجل کی زمین میں چالیس راتوں کی بارش سے بہتر ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زمین میں ایک (مجرم کو) حد لگانا زمین والوں کے لیے چالیس دن بارش برسنے سے بہتر ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ "حد" سے مراد خاص جرائم کی وہ سزائیں ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ مثلاً" چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا' یا قتل کی سزا قصاص۔ ان میں کمی بیشی جائز نہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے جرائم کی سزا "تعزیر" کہلاتی ہے' اس میں قاضی کی رائے کو دخل ہے' وہ جرم کی نوعیت کے مطابق مناسب سزا دے سکتا ہے۔ ○ حدود و تعزیرات کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں اور اس جرم سے اجتناب کریں' اس لیے حدود کے نفاذ سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے' اور ملک میں انصاف اور امن ہر قسم کی برکت کا باعث ہے۔ ○ برکات کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جو عرب کے صحرائی علاقے میں بہت بڑی نعمت اور رحمت شمار ہوتی ہے۔ ○ مذکورہ دونوں روایتوں کو

ہمارے فاضل محقق نے سنداً" ضعیف کہا ہے' جبکہ شیخ البانی رحمتہ اللہ نے دیگر شواہد کی بنا پر ان کو حسن قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے قرآن مجید کی ایک بھی آیت کا انکار کیا تو اسے قتل کرنا حلال ہو گیا۔ اور جس نے کہا۔ اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو (اس اقرار کے بعد) کسی کو اس پر (قتل کرنے یا مال چھیننے کا) اختیار نہیں' سوائے اس کے کہ وہ کسی حد والے جرم کا ارتکاب کرے تو وہ حد اس پر جاری کی جائے گی۔"

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کی حدیں قریب والے پر بھی نافذ کرو اور دور والے پر بھی۔ تمہیں اللہ (کے احکام کی تعمیل) کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت (ان پر عمل کرنے سے) رکاوٹ نہ بنے۔"

فوائد و مسائل : ○ قانون معاشرے کو صحیح رکھنے میں تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے' جب اس کا نفاذ ہر ایک پر یکساں ہو اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہو۔ ○ قریب اور دور سے مراد نسبی طور پر حکام سے قریب یا دور کا تعلق ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اسلامی معاشرے میں کسی مجرم کو قانون کے شکنجے سے بچا سکتی ہے' اسلامی معاشرے میں وہ بے اثر ہو جاتی ہے' مثلاً" مال و دولت' یا عہدہ و منصب وغیرہ۔ ○ انصاف کرتے وقت اور مجرم کو سزا دیتے وقت صرف اللہ کی رضا پیش نظر ہونی چاہیے۔ یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ رائے زنی' نکتہ چینی یا طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا۔"

فوائد و مسائل : ○ پردہ پوشی سے مراد کسی کے گناہ یا عیب کو ظاہر کرنے اور اس کی تشہیر سے اجتناب کرنا ہے۔ ○ کوئی انسان عیب اور غلطی سے پاک نہیں' لہٰذا دوسروں کو بدنام کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ○ آخرت میں پردہ رکھنے کا مطلب اس کے گناہوں کی معافی ہے۔ ○ کسی پر احسان کرنے کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ انسان دوسروں سے جس قسم کا سلوک کرتا ہے' اللہ تعالیٰ بھی اس سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔

بچاؤ کی کوشش

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جہاں تک حد لگانے سے بچاؤ کی گنجائش ملے' حد رفع کرو۔"

فائدہ : مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق سمیت دیگر محققین نے ضعیف قرار دیا ہے' تاہم بعض علماء نے اس حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ حد اس وقت نافذ کرنی چاہیے جب جرم اس انداز سے ثابت ہو جائے کہ شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ سے زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر اعتراف کر لیا' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "شاید تو نے بوسہ لیا ہو گا' یا ہاتھ لگایا ہو گا یا نگاہ ڈالی ہو گی۔" جب انہوں نے صراحت سے اس غلطی کا اعتراف کیا' جس کی سزا رجم ہے' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجم کی سزا دی۔

پردہ فاش کرنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی برہنگی چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی برہنگی چھپائے گا۔ اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کا پردہ فاش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش کرے گا حتیٰ کہ اسے اس کے گھر کے اندر رسوا کردے گا۔"

فوائد و مسائل : ○ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً" ضعیف قرار دے کر کہا کہ حدیث نمبر 2544 اور 225 اس سے کفایت کرتی ہیں' علاوہ ازیں دیگر محققین نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے ' لہٰذا مذکورہ روایت سنداً" ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ ○ برہنگی چھپانے سے ظاہری معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ جس کو کپڑے کی ضرورت ہو اسے کپڑا پہنایا جائے 'اور کسی کو رسوا ہونے سے بچانا بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اگر کسی کے عیب کا علم ہو جائے تو دوسروں کو بتانے کے بجائے اسے تنہائی میں نصیحت کی جائے تاکہ وہ باز آجائے۔ ○ کسی مسلمان کو ذلیل کرنے کی کوشش کرنے والا خود ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ ○ عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو رسوا کرتے وقت یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مجھ میں یہ عیب نہیں ' اس لیے مجھے رسوائی کا اندیشہ نہیں۔ انسان کسی بھی لمحے اپنی کمزوری کا یا شیطان کے وسوسوں کا شکار ہو کر گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرنی چاہیے۔

حد سے بچاؤ کے لیے سفارش کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ' انہوں نے فرمایا۔

"قریش بنو مخزوم کی اس خاتون کے معاملے میں بہت فکر مند ہوئے جس نے چوری کی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کون عرض کر سکتا ہے؟"

(آخر) انہوں نے کہا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے سوا اور کون یہ جراٴت کر سکتا ہے؟"

چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تو اللہ کی ایک حد کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟" پھر آپ اٹھے اور خطبہ ارشاد فرمایا ' (خطبے میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگو! تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ ان میں جب کوئی معزز (امیر) آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور (غریب) آدمی چوری کرتا تو اسے حد لگا دیتے۔ قسم ہے اللہ کی! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

راوی حدیث محمد بن رمح نے کہا" میں نے امام لیث بن سعد رحمتہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ' وہ بیان کر رہے تھے۔

"اللہ تعالیٰ نے انہیں (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو) چوری (جیسی نازیبا حرکت) سے محفوظ فرمایا تھا۔ اور ہر مسلمان کو یہی کہنا چاہیے (کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی غلطی کا صدور ممکن نہیں لیکن قانون اعلا اور ادنیٰ سب کے لیے برابر ہے۔)

فوائد و مسائل : ○ بنو مخزوم کی اس خاتون کا نام فاطمہ بنت اسود بن عبدالاسد تھا جو حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی تھیں۔ یہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر تھے۔ ○ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولا بیٹا بنانے سے منع فرما دیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ○ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے کے لیے اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ کم سن تھے 'اس لیے خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر سفارش نہ بھی مانی تو اسامہ رضی اللہ عنہ سے ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ وہ بچے تھے۔ ○ حدود کے نفاذ میں کسی کی رعایت جائز نہیں۔ ○ قانون کے نفاذ میں امیر کمزور غریب میں فرق کرنا اللہ کے غضب کا موجب ہے کیونکہ اس سے قانون کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ○ جس غلطی میں متعدد افراد شریک ہوں اس کی شناخت سب کے سامنے ذکر کر دینا چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ ہو۔ ○ اپنی بات میں تاکید پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے اگرچہ کسی کو اس پر شک نہ ہو' البتہ بلا ضرورت قسم کھانا مکروہ ہے۔ اور جھوٹی قسم کھانا حرام اور بڑا گناہ ہے۔

انصاف

حضرت مسعود بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'انہوں نے فرمایا۔

جب اس عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کمبل چرا لیا تو ہم اس معاملے میں بہت فکر مند ہوئے۔ وہ قریش کی ایک عورت تھی۔ ہم بات کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے کہا۔

"ہم اس کے جرمانے کے طور پر چالیس اوقیے (چاندی) دے دیں گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے (سزا دے کر گناہ سے) پاک کر دیا جائے۔"

ہم نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم گفتگو سنی تو ہم حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو خطبہ دینے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

"تم اللہ کی ایک حد (کے نفاذ کو روکنے) کے لیے اصرار کیوں کر رہے ہو جو اللہ کی ایک بندی پر آپڑی ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی بھی یہ غلطی کرتی جو اس عورت نے کی ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھ سے (اللہ کا حکم) حاصل کر لو۔ مجھ سے (اللہ کا حکم) حاصل کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک راستہ (اور قانون) مقرر کر دیا ہے۔ کنوارے لڑکے اور کنواری لڑکی کی (زنا کی) سزا سو کوڑے مارنا اور ایک سال کے لیے جلاوطن کرنا ہے اور شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی (زنا کی) سزا سو کوڑے مارنا اور سنگسار کرنا ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ ارشاد نبوی۔ "اللہ نے ان کے لیے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔" سے اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ حکم نازل ہوا تھا۔ " تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں تو تم ان پر اپنے میں سے چار گواہ ٹھہرالو' پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمریں پوری کر دے 'یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔" ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانیوں کو صرف سنگ ساری کی سزا دی 'کوڑے نہیں لگوائے۔ جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوڑوں کی سزا سنگ ساری میں مدغم ہو گئی۔ ○ غیر شادی شدہ کی سزا سو کوڑے مارنا ہے 'اس کے علاوہ ایک سال کے لیے وطن سے دور بھیجنا ہے تاکہ ماحول تبدیل ہونے سے گناہ کی ترغیب ختم ہو جائے۔ آج کے دور میں سزائے قید کو جلاوطنی کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جیل کا ماحول جرائم کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہ ہو۔

☆

دُرِ شہوار ہمراہ قاضی مقبول حسین

سعدیہ رشید

بچپن میں کبھی کسی زمانے میں مجھے بھی گڑیوں کی شادی کا شوق تھا جو کہ عموماً "لڑکیوں کو ہوا کرتا ہے اور میں اپنا یہ شوق وقتاً "فوقتاً" پورا کرتی رہتی تھی۔ گڑیا کے کپڑوں کے اہتمام کے علاوہ اس کا بیڈ روم سیٹ بھی لیا کرتی تھی جو کہ کھلونے والوں کی دکان سے با آسانی مل جایا کرتا تھا کبھی خود ہی گڈے گڑیا کو دولہا دلہن بنا کر شادی کی تقریب سجاتی تھی اور کبھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر بلکہ ایک گڑیا کی شادی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جو میں نے اپنی دوستوں نزہت اور رفعت کے ساتھ باقاعدہ کی تھی۔

میری گڑیا رخصت ہو کر ان کے گھر چلی گئی تھی پھر گردش دوراں میں اس گڑیا کی تو کوئی خبر نہ رہی کیونکہ ہم سب اپنے اپنے کاروبار زندگی میں گم ہو گئے تھے مگر اب جب بھی میں اپنی دوستوں کے پارلر میں جاتی ہوں تو اپنی سہیلیوں سے گڑیا کی شادی کی یاد ضرور تازہ کرتی ہوں۔

آج وہ دونوں اپنا پارلر کامیابی سے چلا رہی ہیں اور سچ مچ کی دلہنیں تیار کر رہی ہیں۔

اور اب میں نے بھی بڑے عرصے بعد پھر ایک گڑیا کی شادی رچائی ہے مگر فرق یہ ہے کہ اب میں نے جیتی جاگتی گڑیا کی شادی کی ہے یعنی میری چھوٹی بہن دُرِ شہوار کی شادی ماہ اپریل 2009 میں قاضی مقبول حسین کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔

اس موقع پر ہر ہر لمحہ میری والدہ کی دعائیں میرے ساتھ رہیں جس کی وجہ سے میں نے یہ فریضہ حوصلے سے نمٹا دیا۔ اگر آج وہ حیات ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں۔

دُرِ شہوار کی شادی خانہ آبادی اچانک ہی طے پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیا دیس سدھار گئی۔ خدا اس کو خوش رکھے (آمین) کہتے ہیں کہ نصیب جہاں لکھا ہوتا ہے وہیں ہر حال میں شادی ہوتی ہے پھر دنیا کی کوئی طاقت اس رشتے کو ہونے سے نہیں روک سکتی۔ میں نے بھی کچھ ماہ شادی آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی مگر سسرال والوں کے اصرار کے سامنے ہار ماننی پڑی یوں ایک ماہ میں جھٹ پٹ شادی کی تیاری ہوئی کچھ اس طور سے کہ ایک پاؤں گھر میں ایک شاپنگ سینٹر میں کبھی بچوں کے امتحانات کی وجہ سے ادھر توجہ تو کبھی دُرِ شہوار کی طرف دوڑ..... اسی دوران بیٹی عروبہ کے میٹرک کے امتحانات بھی جاری تھے۔

اور مزے کی بات یہ کہ اسی روز یعنی ۱۱ اپریل کو عین شادی والے روز ہی میرے بیٹوں محمود سفیر اور محمد طلحہ کو اسکول کی طرف سے شیلڈ دینے کے لیے آڈیٹوریم میں مدعو کیا گیا تھا۔ ایک افراتفری سی رہی۔ کدھر دیکھوں کدھر نہیں۔ یعنی سارے کام ہی ماہ اپریل کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ بالآخر یہ کڑا وقت بھی ٹل ہی گیا اور خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہر کام خیر و عافیت سے تکمیل پایا۔

مایوں کا بالخصوص زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا لیکن دُرِ شہوار کی سہیلیوں نے بہت اہتمام سے اس کو مایوں بٹھایا۔ خوب ڈھولکی بجائی گانے گائے اور سب طرف ایک رونق بپا کر دی۔ دولہا والے جب بری لے کر آئے تو مایوں کا اصل رنگ نکھر کر سامنے آ گیا۔ ویسے بھی لڑکیوں کے ہرے پیلے جوڑوں نے مایوں کا حسن بڑھا رکھا تھا۔ آخر میں کباب پراٹھے اور حلوہ پوری نے مایوں کا مزہ دوبالا کر دیا۔

بارات والے روز دُرِ شہوار بہت پیاری لگ رہی تھی اپنی چلبلی دوستوں کے جلو میں ہنستے مسکراتے شوخ فقروں نے اس کے چہرے پر خوب صورت رنگ بکھیر دیے تھے اس وقت میں نے دل سے اس کی آئندہ زندگی کی بھرپور خوشیوں کے لیے دعا مانگی۔

بارات آنے کے کچھ ہی دیر بعد نکاح کا فریضہ بھی انجام پا گیا۔ اس کے بعد طعام کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر وقتِ رخصتی بھی آ گیا۔ اس وقت خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت سے دل بوجھل سا ہو گیا۔ وہ اپنے گھر کی ہو رہی تھی اس سے بڑی خوشی نہ تھی۔ وہ پرائی ہونے جا رہی تھی یہ دکھ بھی بے چین کر رہا تھا مگر بہرحال یہ تو دستور دنیا ہے ازل سے یہی ہوتا آ رہا ہے کہ حوا کو آدم کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔

میرے بیٹوں کو بھی خالہ کی شادی کی بہت خوشی تھی بطور خاص کوٹ پینٹ کے سوٹ بنائے تھے۔ بیٹی عروبہ نے پشواز پہنی تھی سب کی دعاؤں اور محبتوں میں بالآخر وہ پیا دیس سدھار گئی۔

ولیمہ کی تقریب بھی شاندار رہی۔ ایک بڑی بس میں سوار ہو کر سب ولیمہ میں شرکت کے لیے گئے۔ پراعتماد سی دُرِ شہوار اپنے پیا جی قاضی مقبول حسین کے ساتھ ہمارے سواگت کے لیے وہاں موجود تھی۔ بجلی کی آنکھ مچولی نے ولیمہ کی تقریب کو مون لائٹ بنا دیا کچھ اس طرح کہ صرف آرائشی قمقموں کی جگمگاہٹ سے ماحول خوب صورت ہو گیا تھا۔ اس طرح دُرِ شہوار کی ہنگامی شادی اپنے انجام کو پہنچی اور دعا ہے کہ انجام بخیر رہے (آمین)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

شائستہ اقبال (نیوز کاسٹر)

"شائستہ! کیسی ہو اور بہت مبارک ہو تمہیں بہترین نیوز کاسٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے "بے نظیر بھٹو" ایوارڈ ملا ہے۔ آپ یقین کریں کہ میرے مقابلے میں اور بھی نیوز کاسٹرز کی نامزدگی ہوئی تھی لیکن ایوارڈ میرے حصے میں آیا۔"

"بات تو واقعی بہت اعزاز کی ہے۔ تمہیں امید تھی کہ تمہیں ہی ایوارڈ ملے گا؟"

"نہیں جی... مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کیونکہ میرے مقابلے میں جو نیوز کاسٹرز نامزد ہوئی تھیں وہ بھی ماشاءاللہ بہت اچھی ہیں۔ مگر بات وہی کہ ایوارڈ تو کسی ایک کو ہی ملنا ہوتا ہے۔"

"منگیتر صاحب خوش ہوئے...؟"

"بہت خوش ہوئے... اور کیوں نہیں خوش ہوں گے۔ یہ ان کے لیے بھی تو فخر کی بات ہے۔ میرے سسرال میں بھی سب بہت خوش ہوئے۔"

"تمہارے منگیتر فرید رئیس بھی اس چینل پہ نیوز پڑھتے ہیں۔ ملاقات تو روز ہوتی ہوگی اور گپ شپ بھی؟"

"جی نہیں... ان کے ڈیوٹی کے اوقات کچھ اور ہوتے ہیں اور میرے کچھ اور، اس لیے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی ہے۔"

"دل نہیں چاہتا روز ملاقات ہو...؟"

"میرے خیال میں شادی سے پہلے بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ بھی باتیں کریں گے۔"

"شادی کب ہو رہی ہے؟"

"ان شاءاللہ عیدالفطر کے بعد۔ آج کل تیاریوں میں سب لگے ہوئے ہیں اور آپ نے ضرور آنا ہے شادی میں۔ ابھی سے دعوت دے رہی ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں... شادی کے بعد پہلا انٹرویو بھی مجھے ہی کرنا ہے تمہارا، یہ بتاؤ کہ "آج" کے علاوہ بھی کسی چینل سے نیوز پڑھیں؟"

"ہاں جی... میں نے "اے آر وائی" سے کچھ عرصہ خبریں پڑھیں اور دبئی جاکر بھی پڑھیں لیکن تین چار مہینے کے بعد ہی میں واپس کراچی آگئی۔ کیونکہ دبئی میں میرا دل نہیں لگا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی... میں تو وہاں بہت بیمار ہوگئی تھی۔"

"اچھا... جب شادی ہوگی تب تو ای ساتھ نہیں ہوں گی؟"

(ہنستے ہوئے)... "مگر یہاں کراچی میں تو ہوں گی۔ جب دل چاہے گا ملاقات ہو جائے گی۔"

"سہولتیں کیا کیا دیتے تھے؟"

"صرف رہائش دیتے تھے بس... تو اس سہولت کے ساتھ تو اکیلے رہنا بہت مشکل تھا یہاں تو سب ہیں' ماں' باپ' بہن بھائی' رشتے دار اور سب سے بڑھ کر اپنا ملک ہے۔"

"ٹی وی اسکرین پہ آنا تمہارا خواب تھا۔ یا اتفاقاً اس فیلڈ میں آگئیں؟"

"کوئی خواب نہیں تھا۔ میں تو اتنی شرمیلی سی لڑکی تھی۔ جاب کا ضرور سوچتی تھی مگر ٹی وی پہ آنے کا نہیں۔ یہ تو میرے والد صاحب کی خواہش تھی اور ان ہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں ٹی وی اسکرین پر آئی۔ ہاں یہ خواہش مجھ میں ہمیشہ سے تھی کہ میں لوگوں میں جانی پہچانی جاؤں اور لوگوں میں میرا نام ہو۔"

"اور یہ سب کچھ پا کر کیسا لگ رہا ہے؟"

"ہائے... بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ اتنی زیادہ عزت اور اتنی پذیرائی ملے گی۔ میں یہ سب کچھ پاکر بہت زیادہ خوش ہوں۔ میرے والد کہتے ہیں کہ والدین کے نام سے تو بچے پہچانے ہی جاتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے نئی بات تو یہ ہے کہ بچوں کی وجہ سے والدین پہچانے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "جب کسی محفل میں یا تقریب میں کوئی کہتا ہے کہ آپ شائستہ اقبال کے والد ہیں تو مجھے انجانی سی خوشی ہوتی ہے" لیکن میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنے والدین کی بدولت ہوں۔"

"عام لوگ پہچان کر کیا کہتے ہیں؟"

"بڑا اچھا رسپانس دیتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھی اچھی خبریں پڑھا کریں۔ مگر ہم ان کو کیا کہیں کہ دل تو ہمارا بھی چاہتا ہے کہ خبریں اچھی ہوں لیکن ملک کے حالات اتنے خراب ہیں کہ ہمیں بری خبریں پڑھنا پڑتی ہیں۔"

"لوگ سیلبرٹی کو پہچان کر حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ ایسا واقعہ پیش آیا...؟"

"واقعہ تو کوئی پیش نہیں آیا ہاں... حیرت کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں کہ ارے آپ تو اتنی چھوٹی سی ہیں مگر ٹی وی پہ بڑی نظر آتی ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہمیں دیکھ کر عجیب سا تاثر دیتے ہیں' جیسے پتا نہیں کہ ہم کون سی دنیا کی مخلوق ہیں۔ بھئی ہم بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ ہمیں پہچان کر ہم سے بات کریں کہ ہمیں بھی اچھا لگے۔"

"گھر میں ماحول کیسا ہے دوستانہ... یا تھوڑا سخت...؟"

"گھر میں ماحول دوستانہ ہی ہے۔ میرے والد بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں۔ جب سے میں بڑی ہوئی ہوں مجھے نہیں یاد کہ میرے والد نے کبھی اونچی آواز میں بات کی ہو یا کسی بچے کو زور سے ڈانٹا ہو یا اسے مارا ہو۔ تو جب ہمیں کوئی بات منوانی ہوتی تھی تو ہم اپنے والد سے ہی کہتے تھے۔ وہ ابھی بھی ایسے ہی ہیں البتہ امی تھوڑا سخت مزاج کی ہیں۔ اس لیے ہم سب ان سے ڈرتے ہیں۔"

"تفریح کے لیے کون سے چینل دیکھتی ہیں اور گھومنے پھرنے کے لیے کہاں جاتی ہیں؟"

"تفریحی چینلز نہیں دیکھتی۔ زیادہ تر نیوز چینلز ہی دیکھتی ہوں تاکہ معاملات سے باخبر رہوں اور دیکھوں کہ کون سا چینل کیا نیوز دے رہا ہے۔ کبھی تفریح کرنے کو دل چاہے تو پھر کوئی اچھی سی انڈین مووی دیکھ لیتی ہوں گھومنے پھرنے کے لیے تو اب کہیں بھی نہیں جاتی کیونکہ اب تو ہمارے ملک کے حالات اتنے خراب ہوگئے ہیں کہ کہیں بھی بے جھجک بندہ نہیں جاسکتا کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے اور کس حالت میں گھر واپسی ہو۔"

"تم نے اپنے والدین کے مزاج کے بارے میں تو بتایا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔"

"مجھے بھی غصہ آتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ اور میں کبھی کسی پہ اپنا غصہ نہیں نکالتی بلکہ خاموش رہتی ہوں اور ویسے بھی میں خاصی خاموش مزاج ہوں۔ مجھے غصہ اسی وقت آتا ہے جب کوئی میری ٹھیک بات کو بھی غلط کہے۔"

✡ ✡ ✡

عادل مراد

"جی عادل مراد' کیا حال ہیں۔ کافی عرصے سے آپ سے بات نہیں ہوئی۔ کیا بہت مصروف رہتے ہیں؟"

"الحمدللہ۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس اتفاق ہے کہ کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی اور مصروفیات بھی کوئی اتنی خاص نہیں ہیں۔"

"آپ کا پروڈکشن ہاؤس کیسا چل رہا ہے؟"

"شکر ہے اللہ کا اچھا چل رہا ہے۔ کافی کام ہو رہا ہے ہمارے پروڈکشن ہاؤس کے تحت۔ فلم آرٹ انٹرٹینمنٹ ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا نام ہے اور ڈراموں کے اینڈ میں یا پروگرام کے اینڈ میں آپ یہ نام ضرور پڑھتی ہوں گی۔"

"بالکل جی۔ پڑھتے رہتے ہیں۔ عادل! آپ نے امریکہ میں اعلا تعلیم حاصل کی اور خاصا وقت آپ نے ملک سے باہر گزارا۔ مگر شادی ماں کی پسند سے کی۔ کیا آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی؟"

"نہیں ایسی بات نہیں کہ لڑکی پسند نہیں آئی بلکہ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ جب بھی شادی کروں گا اپنی ماں کی پسند سے کروں گا کیونکہ والد صاحب (وحید مراد) کی وفات کے بعد میری ماں نے ہماری پرورش کی اور بہت قربانیاں دیں۔ تو انہی کا حق بنتا تھا کہ وہ میری شادی کریں۔ چنانچہ میں نے ماں کو اختیار دیا کہ وہ میری شادی اپنی پسند سے کریں اور ایسا ہی ہوا۔"

"بیگم آئیڈیل ہیں؟"

"بالکل ہیں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ میری ماں کی پسند ہے۔"

"آپ کتنے بڑے تھے جب آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوا اور ان کے ساتھ گزرا ہوا وقت آپ کو یاد ہے؟"

"میں جب سات سال کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی عمر ہوتی ہے لیکن مجھے اپنے والد کے ساتھ گزارا ہوا وقت آج بھی یاد ہے۔ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنا' سیر و تفریح کرنا۔ بازار جانا۔ یہ سب کچھ اچانک مجھ سے چھن گیا اس لیے شاید مجھے سب کچھ یاد رہ گیا۔"

"کتنے سال امریکہ میں گزارے اور پاکستان آکر کیا محسوس کیا؟"

"میں امریکہ میں سولہ سال گزار کر آیا ہوں' اور پاکستان آکر میں نے محسوس کیا کہ ہمارا میڈیا بہت ایڈوانس ہو گیا ہے اور خاص طور پر یہاں کی لڑکیاں۔ مجھے بہت حیرت ہوتی ہے یہاں کی لڑکیوں کو دیکھ کر کہ ان کے لباس کتنے مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے یہاں آکر کچھ ایسے فیشن بھی دیکھے ہیں کہ جو میں نے امریکہ جیسے ایڈوانس ملک میں بھی نہیں دیکھے۔ بس اس معاملے میں ہمارے ملک میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔"

"سولہ سال کے دوران آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہو گا؟"

"بالکل جی۔ پاکستان اپنا ملک ہے اور اپنے ملک سے کیسے محبت نہیں ہوتی تو میں آتا جاتا رہتا تھا اور جب میں مستقل طور پر پاکستان آیا تو مجھے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں آکر اچھا محسوس ہوا۔"

'مزاجاً' کیسے ہیں؟"

"مزاج تو میرا ٹھنڈا ہی ہے مگر غصہ بھی نیچرل ہی ہوتا ہے غصہ آتا ہے مگر کبھی کبھار آتا ہے لیکن سخت آتا ہے۔ یہ شاید میری بری عادت ہے۔"

"عموماً" جیسا دیس ویسا بھیس۔" والے محاورے پر ہمارے لوگ عمل کرتے ہیں۔ باہر کئی کئی سال گزارنے کے باوجود لوگ اپنے ملک میں وقت کی پابندی نہیں کرتے' آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس۔" باہر کے ملکوں میں وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں پابندی کرنے والے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ میں تو کوشش کرتا ہوں کہ وقت کی پابندی کروں مگر وقت کی پابندی کرنے والوں کو ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ چاہیں گے کہ پڑوسی ملک کی فلموں میں کام کریں؟"

"ہرگز نہیں۔ کیونکہ میرے والد کو اس ملک نے بہت عزت و شہرت دی اور مجھے بھی جو کمانا ہو گا اپنے ملک میں رہ کر ہی کماؤں گا۔ مجھے کہیں اور نہیں جانا۔"

☆ ☆ ☆

مانی

"کیسے ہو مانی۔۔۔ حرا اور تمہارا بیٹا کیسا ہے؟"

"جی ٹھیک ہوں۔ حرا بھی اور ماشاءاللہ بیٹا بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"کتنا بڑا ہو گیا اور نام کیا رکھا ہے؟ گھر میں تو بہت رونق ہو گئی ہو گی؟"

"چار ماہ کا ہو گیا ہے۔ "مزمل" نام رکھا ہے اور واقعی گھر میں بہت رونق ہو گئی ہے۔ جب میں رات کو گھر آتا ہوں تو اس کو دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔"

"اب تو حرا کا سارا رجحان "مزمل" کی طرف ہو گیا ہو گا؟"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہے کیونکہ اسے تو سارا دن گزارنے کے لیے ایک کھلونا مل گیا ہے۔ خوب دل لگا رہتا ہے اس کا گھر میں۔"

"محبت تو بٹ گئی ہو گی؟"

"کیوں۔۔۔؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں شوہر ہوں اور وہ بیٹا۔ محبت تو بٹ ہی نہیں سکتی۔ ہاں تھوڑی توجہ بٹ گئی ہے۔"

"یہی تو ہم پوچھنا چاہ رہے تھے۔۔۔ حرا کی عادتوں میں کوئی تبدیلی آئی یعنی وہ پہلے تمہارے پروگرام نہیں دیکھتی تھی اور اب۔۔۔"

(قہقہہ۔۔۔) "آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے کبھی کبھار میرے پروگرام دیکھتی تھی مگر بیٹے کے آنے کے بعد وہ ان سے بھی گئی۔ اب یہ ہے کہ میں اپنے کرکٹ کے پروگرام جو کہ مجھے بہت پسند ہیں آسانی سے دیکھ لیتا ہوں۔"

"مزاج میں فرق آیا؟"

"نہیں۔۔۔ مزاج کی ہمیشہ کی طرح بہت ٹھنڈی ہے۔ اسے غصہ نہیں آتا۔ شادی سے پہلے غصے کی تیز تھی مگر زیادہ نہیں۔ اب تو مزاج بہت ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"حرا کو تم اپنے ساتھ پروڈکشن میں لانا چاہو گے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ کیونکہ ابھی تو ہمارا بیٹا اس دنیا میں آیا ہے۔ ابھی تو اسے ہماری خدمت خاطر کی ضرورت ہے۔ تھوڑا بڑا ہو جائے ذرا سمجھ دار ہو جائے تو ان شاءاللہ ضرور اسے اس فیلڈ میں لے کر آؤں گا۔"

☆ ☆ ☆

جویریہ عباسی

"کیسی ہیں آپ اور کافی عرصہ ہوگیا آپ سے کوئی انٹرویو نہیں کیا ہم نے۔ ٹائم دیں گی؟"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور انٹرویو کے لیے تو معذرت۔ کیونکہ میرا ایک میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ معاہدہ ہے کہ جب تک میں ان کے لیے کام کروں گی۔ کسی اخبار یا میگزین کو انٹرویو نہیں دوں گی۔ ورنہ آپ کو پتا ہے کہ میں نے آپ کو کبھی انکار نہیں کیا۔"

"ہاں بھئی مجھے معلوم ہے۔ یہ بتائیں کہ معاہدہ کتنے سال کا ہے؟"

"یہ بھی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ یہ بھی معاہدے میں شامل ہے۔ یہ بتائیں میرے سیریلز دیکھ رہی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ "کون جانے کیا ہونا ہے۔" بہت اچھا جارہا ہے۔ اس میں ایک سین تھا کہ جب آپ کا شوہر آپ کی ساڑھی کو آگ لگا دیتا ہے۔ بہت خطرناک سین تھا' کیسے کیا تھا؟"

"وہ سین واقعی بہت خطرناک تھا۔ شیفون کی ساڑھی تھی اور کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ اس منظر کو بڑی مہارت کے ساتھ کیا ہم سب نے۔"

"فنکاروں کی کچھ سیکیورٹی بھی ہوتی ہے؟"

"ہم جب اس سین کو کرنے لگے تھے تو ہر خطرے کے لیے سارے انتظامات کر لیے تھے کہ اگر ایسا ہو جائے گا تو یوں کریں گے اور ویسا ہو جائے تو اس طرح کریں گے' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب ٹھیک ہو گیا۔"

"کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ دیگر فنکاروں کی طرح لباس نہیں پہنتی۔"

"نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور دیگر فنکاروں کی طرح لباس اس لیے نہیں پہنتی کہ مجھے اپنی فیملی کا بہت خیال ہے۔ ٹی وی کے پروگرام نہ صرف میری فیملی بلکہ سب ہی دیکھتے ہیں پھر اچھا نہیں لگتا کہ کوئی باتیں کرے کہ دیکھو اس کو۔ کیسی لگ رہی ہے۔"

روبرو

عمیرہ احمد

ادارہ
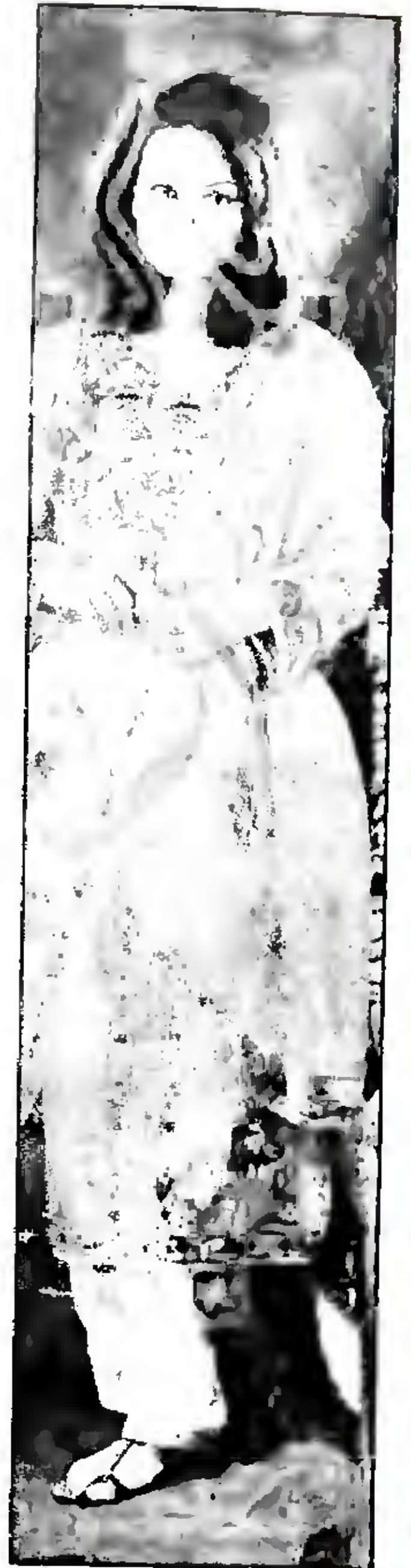
ہم ایف ایس سی اسٹوڈنٹس سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ ایگزامز اور انٹری ٹیسٹ کے درمیان کے یہ تین چار ماہ کتنے مصروف اور تنگ گزرتے ہیں۔ Nust کا انٹری ٹیسٹ بے حد قریب آچکا ہے' سیکنڈ ایر کے پریکٹیکل بھی ابھی رہتے ہیں' اسی لیے میں نے چند ہفتے قبل امثل کو کہا تھا کہ۔

''کیا خیال ہے' روبرو گول نہ کردیں؟ میری طرف سے معذرت کرلیجیے گا کہ بزی ہوں' وغیرہ وغیرہ''

مگر ان کے پاس چونکہ خطوط آرہے تھے' سو وہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھیں' ان کا کہنا تھا کہ ''مئی کے بجائے جون کرلو مگر روبرو لکھنا ضرور ہے۔''

میرا ارادہ واقعی گول کرنے کا تھا' مگر آج جب مجھے آپ لوگوں کے خطوط ملے تو میں انہیں پڑھ کر مجبور ہوگئی ہوں کہ روبرو لکھوں اور ضرور لکھوں۔ حالانکہ آج میرا آخری تھیوری پیپر تھا' صبح چار بجے کی جاگی ہوئی ہوں۔ (تھینکس ٹو مومنہ اویس) مگر پہلی دفعہ پیپر کے بعد والی دوپہر سو کر گزارنے کے بجائے' بے حد تھکاوٹ اور نیند کے باوجود یہ سب لکھ رہی ہوں' کیونکہ ان خطوط نے مجھے مجبور کردیا ہے۔

میں نے ہر خط' بہت توجہ سے' بہت دھیان سے ایک دفعہ نہیں دو دو' تین تین دفعہ پڑھا ہے اور شاید ہی میں کبھی لفظوں میں آپ کو بتا سکوں کہ اس وقت میرے کیا احساسات ہیں؟ میں یہ تمام خطوط دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ۔

آپ..... آپ کہتے ہیں کہ میں خوبصورت لکھتی ہوں؟ ارے مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تو آپ لوگ لکھتے ہیں۔ اتنے حسین الفاظ کا چناؤ' شدتوں بھری جذباتیت سے گندھے فقرے' اور ان فقروں کی بُنت میں جڑی آپ کی محبت' وہ خلوص' وہ عشق جو ہر خط کے ایک ایک حرف سے چھلک رہا تھا' میں کیا کہوں؟

میں نے تو کبھی کسی کو اتنے خوبصورت خط نہیں لکھے! شکریہ تو بہت چھوٹا لفظ ہے' میں تو اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کرپارہی۔ بس اتنا کہوں گی کہ یہ سب' میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ یار! اتنی اچھی تو نہیں تھی کہانی! بہت سی غلطیاں' کوتاہیاں اور جھول یقیناً'' رہ گئے ہوں گے' اس کے باوجود آپ کی بھیجی گئی یہ محبتیں' یہ خلوص و چاہت بھرے سندیسے' میں یہ سب کبھی بھی بھلا نہیں سکوں گی۔

کہنے کو تو چار لفظ ہیں۔ ''تھینک یو سو مچ۔''

مگر چونکہ دل سے لکھ رہی ہوں' سو وہ تمام بہت پیار کرنے والے دل جنہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے میرے لیے نکالے ہیں' ان کو یقیناً'' میرے جذبات سے آگاہی ہوجائے گی۔

خطوط ڈھیر سارے ہیں' ان شاء اللہ سب کے باری باری جوابات دوں گی' ہر خط میں تقریباً'' پانچ' چھ سوالات ہیں' جن میں سے چار سوال تو وہی ہیں' جو ہر خط میں دہرائے گئے ہیں' سو ہر خط میں سے نئے سوال کا جواب دے دوں گی' جنہیں تو نام تو ضرور لکھوں گی۔

پھر شروع کرتے ہیں۔ ''قراقرم کا تاج محل'' سے۔ یہ ایک طویل کہانی تھی اور اس میں' میں نے جو کچھ لکھا' وہ آپ نے چار ماہ میں پڑھا۔ اس کو میں نے ''کیسے'' لکھا' یہ اس سے بھی طویل اور بے حد مزاحیہ کہانی ہے' مگر چونکہ آپ کے خطوط پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ میری بہت اچھی قارئین مجھے بہت ذہین' بہت نالج والی' اور بے حد لائق فائق سمجھتی ہیں' تو میرا وہ تمام مزاحیہ قصے سنا کر اپنا امیج خراب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بس اتنا کہوں گی کہ میں نے' میرے کو رائٹرز نے (جن میں ملکی و غیر ملکی کلائمبرز شامل تھے۔) اور ان تم پروفیشنل ایکسپرٹس نے جو اس مسودے کی تکمیل میں شامل رہے تھے' ہم سب نے اس کا پلاٹ ڈسکس کرتے' ڈے ٹو ڈے اسکیچز بناتے' نقشے بنا بنا کر ایک دوسرے کو نہ سمجھ میں آنے والی

باتیں سمجھاتے' اور صرف اس بات پر کہ ''راکاپوشی بیس کیمپ میں برفانی نالہ ہے یا نہیں۔'' تین دن بحث کرتے' بہت انجوائے کیا۔ ہم سب بہت ہنسے تھے۔ (جبکہ قارئین کو بہت رلایا تھا۔) وہ تمام طویل بحثیں۔ مکالمے' لڑائیاں اور وہ وقت جب کسی لاحاصل بحث کے اختتام پر ہم سب راکاپوشی سے ہوتے ہوئے ملاعمر تک پہنچ جاتے تھے۔

میں اپنے ریسرچ ورک کے ٹرانسکرپٹ نکال کر پڑھوں تو مجھے بے تحاشا ہنسی آتی ہے۔

اور... اور پی ایس پی آر کے ساتھ وہ تین' چار ماہ کا زبردست کوآپریشن' کہ جتنی مدد میری ان رئیل لائف کلائمبرز نے کی' اتنی ہی' بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ پاکستان آرمی نے کی تھی' اب اگر اس بارے میں لکھنے بیٹھوں تو بات بہت طویل ہوجائے گی' سو بہتر ہے کہ خطوط کی جانب بڑھتے ہیں۔

پہلا خط بے حد خوبصورت ہے۔ **آمنہ امیر گوندل** نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے۔

''آپ کی پریشے تو ہر لڑکی کی نمائندہ ہے۔ ہر لڑکی میں قدر تو مشترک ہے' محبت ہونے پر ایک ہی فیلنگز' اراضی پر ایک سا احساس' بچھڑنے کا ڈر' کھو دینے کا کھٹکا' سو! آپ نے تو سب کچھ ہی بیان کردیا۔ مجھے آپ پر فخر ہے''

اور آمنہ! مجھے آپ پر فخر ہے۔ بلکہ تھوڑی سی جیلسی بھی ہے کہ یار! اتنا خوبصورت خط تو میں نے بھی زندگی بھر کسی کو نہیں لکھا۔ میں کیسے آپ کو شکریہ کہوں؟

آگے آمنہ نے میرے ناول کی روح اور اس کا نچوڑ بیان کردیا ہے کہ ''کوہ پیما اور پری کی کہانی تو صدیوں پرانی ہے۔ ان کا ساتھ تو ازل سے قائم ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں ایک کردیں گی' کیونکہ اگر انہیں ملنا نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے سے کیوں ٹکراتے؟'' افق کیوں پریشے کو ایولانچ کے بعد زندہ مل جاتا؟

یہی تو میری کہانی کا اصل پوائنٹ تھا کہ اگر افق اور پریشے نے ملنا نہ ہوتا' اور دور' دور ہی رہنا ہوتا' جیسا کہ وہ آغاز میں تھے' تو پھر مجھے کہانی لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

آمنہ کا دوسرا سوال۔ ''اس کہانی کا پس منظر؟''

اس کا پس منظر اس سے تھوڑا سا مختلف تھا جو میں نے دکھایا' جیسے وہ لڑکی (پریشے) پاکستانی نیشنل نہیں ہے۔ (پاکستانی نژاد ہے۔) جیسے افق ارسلان اس آخری حادثے میں زخمی ہوا تھا' نہ اسے ستارہ ایثار ملا تھا' اور نہ وہ دونوں کبھی پہاڑوں میں دوبارہ جانے کا عزم لیے ہوئے ہیں۔

اختتام کی جو سطر تھی' یہ وہ سطر تھی جس نے مجھ سے یہ ناول لکھوایا تھا۔ میں دو ایسے لوگوں کی کہانی لکھنا چاہتی تھی جو پوری کہانی یہی کہتے رہیں کہ ''اب آخری دفعہ ہے' ہم پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں آئیں گے۔'' اور ایک مقام پر آکر ان کو اتنے دکھ ملیں کہ وہ ہمالیہ میں کبھی واپس نہ جانے کا عزم کرلیں' مگر پھر مارگلہ کی پہاڑیوں کی ایک جھلک دیکھ کر وہ بالکل آخر میں اپنا فیصلہ بدل ڈالیں۔

یہی کہانی کہتے ہوئے صرف آخر میں' آخری سطر رکھی تھی اور ایک مبہم انجام کیا' جس کو میری توقع سے زیادہ پسند کیا گیا' جس پر میں آپ سب کی شکر گزار ہوں۔

اب میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں کہ آخری سطور کے علاوہ میں نے کیا تبدیل کیا' زیادہ کچھ نہیں کیا۔

ناول شروع ہونے سے قبل پچھلے صفحے پر میرا ایک نوٹ تھا' جو میں نے ناول مکمل کرکے لکھا تھا' اس کے آخر میں لکھے ایک روسی گائیڈ اناتولی بوکریف کے قول کی آخری سطر تھی۔

''ان دوستوں کو مت بھولنا جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آئے۔''

یہ کہانی کا بنیادی نکتہ تھا۔ یہ ان دوستوں کی کہانی تھی جن کو میرے ہیرو اور ہیروئن نے پہاڑوں میں کھویا تھا۔ مجھے ایک کلائمبر نے بتایا تھا کہ ان کے 52 ساتھی کلائمبرز پہاڑوں میں ہلاک ہوچکے ہیں۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوئی تھی' اور مجھے ان بہت اچھے دوستوں کی کہانی لکھنی تھی جو پہاڑوں میں حادثاتی موت کا شکار ہوتے ہیں۔

بعض قارئین کو شکایت ہے کہ شروع میں لگا کہ افق نے مرجانا ہے' مگر بعد میں وہ زندہ رہا۔ قارئین کے کہنے پر اینڈ تبدیل کردیا گیا ہے؟

تو جناب! یہ تو کسی رائٹر کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر صفحے پر قاری کی سوچ کے برعکس موڑ لیتا رہے' یہ ''سرپرائز اینڈنگ'' تو ادب کی دنیا میں بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

''افق نے آخر میں مرنا تھا یا نہیں؟'' اس سوال کا جواب کامن سینس میں پنہاں ہے اور بہت آسان ہے۔

''نہیں۔''

میں نے اسے زخمی حالت میں کئی روز ایک برفانی غار میں باتیں کرنے کے لیے تو نہیں زندہ رکھا تھا نا! اگر افق کو مسلسل بچایا جا رہا تھا تو کامن سینس کی بات ہے' اس نے نہیں مرنا تھا' یہ تو افسانے کے لحاظ سے بھی غلط تھا۔

پہلی قسط میں افق' پری کو ایک ڈیر دیتا ہے کہ تم مجھے اپنے صدر سے کوئی ایوارڈ دلوانا' اس کا وہی فقرہ مجھے آخری سین میں پری کے لبوں سے لوٹانا تھا۔ پہلی قسط میں بارہا یہ بتایا گیا تھا کہ کیپ جینک کی تھی۔ آخر اس کا کوئی تو مقصد تھا۔ اور پری کے کیبچر کا پتھر ڈھیلا تھا اس کے درمیان خراش بھی اس لیے تھی کہ جب وہ خیمے میں گرے تو افق اسے شناخت کرلے' پہلی قسط میں پری بار بار یہ سوچتی ہے کہ ایک بار گرنے کی دیر ہے' اور یہ پتھر الگ ہوجائے گا۔

اب میرے مؤقف کا سب سے بڑا ثبوت' میری ان پیاری قارئین کے لیے' کہ جن کا خیال ہے کہ تیسری قسط لکھتے ہوئے میں افق کو مار چکی تھی' اور چوتھی میں اسے دوبارہ زندہ کیا' تو جناب! میں آپ سب سے گزارش کروں گی کہ تیسری قسط کا سیکنڈ لاسٹ صفحہ کھولیے' جہاں پری کو ہیلی کاپٹر سے اسپتال لایا جاتا ہے' سوئی کی نوک اس کی جلد میں چبھتی ہے' اس سے آگے' غنودگی میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کے قریب بیٹھا کچھ کہہ رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ ہی اس "کوئی" کے خاص ہونے کا اشارہ دیتا ہے۔ اگر افق کو مار دیا تھا تو وہ کون تھا جو پریشے کے قریب بیٹھا اس سے کچھ کہہ رہا تھا؟ یعنی تیسری قسط کے آخر میں بھی افق زندہ تھا۔

ایک اور بات کہ میں نے یہ ناول سات ماہ ریسرچ کے بعد آٹھ ماہ میں مکمل کیا تھا۔ اب صرف دس بارہ دن میں اس کی قسط کیسے لکھ سکتی تھی۔

نہ میں اتنی ایکٹو ہوں' اور نہ ہی اتنی اچھی بچی کہ دو چار لوگوں نے کہا کہ اینڈ بدل ڈالو اور میں نے بدل دیا؟ لاحول ولا قوۃ۔

پچھلے برس نومبر میں جب ناول بھجوایا تو امثل نے کہا تھا "ارسہ اور احمت کو مارو۔ اور افق کا پاؤں مت کاٹو' یہ بہت دکھی ہوجائے گا۔"

مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ "سوری' میں ایک لفظ بھی چینج نہیں کروں گی۔"

مجھے اس کردار میں کوہ پیماہ کا جذبہ اور شوق دکھانا تھا' اس کا پاؤں کٹ جانے کے باوجود اس کا کوہ پیمائی چھوڑنے کا عزم دکھانا تھا۔ سو میں نے دکھایا۔

ویسے اس کی ایک مثال تو وہ بلنڈر ہے جو میں نے چوتھی قسط میں کیا' اور جب نومبر میں ناول بھجوانے کے بعد اپریل میں اسے پڑھا تو مت پوچھیں میری کیا حالت ہوئی۔ اس وقت سے میں اور حاجرہ خود کو مہوش باجی کی ملامت کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

پریشے ایک سین میں میجر عاصم سے پوچھتی ہے کہ وائف اور بچے کیسے ہیں؟ تو میجر عاصم کہتے ہیں کہ "مہوش ٹھیک ہے۔" اف یار! میں کیا بتاؤں؟ یہ مکالمے پری اور میجر بلال کے تھے' کیونکہ مہوش باجی' میجر بلال کی بیوی ہیں' مگر دانستگی میں مجھ سے اتنا بڑا بلنڈر ہوا کہ اب اب مجھے بہت ڈانٹ پڑے گی' اور صرف مجھے نہیں حاجرہ کو بھی' کیونکہ ہم دونوں مہوش باجی کی ڈانٹ ہمیشہ اکٹھے کھاتے ہیں۔ اگر جو میں نے ایک دفعہ بھی ناول واپس منگوا کر اینڈ بڑھانے کے بہانے ہی دوبارہ پڑھا ہوتا تو اس "نازک" بلنڈر کو ٹھیک کرہی لیتی نا!

ویسے فرینکلی اسپیکنگ' اب مجھے سبق مل گیا ہے۔ میں تو آئندہ سچی کہانی بتانے کی غلطی کبھی نہیں کروں گی' ورنہ بڑا پرابلم ہوجاتا ہے یار!

اچھا اب ایک اور دلچسپ بات جو سامنے آئی' سنیے۔ حالانکہ آغاز میں بتایا تھا کہ جن کرداروں کے نام بدلنے چاہیے تھے' ان کے بدل ڈالے ہیں۔ اس کے باوجود چند لڑکیوں نے انٹرنیٹ پر افق ارسلان کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ ان کو ایک فٹ بالر' ایک ترک سنگر' اور ایک آنجہانی انجینئر اس نام کا مل بھی گیا' اب وہ مجھے بہت پیار سے ای میل کرتی ہیں کہ فٹ بالر تو ذرا بھی ہینڈسم نہیں ہے' اور انجینئر مرچکا ہے' تو "ہمارا" افق کون سا ہے؟

میری پیاری ریڈرز! میں نے آغاز میں بتا دیا تھا کہ نام اور لوکیشنز مکمل طور پر تبدیل کردی ہے' کیونکہ ایسی پرسننٹ کہانیاں اصل ناموں سے نہیں لکھی جاتیں' پریشے' احمت' نشاء' ارسہ کے نام فرضی تھے' بعض اصلی بھی تھے' جیسے مصعب' حسیب' البرتو' میجر بلال' میجر عاصم' کیپٹن بشیر' کیمنین جینک' شفالی۔ (حالانکہ وہ بہت سنگک ہے۔) اور بہت اچھی سلمٰی۔ ہیرو کے اصلی نام

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا' وہ اتنا بڑا کلائمبر اگر آپ پر اعتماد کرتے ہوئے محض دوستی اور مروت میں آپ کو اپنی کہانی لکھنے کی اجازت دے دیتا ہے تو کم از کم آپ سے اتنی سمجھ داری کی توقع تو رکھتا ہے کہ آپ نام' مقام اور تاریخیں بدل ڈالیں گے۔ میرے کردار آپ کو ان فرضی ناموں کے ساتھ کبھی بھی نہیں ملیں گے۔ وہ فٹ بالر' وہ سنگر اور آنجہانی کیمیکل انجینئر' ان میں سے کوئی بھی آپ کا افق ارسلان نہیں ہے۔

فٹ بالر اور سنگر کو تو رہنے دیں' مگر اس انجینئر نے تھوڑا سا پرابلم یہ کیا کہ اس کا تعلق ترکی سے تھا' اور اس کو بھی جنرل مشرف نے صدارتی ایوارڈ سے نوازا تھا' ہماری چند قارئین تو یہ یقین کیے بیٹھی ہیں کہ یہی وہ انجینئر ہے' جس کی کہانی میں نے لکھی' تو میرے پاس اس کا سادہ سا جواب ہے کہ جس کی کہانی میں نے لکھی ہے' وہ کلائمبر ہے۔

ناول لکھتے ہوئے میرے علم میں یہ تھا کہ ستارہ ایثار حاصل کرنے والوں میں ایک افق ارسلان بھی تھا' مگر اس کے باوجود میں نے اپنے ہیرو کا نام نہیں بدلا' کیونکہ اس کی کئی وجوہات تھیں' میں ہیرو' ہیروئن کے نام بہت سمپل مگر خوبصورت رکھنا چاہتی تھی' کیونکہ ڈائجسٹ میں چھپنے والے "زائر حاقانی اور حریدہ نوزان" ایسے تمام جناتی نام جو بے شک نئے ہوں' مگر مذاق بن چکے ہیں' ان کو حلق سے اتارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پریشے' بہت کامن تو نہیں ہے' مگر "پری" سادہ اور کامن ہے تو رکھ لیا۔ ہیرو کے نام کے لیے میں نے سلمٰی سے پوچھا تھا کہ "ترکی میں سب سے کامن نیم کون سا ہے؟" تو اس نے سانس لیے بغیر کہا تھا۔ "افق ارسلان۔"

"اس کے علاوہ؟"

"جینیک یقین' احمت' عبداللہ..."

مجھے اب ہیرو کا نام ان چار ناموں میں سے منتخب کرنا تھا۔ ارسلان' میرے چھوٹے بھائی اور "ارسلان بھٹی" نشاء کے چھوٹے بھائی کا اصرار تھا کہ ہیرو کا نام ارسلان ہو۔ ارسل بھٹی کو تو ضد تھی کہ اگر حسیب کا نام یوز ہو رہا ہے تو اس کا بھی ہونا چاہیے۔ میری اس کہانی کے کئی نام ان بچوں نے رکھوائے ہیں' سو ان دونوں کے لیے میں نے ہیرو کا نام افق ارسلان منتخب کیا۔ مگر پھر سلمٰی سے پوچھا بھی افق کے بجائے کچھ اور کرلوں' مگر اس کا کہنا تھا کہ ترکی میں "افق ارسلان" اکٹھا ہوتا ہے اور عموماً حسن حسین ارسلان کا بیٹا افق ارسلان ہی ہوتا ہے۔ (جیسے ہمارے ہاں بڑے بھائی کا نام علی اکبر اور چھوٹے کا علی اصغر ہوتا ہے۔) ایسے ہی ہر ملک کے ان کے رواج ہوتے ہیں۔

اب اگر وہ مرجانے والے انجینئرز میں سے ایک کا نام افق ارسلان تھا تو میرے لیے یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ ترکی میں آپ ایک پتھر اٹھاؤ تو تین چار افق ارسلان نکلتے ہیں' جس فرم میں افق ارسلان کام کرتا تھا' میری اس کے ایک عہدیدار سے بات ہوئی تو اس نے کہا۔

"ہمارے ہاں چھ افق ارسلان اور پانچ جینیک یقین کام کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "افق ارسلان' سن آف حسن حسین ارسلان؟"

انہوں نے کہا۔ "مادام ہمارے چھ میں سے تین افق ارسلان کے والد کا نام حسن حسین ارسلان ہے۔ آپ کوئی اور نشانی بتائیں؟" (میں مذاق نہیں کررہی' آپ مجھ سے اس فرم کا نمبر لے کر کال کرکے خود معلوم کرسکتے ہیں۔)

جو ہمارا کوہ پیما ہے' وہ چھت گرنے کے حادثے میں زخمی نہیں ہوا تھا' وہ معجزانہ طور پر بالکل محفوظ رہا' مگر کہانی میں اگر معجزے لکھے جائیں تو ریڈرز مائنڈ کرتے ہیں' سو تھوڑا سا ڈرامیٹک ٹچ دینے کے لیے میں نے اسے زخمی کیا۔ بہرحال اسے ستارۂ ایثار نہیں ملا تھا' یہی وہ دو تین چیزیں تھیں جو میں نے خود سے ایڈ کی تھیں' اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نسیم حجازی کی مثال لے لیں' ہم ان کے ناولز کو سچا کہتے ہیں' جبکہ سوائے بنیادی ڈھانچے کے' سب خودساختہ ہوتا ہے' مگر پھر بھی ہم انہیں سچا کہتے ہیں۔

ہاں! ایک بات ہم نے make sure کی تھی کہ ہمارے کوہ پیماہ کا پاکستان آکر کام کرنے کا کوئی ریکارڈ تو نہیں ہے' چونکہ وہ زخمی نہیں ہوا تھا' سو اس کو میڈیا کوریج نہیں ملی تھی' اور نہ ہی اب پی ٹی وی کے پاس وہ ڈاکومنٹری رکھی ہے' جس کا ذکر سلمٰی نے آخری سین میں کیا تھا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا' جب آئی ایس پی آر کو وہ ڈاکومنٹری نہیں ملی تو پھر کسی کو بھی نہیں ملے گی' آئی ایس پی آر نے' تھینکس ٹو کرنل عتیق' بہت کوشش کی' مگر انہیں وہ نہیں ملی اور یہ کنفرم کرنے کے بعد ہی میں نے ناول لکھا تھا' ویسے کرنل عتیق نے مجھے منع کیا تھا کہ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کہانی سچی ہے' مگر مجھ پر چونکہ ایمان

داری کا بھوت سوار تھا' سو میں نے یہ بتانے کی بے وقوفی کردی۔ اگلی دفعہ یہ غلطی نہیں دہراؤں گی' میری توبہ' میری سات نسلوں کی توبہ ہے۔

تسلی رکھیے' ہمارے دونوں کردار زندہ ہیں' اور یورپ میں ہیں' ہاں ممکن ہے حقیقی زندگی میں وہ اتنے خوش نہ ہوں جتنا میں نے دکھایا تھا۔

چلیں آمنہ' آپ کے ایک سوال کے جواب میں' میں نے 70 فیصد سوالات کے جوابات تو دے ہی دیے ہیں' کیونکہ زیادہ تر کے سوالات یہی تھے۔

آمنہ کا اگلا سوال۔ "سچ سچ بتایئے۔ کیا آپ بھی اس کہانی کے کرداروں میں خود کو پاتی ہیں؟ کیا تیسری قسط لکھتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری نہیں ہوئے؟"

بہت خوبصورت لفظ لکھنے والی آمنہ' تیسری قسط کے آخر میں جب ہیلی کا پیڑری کو لے کر جا رہا تھا اور وہ ایک دم چیخنے لگتی ہے اور ان کو ہیلی کا پٹر روکنے کا کہتی ہے' وہ لکھتے ہوئے تو نہیں مگر سوچتے اور بعد میں پڑھتے ہوئے میں بھی آپ کی طرح روئی تھی' لکھتے ہوئے میں نہیں روتی' البتہ کوئی ہنسنے والی بات ہو تو خوب' ہنستی ہوں۔ جیسے پیٹر آنسرز والا سین لکھتے ہوئے میں اکیلی بیٹھی ہنس رہی تھی اور میرے چھوٹے مجھ پر ہنس رہے تھے۔

آمنہ آپ کے تیسرے سوال کا جواب آگے جا کر دوں گی' اتنے پیارے خط کا ایک دفعہ پھر شکریہ۔

اگلے خط میں سحرش مہرین نے سرائے عالمگیر سے' افق ارسلان کا اصلی نام پوچھا ہے۔

سحرش ڈیئر' یہ سوال دوسری بہت سی قارئین نے بھی کیا تھا' میں نام تو بتا دوں' مگر پھر جب اس بہت پاپولر کلائمبر کو نیٹ پر سرچ کیا جانے لگے گا' اور پھر اس کی پرسنل لائف کی کھوج' اس سے بہت سے لوگوں کی زندگی ڈسٹرب ہوگی' ویسے بھی افق ارسلان کا کردار کسی نہ کسی حد تک میرا تخلیق کردہ کردار بھی بن گیا ہے' کیونکہ کچھ چیزیں تو میں نے اپنے پاس سے بھی ایڈ کی تھیں' ویسے سحرش! آپ کا خط بہت بہت اچھا ہے' آئندہ بھی لکھتی رہیے گا۔

سیدہ نور العین تواب شاہ سے پوچھتی ہیں کہ "میں نے ریشے کو اصل میں دیکھا ہے کیا؟" آگے آپ پوچھتی ہیں۔ "کیا پری اور افق حقیقت میں بھی اتنے ہی لونگ ہیں؟"

اس سوال کا جواب بہت تفصیلی ہے' جو میں آگے اس سوال کے ساتھ ملا کر دوں گی' جو بہت سے لوگوں نے کیا ہے کہ "کیا ریشے حقیقت میں اتنی ہی حسین ہے؟" اگلا سوال۔

"ارسہ' جیینیک اور احمت کی موت لکھتے وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟"

اب نور کہیں گی کہ میں ان کے سوالات کو نیکسٹ منتھ پر ڈالے جا رہی ہوں' مگر یار! ریلی اس سوال کے جواب میں' میں آپ کو ایک طویل قصہ سنانا چاہتی ہوں جو نیکسٹ منتھ ہی بہتر رہے گا' کیونکہ میں اس دفعہ زیادہ سے زیادہ خط لینا چاہ رہی ہوں۔ کوہ پیمائی کی تاریخ کے دو قصے ان شاء اللہ پھر سہی۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

حمیرا انور' بہت' بہت اچھی لکھائی میں لکھے خط کے ساتھ کراچی سے آئی ہیں۔ اتنے پیارے خط کا بہت' بہت شکریہ حمیرا! آپ لوگوں نے میرا مان بہت بڑھایا ہے۔

حمیرا کا پہلا سوال۔ "کیا یہ سب میری ذاتی نالج میں تھا یا کہیں پڑھا تھا؟"

"جی حمیرا! یہ سب میری ذاتی نالج میں تھا۔"

آگے یہ جاننا چاہتی ہیں کہ "کیا آپ خود کوہ پیمائی کا شوق رکھتی ہیں؟"

"نہیں حمیرا! ایسا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ ہاں ٹور اور ٹریکنگ کا شوق ہے اور الحمدللہ بہت کی ہے۔"

حمیرا نے ترک زبان کے الفاظ اور گیت وغیرہ کی تعریف کی ہے' تھینک یو یار! مگر ترک الفاظ کے لیے سلمیٰ زندہ باد' ترک گیت (لیلیٰ مجنوں) کے لیے انٹرنیٹ زندہ باد اور اس ترک نظم کے لیے' جو افق نے پری کو وائٹ پیلس میں سنائی تھی' نمرہ زندہ باد' کیونکہ وہ میں نے خود بہت جلدی میں لکھی تھی' شروع میں احمت اوصت کی ایک نظم کا ترجمہ لکھنے کا ارادہ تھا' مگر وہ کہانی کے تھیم کے ساتھ میچ نہیں کر رہی تھی۔

اور ہاں حمیرا! ایولانچ کے معنی اردو میں "لانی" ہیں' ڈکشنری میں برف کا ڈھیر وغیرہ لکھا ہے' مگر یہ بالکل پورے معنی نہیں ہیں' میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے مناسب لفظ نہیں ملا' غیر مناسب الفاظ تو بہت سے مل گئے تھے' ہاں "لانی" ایک پروپر لفظ تھا' مگر "ایولانچ" جو بے شک ایک ملٹری ٹرم ہے' سے زیادہ کامن نہیں تھا' سو میں نے ایولانچ ہی استعمال کیا۔

ارم خالد لاہور سے اس یقین کے ساتھ آئی ہیں کہ افق مر چکا ہے' مگر امید ہے کہ اوپر دی گئی وضاحتوں کے بعد ارم

کی کنیفوژن دور ہو گئی ہو گی۔
ان کا پہلا سوال۔ "کیا افق ارسلان حقیقت میں بھی اتنا ہی ہینڈسم ہے؟"
"اس سے بھی زیادہ ارم!"
اب میری طرف سے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ارم کے ایگزامز کے لیے خوب ڈھیر ساری دعا کریں' تاکہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں۔ (آمین)
فوزیہ صادق کسووال سے ایک بہت خوبصورت خط کے ساتھ شریک محفل ہیں۔ ان کا پہلا سوال۔ "یہ ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"
"فوزیہ! قصہ یوں ہے کہ میں "سلطنت" کے عنوان سے ایک دوسرا ناول لکھ رہی تھی' اس کے ایک سین میں دو کردار چلتی چیئر لفٹ سے نیچے برف پر اتر جاتے ہیں۔ جب میں برف والا سین لکھنے لگی تو میری خواہش تھی کہ وہ دونوں برف میں کچھ ایسا دبا کر جائیں جسے آنے والے کئی سالوں تک یاد کریں' مگر اس طرح کی چیز ناول کی ٹون سے میچ نہیں کر رہی تھی۔ سو اس پوائنٹ پر آ کر میں نے سلطنت کو چھوڑ کر ایسی کہانی لکھنے کا سوچا جس میں برف زاروں کا ذکر ہو۔" قراقرم کا تاج محل کا جو پہلا مکالمہ میرے ذہن میں آیا تھا وہ پریشے نے افق کا مفلر برف میں دباتے وقت بولا تھا۔ وہ میری پسندیدہ سطور ہیں۔
اور پیاری فوزیہ! یہ ناول میں نے اس سے وابستہ تمام لوگوں کی اجازت سے لکھا ہے' دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔
ثمینہ ناز' کلاکوٹ سے پوچھ رہی ہیں کہ مصعب عمر کا کردار مجھے کیوں اتنا پسند ہے؟ تو ثمینہ! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس پوری دنیا میں سب سے زیادہ عزیز مصعب ہے اور وہ دنیا کا سب سے ہینڈسم لڑکا ہے (مصعب کی اماں سے درخواست ہے کہ وہ اس لفظ پڑھنے سے گریز کریں۔ بائی گاڈ' اس دنیا میں مصعب سے زیادہ اچھا کوئی نہیں ہے)
آگے لکھتی ہیں "مارچ والی قسط میں ڈاکٹر صاحب' افق کے لیے died کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟"
"ثمینہ! ڈاکٹر صاحب نے افق کے لیے نہیں' ارسہ کے لیے کہا تھا' ان کے فقرے سے جنس یا نام وغیرہ واضح نہ تھا۔ پری سمجھی کہ وہ افق کی بات کر رہے ہیں' مگر پھر نشاء کے بتانے پر اس نے بہت relieved ہو کر سوچا تھا کہ "تو ڈاکٹر ارسہ کی بات کر رہا تھا۔" اور جناب' افق چوتھی قسط میں زندہ نہیں ہوا تھا' وہ تیسری میں بھی زندہ ہی تھا' پری کے پاس بیڈ پر بیٹھا بھی تھا۔
آپ کا اگلا سوال "افق نے پہاڑوں پر دوبارہ کیوں جانا چاہا؟"
یہی تو میرے کہانی لکھنے کی اصل وجہ تھی۔ درحقیقت افق کو پہاڑوں سے نفرت نہیں ہوئی تھی' وہ صرف ایسا سمجھتا تھا۔ اس نے کئی ماہ نارمل انسانوں کی طرح رہنے کی کوشش کی' مگر مارگلہ کی پہاڑیوں کی ایک جھلک نے ہی اسے اپنی ذات میں موجود ادھورے پن کا راز بتا دیا کہ وہ ادھورا پن جو پری اور وہ دونوں محسوس کرتے تھے' صرف اور صرف کوہ پیمائی ترک کر دینے کے باعث تھا۔ آخر میں دونوں کو احساس ہوتا ہے کہ ان کا خمیر ہمالیہ سے اٹھا تھا' وہ پہاڑوں میں ہی خوش رہ سکتے تھے' ان کو پہاڑوں سے نفرت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
ویسے بھی یہ ناول پاکستان میں ٹورازم اور کوہ پیمائی کے فروغ کے لیے لکھا تھا' مگر لکھتے لکھتے وہ ایسا بن گیا کہ جو جانے کا سوچ رہے ہوں' وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگائیں تو آخر میں حقیقت سے ہٹ کر یہ کرنا میرے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ قارئین پہاڑوں کا ڈراؤنا سا امیج لے کر جائیں۔
رمشہ ارشد کا خط بہت دلچسپ ہے۔ "کاش! افق میرا بھائی ہوتا!"
"بھائی؟ سیریسلی رمشہ؟ یار! ایک دفعہ پھر سوچ لیں!"
رمشہ! افق اور پری نے کوہ پیمائی چھوڑ دی تھی۔ وہ دوبارہ ہمالیہ کلائمبنگ کے لیے نہیں گئے۔ احمت اور جینک کی مسز کی آپ نے بات کی' تو رمشہ' جینک کی مسز نہیں تھیں' ایک فیانسی تھی جس نے بعد میں شاید شادی کر لی تھی' مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ آخر میں آپ نے جس موضوع پر لکھنے کی بات کی' وہ بلاشبہ ایک عمدہ موضوع ہے۔ اللہ نے چاہا تو ضرور لکھیں گے۔
صبا طارق گوجرانوالہ کے سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔
1۔ "جی' صبا! مجھے بچپن سے لکھنے کا شوق تھا' مگر بچوں کے کسی رسالے کے لیے نہیں لکھا۔"
2۔ "کہانی کی اصلاح بس امثل ہی کر دیتی ہیں۔"
3۔ "میں بہت' بہت سوشل ہوں۔ میرا سوشل سرکل ماشاء اللہ اتنا بڑا ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہے۔ ایجوکیشن میری ایف ایس سی ہے۔ مزاحیہ تحریر کے بارے میں ابھی تو کوئی ارادہ نہیں۔ لکھنے کے لیے مجھے بس تنہائی اور موڈ درکار ہوتا ہے' لکھنا تو ویسے بھی موڈ کے ساتھ ہوتا ہے۔
آج کل نئی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں ماشاء اللہ۔ کم از کم مجھ سے تو سب اچھا ہی لکھ رہے ہیں۔ باقی رہا تعریفیں سن کر مغرور ہونے کا سوال' تو جس دن میں مغرور ہو گئی' اس روز میرا یہ [illegible] ختم ہو جائے گا۔ دماغ آسمان پر پہنچے گا تو ظاہر ہے میں زمین پر بغیر دماغ کے رہوں گی اور بغیر دماغ کے لکھے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جائے گا کہ رائٹر مغرور ہو گئی ہے۔ اللہ نہ کرے ایسی نوبت آئے۔"
عنبرین وسیم کا بہاولپور سے سوال ہے کہ "آپ کی عمر؟"
"اٹھارہ سال' آٹھ ماہ۔"
آگے یہ مشاغل اور پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھ رہی ہیں تو عنبرین ڈیئر! مجھ سے بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی پوچھا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ لکھنے کو کیسے مینیج کرتی ہو' تو جناب! بتاتی چلوں کہ میں پڑھائی کے ساتھ صرف لکھنے کو ہی manage نہیں کرتی بلکہ میں ایک نجی تجزیاتی ادارے میں بطور resaerch analyst جاب بھی کرتی ہوں۔ ٹائم مینجمنٹ اس طرح بھی ہو جاتی ہے کہ میری آفس جانے والی جاب تو ہے نہیں۔ ہمارا آفس چکالہ میں ہے' مگر یہ الگ بات ہے کہ مجھے آفس کی ریگولر شکل دیکھنا نصیب نہیں ہے۔ پروبلی ان شاء اللہ چند ماہ تک شاید میں آفس جوائن کر لوں' مگر assignments تو گھر پر ہی کرتی رہتی ہوں۔ ویسے بھی میری یہ پارٹ ٹائم جاب صبح پانچ سے رات ڈیڑھ بجے تک چلتی رہتی ہے۔ شاید اسی لیے میں ناولز کے لیے ریسرچ ورک بہت زیادہ کر لیتی ہوں۔
شافعہ (لاہور) کے جوابات حاضر ہیں۔
"شافعہ! میں خود کلائمبنگ نہیں کرتی' البتہ ٹورازم بہت کیا ہے۔ یہ ناول ان شاء اللہ دو تین ماہ تک کتابی شکل میں آ جائے گا اور حاجرہ نے مصعب عمر کے کردار کی بات کی تھی۔ (حاجرہ! تم تو بیٹھے بٹھائے میری ریڈرز میں مشہور ہو گئی ہو!)"
شافعہ! آپ کی طرح میرے ایک چچا کی سالگرہ بھی 8 اکتوبر کو ہوتی ہے' مگر ہم اسے مناتے ہیں' کیونکہ دن کوئی بھی برا نہیں ہوتا۔ ہم بس زلزلہ زدگان' اور اب سوات وار کے متاثرین کی مدد کرتے رہیں' یہ بھی ایک طرح سے سالگرہ منانا ہو گا۔ اپنی سالگرہ پر خوش ہوا کریں۔
اب میری سب سے کیوٹ نین فریال کا خط شامل محفل ہے۔ فریال ڈیئر! آپ کے دونوں خطوط مل گئے ہیں' اور معذرت کی کوئی "لوز" نہیں ہے' اٹس او کے۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے کہ آپ اپنی اردو امپروو کر رہی ہیں ویسے رئیلی گڈ (بنسے گا مت' ہم انگریزی کے عادی لوگ اردو کی

تعریف بھی انگریزی میں ہی کرتے ہیں۔)

ہری پور سے نور اور بنتِ آس ڈھیر ساری پرخلوص چاہتوں کے ساتھ آئی ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ اتنی ساری معلومات کا ذریعہ کیا تھا؟

تو جناب' اس کا جواب ایک ہی فقرے میں دوں گی کہ "پاک فوج زندہ باد" الپائن کلب پائندہ باد!

اور تمام واقعات ایگزیکٹلی انہی جگہوں پر پیش نہیں آئے تھے جہاں میں نے لکھے۔ بے شک نیپال بہت خوب صورت ہے مگر مجھے اپنی وادیوں کا حسن پروجیکٹ کرنا تھا۔ یہ ایک خود غرضانہ سی محب الوطنی تھی۔

شہلا رجانہ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ سے سوال ہے کہ کیا تمام کردار حقیقی تھے؟

"جی شہلا! تمام کردار (سوائے ارسہ کے) حقیقی تھے' یہاں تک کہ وہ پورٹر کک شفالی بھی۔"

اتنی بہترین کاوش کی پذیرائی پر میں کیسا محسوس کرتی ہوں تو جناب! کاوش تو عام سی تھی مگر رسپانس الحمدللہ مجھے توقع سے بڑھ کر ملا' جس کے لیے میں آپ کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ' اللہ آپ کو اجر دے۔

یہ اگلا خط ہے' پڑھتی ہی جا رہی تھی مگر جب آخر میں نام دیکھا تو بے اختیار لبوں سے "ارے یہ تو لاریب کا خط ہے" نکلا یہ میری سب سے پیاری ریڈر ہیں۔ آپ کا پچھلا خط مجھے مل گیا تھا اور اس کی طرح وہ بھی بہت اچھا تھا۔

لاریب فرام ملتان نے پوچھا ہے "مس جینئس" یہ "برو" کیا ہے اور اسے پڑھتے کیسے ہیں؟"

"مس جینئس۔ کا جواب یہ ہے کہ راکاپوشی کے پہاڑ پر' یا کسی بھی دوسرے پہاڑ پر جو گلیشیر جمے ہوتے ہیں' ان کو ان کی ساخت اور پہاڑ کے رخ (face) کے اعتبار سے ہم classify کر لیتے ہیں۔ راکا کے تین مختلف faces پر تین گلیشیر ہیں۔ ایک "جگلوت گوہ" گلیشیر دوسرا "پسان" گلیشیر اور تیسرا "برو" گلیشیر۔ برو' راکاپوشی کے شمال مغربی رج کے قدموں میں جمی برف (گلیشیر) کا نام ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے "ب" پر پیش اور "ر" پر بھی پیش لگاتے ہیں۔

اور لاریب ڈیئر! راکاپوشی کو اس کے دو تین راستوں سے ڈھیروں لوگ سر کر چکے ہیں مگر اس کے شمال مغربی رج (ڈھلوان) سے اسے کسی نے آج تک سر نہیں کیا۔ اسی ڈھلوان کی کہانی ہم نے آپ کو سنائی تھی۔ پہاڑ کے دو faces میں بھی اتنا فرق ہوتا ہے کہ اگر آپ نے ہنزہ سے راکاپوشی کے جگلوت گوہ والی طرف جانا ہے تو آپ دس پورٹر اور پانچ گدھے لے کر جاتے ہیں' لیکن اگر راکاپوشی کے ہی برو گلیشیر والے faces تک جانا ہے تو آپ ڈھیروں پورٹرز لیتے ہیں' مگر گدھے نہیں لیتے کیونکہ وہ راستہ اتنا پرپیچ ہے کہ وہاں گدھے نہیں جاسکتے۔ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ ایک ہی پہاڑ کے دو مختلف faces بھی کتنے مختلف ہوتے ہیں۔

اور جناب! اگر موسم ٹھیک ہو' مطلع صاف ہو تو ہر پہاڑ کی چوٹی سے دوسرے تمام پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ 23 سال پہلے میرے ایک کورائٹر blanchard barry نے راکا کو سر کیا تھا' اس نے چوٹی سے پورا کنکورڈیا اور بلتورو دیکھا تھا۔

اس کہانی کو لکھنے کا خیال تو ایک دوسری کہانی کے برف والے سین کے باعث آیا تھا' مگر بنیادی محرک تو ماز کا ریسکیو آپریشن بھی تھا۔ اور بیبی پلی لینڈ برتھ ڈے لاریب! خوش رہیے اور اتنے اچھے خط لکھتی رہیے۔

ان تمام خطوط میں جو سوالات تھے' وہ تمام سوال چند اور قارئین نے بھی اپنے خطوط میں پوچھے ہیں۔ جواب تو دے چکی ہوں' مگر پھر بھی ان کا نام لکھ رہی ہوں۔ بشریٰ حسن' ثمرہ احمد بٹ چوکی' رضوانہ ناز' فائزہ جاوید خان پور' ماہین شاہ سکرنڈ' صبا ناز کراچی' ثوبیہ ثمرین ڈی جی خان' نازیہ اسلم چکوال اور فخری بی بی فتح جنگ۔ آپ سب کے خطوط بھی بہت اچھے تھے اور ان سب نے میرا حوصلہ اور مورال بہت بڑھا دیا ہے۔

چند خطوط جو میں اس ماہ شامل کرنا چاہتی تھی' جیسے عاصمہ (خانیوال) سے اور اسپیشلی ثمن اور عائشہ کا نشتر' ملتان سے مگر جگہ کم ہے۔ ثمن آپ کا خط بہت اچھا تھا' مگر سوسوری! میں اس ماہ نہیں شامل کر سکی۔ ان شاء اللہ نیکسٹ منتھ آپ دونوں کے خطوط سے آغاز کریں گے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ میرا جون کے آخری عشرے میں NUST کا میڈیکل انٹری ٹیسٹ ہے' دعا کیجیے گا مجھے اس میں ایڈمیشن مل جائے۔ اور نہیں تو بس آمین ہی کہہ دیجیے۔

(باقی آئندہ)

راحت جبیں

قدم بقدم

ڈاکٹر شہروز کے اور حریم کے جوڑے کو پورے خاندان میں آئیڈیل حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر شہروز ایک نیک دل اور سلجھے ہوئے سائیکاٹرسٹ ہیں جبکہ حریم مقامی کالج میں اکنامکس کی لیکچرار ہے۔ عمر اور عادل کی خوبصورت شرارتیں ان کے گھر کی رونق ہیں۔ ڈاکٹر شہروز کے پاس ایک مشکل لیکن دلچسپ کیس آتا ہے۔ وہ اس عورت کو پہچان جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایک بار پارک میں دیکھا تھا اور اس کی عجیب و غریب حرکتوں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ یہ کیس ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس کی دگرگوں حالت اور آئے دن پڑنے والے دوروں نے اس کے شوہر کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس عورت کا رویہ پہلے سیشن میں خاصا جارحانہ رہتا ہے لیکن ڈاکٹر شہروز کی کوشش سے وہ ان پر اعتماد کر لیتی ہے اور پرت در پرت اپنے ماضی کے واقعات بیان کرتی ہے۔

وقار الحسن اور سارا نے محبت کی شادی کی تھی۔ وقار احمد کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی مہر النساء سے جو وقار کی خالہ زاد بھی ہے۔ مہر النساء کی زبان درازی اور بدتمیزی کی وجہ سے اس کے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی تو وقار کی ماں نے وقار کو مجبور کیا کہ وہ مہر النساء سے شادی کریں لیکن وقار کے ساتھ بھی اس کی نہ بن سکی۔ وقار نے سارا سے شادی کر لی تو مہر النساء میکے چلی گئی۔ سارا کے ہاں ایک بیٹی ایمن پیدا ہوئی۔ وقار بہت خوش تھے لیکن اچانک سارا کا انتقال ہو گیا۔ ایمن ماں کی کمی بہت محسوس کرتی ہے۔ اس کی ضدی طبیعت وقار الحسن کو بے حد پریشان رکھتی ہے۔ اسے سنبھالنے کے لیے وقار نے خدیجہ بی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جو ان کی دور پرے کی رشتہ دار ہیں اور اپنے بیٹے، بہو سے ناراض ہو کر ان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ وقار الحسن کی مستقل پریشانی کو دیکھتے ہوئے خدیجہ بی انہیں مہر النساء کو لانے کا مشورہ دیتی ہیں جس پر وہ ایک لمحے کو چپ رہ جاتے ہیں۔

ایمن کی بگڑتی ہوئی عادت وقار الحسن کو خدیجہ بی کا مشورہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مہر النساء سے ان کی دو بیٹیاں موبرا اور حورین جبکہ ایک بیٹا بابر پہلے شوہر سے ہے۔ مہر النساء، وقار الحسن کے ساتھ آ جاتی ہے۔ وہ وقار الحسن کے سامنے سارا سے اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر اچھا سلوک کرتی ہے۔ وقار الحسن مہر النساء کی قربانیوں کو تہہ دل سے تسلیم کرنے لگتے ہیں، اس لیے مہر النساء کے پہلے شوہر کے بیٹے بابر کو بھی اپنے گھر لے آتے ہیں اور اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے اچھا اور پورے گھر کو مہر النساء کے حوالے کر کے بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ وقار الحسن کا جانا ایمن کے لیے اذیتوں کے نئے باب کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ تمام مراعات جو ایمن کو باپ کی موجودگی میں حاصل تھیں چھین کر گھر کے کاموں کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ ایمن، مہر النساء کے رویے کی اس تبدیلی پر بے حد

پریشان رہتی ہے۔ ایک کے بعد ایک چرکا اسے پڑھائی میں بھی سُست کر دیتا ہے۔ اپنے دل کا حال وہ صرف اپنی سہیلی مائرہ سے بیان کرتی ہے۔ مہرالنساء موسو اور جوجو کے لیے ٹیوٹر طاہر محمود کا بندوبست کر دیتی ہیں جبکہ ایمن کو گھر کی ذمہ داریوں کے باعث پڑھائی میں شدید مشکلات کا سامنا ہے۔

میٹرک کے رزلٹ میں موسو اور جوجو شاندار نمبروں سے پاس ہوتی ہیں جبکہ ایمن بمشکل پاس ہو پاتی ہے۔ اس کے دل میں مہرالنساء کے لیے کدورت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ خدیجہ بی، ایمن سے ملنے آتی ہیں تو اسے سارا کا بریسلیٹ دیتی ہیں جسے وہ اپنے ہاتھ میں پہن لیتی ہے۔

مائرہ اپنی منگنی میں ایمن کو مدعو کرتی ہے تو اس کا کزن عثمان اس کی معصومیت اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات مائرہ کے علم میں آجاتی ہے۔ مہرالنساء اپنے ایک رشتہ دار کی آمد پر کمرہ خالی کرنے کا حکم دیتی ہیں۔ ایمن کے انکار پر موسو اور جوجو اس کا تمام سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتی ہیں۔ ساتھ ہی تیز بارش کا خیال کیے بغیر مہرالنساء، ایمن کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ ایمن محض مہرالنساء کو اپنے باپ کی نظروں سے گرانے کے لیے بغیر سوچے سمجھے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ گھر سے نکل کر تیز بارش میں کوئی ٹھکانہ نہ پاتے ہوئے ایمن ایک گھر میں گھس جاتی ہے۔ وہ گھر طاہر محمود کا ہے جہاں وہ اپنے بوڑھے دادا کے ساتھ رہتا ہے۔ بابر، ایمن کو زبردستی گھر لے جاتا ہے۔ تیز بارش میں ایمن کا بریسلیٹ گر جاتا ہے جو دادا جی کو ملتا ہے جسے دیکھ کر وہ بری طرح چونک جاتے ہیں۔ یہ بریسلیٹ انہیں ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ طاہر محمود بھی ایمن کے اس بریسلیٹ کو پہچان کر اسے ایمن کو دینے کے لیے آتا ہے تو دادا جی، ایمن کو دوبارہ گھر لانے کا کہتے ہیں۔

طاہر محمود، بابر کے کہنے پر بہت دنوں سے ایمن کے کالج میں داخلے کا انتظام کرتا ہے جس پر ایمن مزید پڑھنے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ تاہم سر طاہر کے سمجھانے پر محض مہرالنساء کو نیچا دکھانے کو کالج کا فارم بھر دیتی ہے۔ طاہر محمود، ایمن کو پڑھنے کے لیے دادا جی کے پاس بھیجنے کی تجویز دیتا ہے جس پر ایمن فوری راضی ہو جاتی ہے اور اب ایمن گھر کے تمام کاموں سے کنارہ کش ہو کر مہرالنساء سے دو بدو مقابلے پر اتر آتی ہے۔

کالج میں پہلے ہی روز موسو، جوجو اور ایمن کی ملاقات نوین (ناتن) سے ہوتی ہے جو جوجو اور ایمن کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جبکہ موسو اس سے خوب دوستی کر لیتی ہے۔ ایمن کی پڑھائی سے بیزاری بابر کو مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ سر طاہر کو اسے سمجھانے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ پہلی بار طاہر کو ایمن کی خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ بابر اسے طاہر کے سامنے لاپروا جملے میں آتے پر سخت سُست سناتا ہے۔

پھوپھو زاد عثمان کے عندیے پر مائرہ اپنی والدہ اور پھپھو کے ساتھ ایمن کے گھر آتی ہے۔ مہرالنساء ان سب کی آمد کا مقصد جان کر بہت اچھی طرح پیش آتی ہیں جس پر ایمن خاصی حیران ہوتی ہے تاہم تمام معاملہ وقارالحسن کی آمد تک ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ ایمن اسے مہرالنساء کی نئی چال سمجھتی ہے۔ وہ شام ڈھلے ٹیوشن کے لیے دادا جی کے پاس آتی ہے تو طاہر محمود اسے دھوکے سے اندر لے آتا ہے۔ وہاں آکر اسے پتا چلتا ہے کہ طاہر محمود کے علاوہ گھر میں کوئی اور موجود نہیں ہے۔ ایمن خوش قسمتی سے طاہر محمود کے چنگل سے بچ نکلتی ہے۔ طاہر محمود کو اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہوتی ہے لیکن وہ بظاہر نارمل رہتا ہے۔ ایمن دادا جی کے پاس پڑھنے نہیں آتی تو انہیں تشویش لاحق ہو جاتی ہے۔ طاہر محمود اپنی باتوں سے ایمن کو رام کر لیتا ہے۔

وقارالحسن کی اچانک آمد گھر بھر کو مسرور کر دیتی ہے۔ ایمن ان سے زیادہ رویہ اپناتی ہے تو وہ ایمن سے وجہ دریافت کرتے ہیں۔ ایمن جذبات میں آکر اپنی آپ بیتی ان کے گوش گزار کر دیتی ہے جس پر وہ سکتے میں آجاتے ہیں تاہم وہ مہرالنساء سے اس بابت کچھ دریافت نہیں کرتے۔ پھوپھو کی پوچھ گچھ کے بعد ایمن کا رشتہ عثمان سے طے کر دیا جاتا ہے۔ ایمن کے دل کی کلی سی کھل جاتی ہے۔ ایمن، دادا جی اور طاہر محمود کو اپنی منگنی کے متعلق بتاتی ہے وہ یہ جان کر کہ دادا جی کی بیٹی کا نام سارا تھا، ایمن بھونچک رہ جاتی ہے۔ منگنی والے روز سب ایمن کے جوڑے کی تعریف کرتے ہیں جس پر موسو کو جلاپا محسوس ہوتا ہے۔ موسو کے علاوہ ایک اور شخص ایمن کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

وہ طاہر محمود تھا جسے عین منگنی کے دن یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایمن کو پسند کرنے لگا ہے۔ طاہر محمود لاابالی فطرت کا مالک ہے۔ وہ کوئی کام مستقل مزاجی سے نہیں کرتا۔ اپنی بد فطرتی سے مجبور ہو کر وہ ایمن اور عثمان میں رنجشیں بڑھاتا ہے۔ ایمن کا معصوم ذہن اس کی عیاریاں سمجھنے میں ناکام ہے۔ وہ اسے اپنا محسن سمجھتی ہے۔ ان ہی دنوں نانا جی، ایمن اور طاہر محمود کے سامنے یہ انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ہی سارا (ایمن کی ماں) کے سگے باپ ہیں۔ ننھیالی رشتہ دار کا میسر آنا ایمن کو سرشار کر دیتا ہے۔ مہرالنساء، ایمن اور طاہر کے مابین بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو اپنے انداز میں لیتی ہے۔ ایمن اپنے دل کی تمام باتیں نانا جی سے کرتی ہے۔ منگنی کے تحفے کے طور پر طاہر محمود، ایمن کو اس کا کھویا ہوا بریسلیٹ دیتا ہے جس پر وہ اس کی مشکور ہوتی ہے۔ نانا جی، ایمن کو طاہر محمود کے کمرے میں جانے سے منع کر دیتے ہیں جس پر حیران ہونے کے باوجود وہ مان جاتی ہے۔

شاہ میر ایک آزاد فطرت شخص ہے جو کسی معاملے میں حدود و قیود کا قائل نہیں۔ لندن میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ کیتھی کے گھر میں رہائش پذیر ہے۔ کیتھی اور شاہ میر میں دوستی سے بڑھ کر تعلقات ہیں جس پر شاہ میر کو کوئی شرمندگی نہیں۔ کیتھی اس سے عمر میں خاصی بڑی ہے۔ کیتھی کا باپ پاکستانی تھا جو اس کی کم عمری میں اس کی ماں کو چھوڑ گیا۔ اس لیے اب وہ ہر پاکستانی سے نفرت کرتی ہے۔ شاہ میر کو بھی وقتاً فوقتاً وہ اس کی افغانیت یاد دلاتی رہتی ہے۔ کئی سالوں سے شاہ میر کا پاکستان میں کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسے اس وقت حیرت ہوتی ہے جب اسے پاکستان سے ایک خط موصول ہوتا ہے۔ یہ خط اسے ذہنی طور پر بے حد مضطرب کر دیتا ہے۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس کے دوست احمد عالی کی کوششوں کے باعث پاکستان سے یہ نامہ آیا ہے۔ وہ احمد عالی سے سخت لہجے میں باز پُرس کرتا ہے۔ ان ہی دنوں کیتھی اسے ماں بننے کی نوید سناتی ہے جس پر شاہ میر

کو جھٹکا لگتا ہے لیکن دوسرے ہی پل شاہ میر کیتھی کو شادی کے لیے پرپوز کر دیتا ہے جس پر کیتھی ششدر رہ جاتی ہے۔

موسو مہرالنساء کی مدد سے چہ سختی کے باعث چور راستے ڈھونڈنے لگتی ہے۔ کالج میں اس کی دلچسپی نائلہ اور اس کی "دوستی" تک محدود ہے جس کا علم مہرالنساء کو نہیں ہے۔

اپنی میٹھی چپڑی باتوں سے طاہر محمود، ایمن کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے۔ نانا جی، طاہر محمود کو اس جرم پر گھر بدری کی سزا سناتے ہیں اور ایمن کو بھی سخت سُست سننے کو ملتی ہیں۔ دونوں کے مابین تعلق کا علم مہرالنساء اور بابر کو بھی ہو جاتا ہے۔ مہرالنساء، وقارالحسن کو اپنے مقدمے سے خبر بھی بتاتی ہیں۔ طاہر محمود، باہر جانے کے لیے پیسے نہ ہونے کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ اپنی چوڑیاں اسے لا کر دیتی ہے۔ وقارالحسن اس حرکت پر اسے تنبیہہ کرتے ہیں تو وہ خودکشی کی دھمکی دیتی ہے اور کچھ دیر بعد اپنی بات پر عمل بھی کر دکھاتی ہے۔ بڑی دقتوں سے اس کی جان بچتی ہے۔ یہ خبر کسی نہ کسی طرح آس پڑوس اور ایمن کے متوقع سسرال تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ مہرالنساء سب کو جواب دیتے دیتے تھکنے لگتی ہیں۔ آخر کار وقارالحسن حالات کے پیش نظر عثمان کی فیملی سے معذرت کر لیتے ہیں اور بابر سے طاہر محمود کو بلوانے کا کہتے ہیں۔ ایمن اسے اپنی محبت کی فتح سمجھتی ہے لیکن جب اس کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ طاہر محمود ساری رقم لے کر ملک سے فرار ہو چکا ہے۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ وقارالحسن بدنامی کے ڈر سے اپنے جونیئر کولیگ طارق کے سامنے خود اپنی بیٹی (ایمن) کا رشتہ رکھتے ہیں جو تمام صورت حال سے یکسر لاعلم ہے۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔

طارق شادی کے بعد ہر طرح سے ایمن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایمن، طارق سے تعلق کو بوجھ سمجھتی ہے۔ وہ کسی کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے طارق کے چچا چچی کی تمام محبتوں کے باوجود ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ مہرالنساء اور اپنے بھائی بہنوں سے رابطہ رکھنا نہیں چاہتی۔ طارق کے تعمیر کیے بنگلے میں نوکروں کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ اس کی نادانیوں کا نوکر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسے امید سے ہونے کی خوش خبری سناتے ہیں تو بجائے خوش ہونے کے وہ اسے اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھتی ہے۔ وہ طارق کے حوالے سے کوئی بیڑی نہیں باندھنا چاہتی۔ اس لیے اپنی لاپروائی کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳۴
چونتیسویں قسط

"کون؟" ایمن ٹھٹک سی گئی۔

"یہ دریا پار کیسے ہو
نہ تم ہو اس کنارے پر
نہ ہم ہیں اس کنارے پر"

ہلکی مدھم آواز ایمن کو اندر تک کاٹتی چلی گئی۔

"سو بہتر ہے
ہم اپنے اپنے دائروں کے اس خلا میں گھومتے جائیں
ستاروں کی طرح
اک ساتھ چمکیں اور دمکیں تو سہی، لیکن
یہ اپنے بیچ میں جو فاصلوں کا سرخ دریا ہے
اسے تسلیم ہی کر لیں۔"

ایمن کی ٹانگیں زور سے کانپیں۔ اسے لگا... وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔

"کہ اس بے پل کے دریا میں
نہ تم ہی تیر سکتے ہو نہ ہم ہی تیر سکتے ہیں

بہت اچھا تو لگتا ہے
اچانک اس طرح دل کا محبت آشنا ہونا
دوبارہ مبتلا ہونا۔"
ایمن کے اک اک مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔
وہ کیسے بھول سکتی تھی۔
آواز کا یہ زیروبم۔
لہجے کی گمبھیرتا۔
الفاظ میں چھپی محبت کی وارفتگی۔

وہی تو تھا۔
"زندگی جس کے تصور میں گنوا دی ہم نے "
"طاہر.....!" ایمن کے لب کپکپائے۔

"طاہر....." وہ چیخ اٹھی۔
دوسری طرف اک سرد آہ بھری گئی اور رابطہ منقطع ہوگیا۔۔۔ ایمن کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔۔۔ وہ ایک پل بھی اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی تھی۔۔۔ بے دم سی ہو کر گری۔۔۔ ریسیور اب بھی اس کی ہتھیلی میں جکڑا تھا۔۔۔ مگر دوسری طرف اک جامد سناٹا تھا۔۔۔ اس نے کئی بار کریڈل پر ہاتھ مار کر دیوانہ وار پکارا۔۔۔
"طاہر! خدا کے لیے میرے ساتھ ایسا نہ کرو..... اگر یہ تم ہو تو مجھ سے بات تو کرو۔"
طارق جو آج پروانے کی طرح اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا' اس کے کافی دیر غائب رہنے پر ڈھونڈتا ہوا لاؤنج میں آیا.....وہ فون اسٹینڈ کے پاس قالین پر بیٹھی تھی' ریسیور اس کے دونوں ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔
"کیا ہوا؟" ایمن نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے طارق کو دیکھا۔
"کیا بات ہے' کس کا فون ہے؟" وہ بے اختیار اس کے قریب بیٹھا۔ ایمن نے غیر محسوس انداز میں بے جان ہاتھوں کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈالا۔ اس کے کان ابھی تک سائیں سائیں کر رہے تھے۔
جسم بے جان' ٹھنڈے پسینے۔۔۔ اس نے چاہا کہ کچھ بولے' مگر زبان تالو سے چپک گئی۔۔۔ طارق نے نجانے کس کو آواز دے کر پانی لانے کو کہا..... آن واحد میں سب اس کے گرد اکٹھے ہوگئے۔
"کیا ہوا؟"
"طبیعت کیسے خراب ہوگئی؟"
"اسے اندر تو لے کر جاؤ۔"
سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔۔۔ طارق کے ہاتھ سے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد ایمن نے بمشکل خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔ طارق اور سدرہ نے سہارا دے کر کھڑا کیا..... ساڑھی الگ مصیبت بن رہی تھی۔ ان کے سہارے وہ بیڈ تک آئی۔
"کچھ نہیں' مجھے صرف چکر آ گیا تھا۔" سب تشویش ناک انداز میں اسے دیکھ رہے تھے' ایمن کو بولنا ہی پڑا۔
"تم لیٹ جاؤ۔" سدرہ نے اسے لٹا کر عقب میں تکیے رکھے۔
"فون کس کا تھا؟" طارق نے پوچھا۔
"پتا نہیں' میں سن نہیں سکی۔" ایمن نے نظریں چرائیں۔

"چاچی صدقے..... اتنی کمزور سی ہے' اور صبح سے چولہا سنبھال کر کھڑی تھی' چکر تو آنا ہی تھے۔ پتا نہیں' خود ڈھنگ سے کھانا بھی کھایا تھا یا نہیں۔" چاچی واری صدقے جانے لگیں۔۔۔ چاچے کی جیب سے روپے نکلوا کر وارے۔
"لگ بھی تو کتنی پیاری رہی تھی۔ ضرور کسی کی نظر لگ گئی ہے۔" سدرہ نے اپنا بچہ سنبھالتے ہوئے خیال آرائی کی۔
"اللہ خیر کرے' کس کی نظر لگنی تھی۔ سب اپنے ہی تو ہیں۔"
"چاچی' پیار کی نظر تو پہلے لگتی ہے۔" سدرہ نے سرسری طارق کو دیکھ کر شرارتی انداز میں کہا۔ وہ جو بڑی تشویش سے ایمن کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سنبھلا' پھر مسکرایا۔
"میں اب ٹھیک ہوں۔" سب اس کے سر پر سوار تھے' ایمن کو الجھن سی ہونے لگی۔ اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے اور وہ اس وقت مکمل تنہائی کی خواہاں تھی۔ چاچی اس کا سر دبا رہی تھیں' تو سدرہ ہاتھ سہلا رہی تھی' اس نے اپنا بچہ ایمن کے ساتھ ہی لٹا دیا تھا' جو غوں غاں کرتا خواہ مخواہ کھلکھلائے جا رہا تھا۔
"آپ لوگ چائے وغیرہ پئیں۔"

"ہے جھلی! ہماری چائے کی اتنی فکر' اور اپنی پروا ہی نہیں' لو اچھی بھلی چلتی پھرتی کھڑی کھلوتی گر گئی۔" چاچی نے پیار سے ڈپٹا اور ساتھ ہی اک آہ بھری۔۔۔ اگر طارق آج ہی واپس نہ آیا ہوتا تو وہ خوش خبری ہی سمجھتیں۔
"تھوڑی دیر آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
"پہلے کاکی کو کچھ کھلا پلا دے' ضرور صبح سے بھوکی ہوگی۔" لاؤنج سے چاچا کی گونج دار آواز ابھری۔ وہ اور طاہر اندر نہیں آئے تھے۔ ایمن کے نا' نا کرنے کے باوجود سب نے اسے جوس پلایا..... سیب کھلایا' ایمن کا جی چاہتا تھا وہ سب کو یہاں سے دفع ہو جانے کے لیے کہے' مگر لب سلے ہی رہے' پھر سدرہ ہی کو ترس آیا۔
"ہم باہر چلتے ہیں' تم آرام سے آنکھیں موند کر ریلیکس کرو۔"
وہ سب کو باہر لے گئی' کمرے میں خاموشی کی دبیز چادر تن گئی۔ اس خاموشی میں وہ اپنے دل کی دھڑکن بخوبی سن سکتی تھی' جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔
وہ لہجہ' وہ آواز اجنبی نہ تھی۔
کون تھا؟
"اگر طاہر محمود تھا' تو اس نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔"
اگر وہ نہیں تھا تو دل کیوں پاگل ہو رہا ہے؟
بند آنکھوں سے گرم سیال بہہ نکلا۔۔۔ طارق نے بہت نرمی سے ان آنسوؤں کو چن لیا' ایمن نے احساس ہوتے ہی آنکھیں میچ لیں' وہ طارق کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"کیوں روتی ہو؟"
"میں بہت تھک گئی ہوں۔"
"کس نے کہا تھا۔۔۔ خود کو اتنی تکلیف دو۔۔۔ اتنے سارے نوکر کس لیے ہیں؟"
"میں سونا چاہتی ہوں۔"
"سو جاؤ' میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔" وہ کہہ کر چپکے سے باہر نکل گیا۔

ایمن کو نیند نہیں آئی تھی۔
وہ صرف رونا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

طارق کے پاس ایمن سے کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں' اور اسے خوشی اس بات کی تھی کہ پہلے کی نسبت اب ایمن اس کی باتیں سنتی تھی۔ اگرچہ وہ محسوس کرتا تھا کہ ایمن الجھی ہوئی ہے' مگر طارق کے لیے یہ بات نہ تھی' یہ الجھی الجھی ایمن ہمیشہ سے اس کے ساتھ تھی شادی کے اول دن سے اب تک وہ اس الجھن کا سرا نہ ڈھونڈ سکا تھا' اور طارق کو ضرورت بھی نہ تھی' ایمن کا ماضی جو بھی تھا' اب وہ طارق کا آج تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے کیپٹن منگیتر کو اب تک نہ بھولی تھی' جو اسے دغا دے گیا تھا۔
اور اب طارق خوش تھا کہ وہ اسے بھولی تھی یا نہیں' بہرحال وہ طارق کو غیر محسوس انداز میں توجہ دے رہی تھی۔ چاچا' چاچی ایک دن رک کر واپس چلے گئے' سدرہ تھے سے بچے اور معصوف میاں کے ساتھ روز' روز نہیں آ سکتی تھی' فون پر خیریت دریافت کر لیتی' البتہ فرحت دو دن شام کو آتی رہی' پھر ایمن کی طبیعت بحال ہوئی تو اسے "تم اپنے میاں کے ساتھ وقت گزارو" کہہ کر دوبارہ نہیں آئی۔ کچھ دن تو اس فون نے ایمن کو بے حد ڈسٹرب رکھا' وہ شعوری اور لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ دوبارہ فون کرے گا' مگر اس کا انتظار انتظار ہی رہا' اب تو اسے لگتا تھا کوئی واہمہ ہی ہے' شاید وہ فون کسی اور کے لیے تھا اور غلطی سے لائن ادھر مل گئی' مگر وہ لہجہ' وہ انداز۔۔۔
اس کی نیند ٹوٹ جاتی تو ساری رات کروٹیں بدلتے گزرتی' چاندنی کھلے دریچے سے اندر در آتی اور اس کے کانوں میں چپکے سے گنگناتی۔
وہ مضطرب سی ہو اٹھتی' ایسے میں طارق کی آنکھ کھلتی تو حیران ہو کر پوچھتا۔
"ایمی! نیند نہیں آ رہی؟"
وہ خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیتی۔
"آؤ میں سلاتا ہوں۔"
وہ چپکے سے اس کے بازو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی' طارق کو اس کی یہ فرمانبرداری بہت اچھی لگتی' اس کی انگلیاں ایمن کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگتیں' ایمن کو نیند تب بھی نہ آتی' مگر وہ طارق کو جھانسہ دینے کے لیے سوتی بن جاتی' اور یونہی جھانسہ دیتے دیتے نیند کب مہربان ہوتی' خود اسے بھی خبر نہ ہوتی' اور نہ یہ کہ طارق کتنی محبت سے اس کے خوابیدہ نقوش دیکھا کرتا' اسے اب بھی حیرت تھی کہ ایسی خوبصورت اور کومل سی لڑکی اس کا نصیب بن گئی' وہ بدل رہی تھی تو اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ اسے بازوؤں میں بھینچ کر دل میں چھپا لے۔ وہ ایمن کو خوش دیکھنا چاہتا تھا' بہت خوش اور مطمئن' وہ اس کے گھر کے کاموں میں انوالو ہوئی تو وہ خوش تھا۔ وہ ہر ہر معاملے پر نظر رکھتی' بالکل ویسے جیسا کہ طارق چاہتا تھا۔
"کیا کر رہی ہو؟"
وہ صغریٰ کے ساتھ مل کر رات کا کھانا تیار کر رہی تھی' جب طارق کچن میں چلا آیا۔
"دعوت ہی تھی۔" ایمن نے سادگی سے کہا تو صغریٰ ہنس دی۔
"اب جاؤ۔" وہ اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ایک طرف رکھتے' دوسرے ہاتھ سے کھینچ کر باہر لے گیا۔
"مجھے ہاتھ تو دھونے دیں' پیاز کی بو آئے گی۔"

"یہ پیاز وغیرہ صغریٰ سے کٹوایا کرو۔" طارق نے بازو نہیں چھوڑا۔

"آپ تو ٹی وی دیکھ رہے تھے۔" ایمن جھنجلائی۔

"میں یہاں ٹی وی دیکھنے نہیں آیا۔" طارق نے جتایا۔

"تو کیا کرنے آئے ہیں۔" ایمن نے بازو چھڑانے کی سعی ترک کردی۔ "اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ وقت گزارنے' جو سارا دن کچن میں گھسی رہتی ہے۔"

"اچھا۔ جب کام نہیں کرتی تھی' تب بھی اعتراض تھا۔" وہ آرام سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی' تب ہی طارق نے اس کا بازو چھوڑ کر کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کرلیا۔

"میرے جانے کے بعد بھلے دیگیں چڑھاتی رہنا' تھوڑے سے دن ہیں' میرے پاس رہا کرو' میری نظروں کے سامنے۔"

"لوگ زن مرید کہیں گے۔" وہ ہنسی روکتے ہوئی بولی۔

"کہتے رہیں' میری ذاتی بیگم ہے۔" وہ کچھ زیادہ ذاتیات پر اتر آیا۔ ایمن نے غصے سے گھورا۔

"راہداری میں کھڑے ہیں۔"

"تو۔ میں کون سا ہمسائی سے عشق لڑا رہا ہوں۔" طارق نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یہ شوق بھی پورا کرلیں۔" ایمن آگے آگے چلنے لگی۔

"تمہیں ہی اعتراض ہوگا۔"

"نہیں' مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔"

"جانتا ہوں۔" طارق کا لہجہ مدھم ہوگیا' ایمن ایک دم رکی' پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"تم کون سا مجھ سے پیار کرتی ہو۔"

"ابھی تو صرف تمہیں تسلیم کررہی ہوں' پیار کی منزل تو بہت دور ہے۔ اور کون جانے یہ منزل آئے گی بھی یا نہیں' تقدیر نے میری زندگی سے یہ صفحہ ہی پھاڑ ڈالا' تمہارے حصے میں کیا آئے گا' جو مل گیا ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔"

ایمن کو خود نہیں پتا تھا کہ یہ نظریہ ضرورت ہے یا طارق کا اچھا سلوک کہ وہ خود کو بدل بیٹھی۔

"میں گھر میں کچھ نئی چیزیں لائی تھی' کچھ نئے پودے' کچھ۔" وہ سر جھٹک کر موضوع بدل گئی' طارق نے اک طویل سانس لے کر اس کا ہاتھ تھام لیا' مختلف کمروں سے گزرتا ساری بتیاں جلاتا گیا' سارا گھر جگر جگر کرنے لگا' چیزوں کی اہمیت و قیمت واضح ہونے لگی' جو ابتری آج تک اس گھر کا حصہ رہی تھی' اب کہیں نہ تھی' ہر چیز سلیقے و طریقے سے صاف ستھری جگمگا رہی تھی' کہ ابتری گھر میں نہیں ایمن کی ذات میں تھی' وہاں سدھار کا عمل شروع ہوا تو ہر چیز اپنے ٹھکانے پر آنے لگی' وہ چلتے پھرتے لان میں نکل آئے' وہاں مصنوعی روشنی کم تھی' نیم تاریکی میں انواع و اقسام کے پھولوں کی خوشبوئیں۔ ہم کلام تھیں۔

یہ بہار کا عروج تھا۔

یہ ان دونوں کی زندگی میں بہار کا نقطۂ آغاز تھا۔

"میں نے اک مکان بنایا تھا' تم نے اسے گھر بنادیا۔" طارق اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

"یہ میرا فرض تھا۔" وہ رخ بدل کر چنبیلی کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

"پتا ہے امی! مجھے کبھی بھی بڑے گھر اچھے نہیں لگے' لیکن جب میں نے اپنے لیے گھر بنایا تو بہت بڑا اور کھلا

بتایا۔" وہ کہنا چاہتا تھا کہ بہت جلدی فرائض کا خیال آگیا' لیکن اس کا موڈ خراب نہ ہو' اسی لیے بات بدل دی۔

"یہ بہت عجیب بات ہے۔"

"ہاں یہ بہت عجیب بات ہے۔" وہ بلاوجہ ہنسا۔ "شاید اس لیے کہ یہاں ایک شہزادی نے آکر بسنا تھا' میں تمہیں شہزادی کہا کروں گا۔"

"میرا نام ایمن ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"لیکن حرکتیں تو شہزادیوں والی ہیں' وہی غرور' وہی طنطنہ۔"

"اندر چلیں۔ کھانا بن گیا ہوگا۔"

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

"ہوں۔" ایمن نے قدم بڑھائے۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔"

وہ لاؤنج میں تھے' جب فون کی بیل بجی تو ایمن کا دل زور سے دھڑکا' اور ایسا ہر بیل پر ہوتا تھا' اس سے قبل کہ طارق اٹھاتا' اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ پھر قدرے مایوسی سے طارق کی طرف بڑھادیا۔

"آپ کا فون ہے۔"

طارق نے اس کا لپکنا اور مایوس ہونا پوری طرح محسوس کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کالج کا گیٹ کھلا' بھانت بھانت کی لڑکیاں سیلابی ریلے کی طرح باہر نکلیں' چھوٹی' موٹی' لمبی' چادر اوڑھے' کچھ ننگے سر' کالج بیگ کندھوں سے لٹکائے' فائلیں ہاتھوں میں لیے خوبصورت' کم صورت' بدصورت الغرض کہ ہر قسم کی صورت اپنے اپنے رکشوں' ویگنوں' گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی طرف لپک رہی تھیں' ہر طرف پلی پلی۔ پاں پاں کا شور تھا۔ وہیں سڑک کے پار ٹاہلی کے جھنڈ کے نیچے وہ چاروں اپنی اپنی بائیک پر بیٹھے تھے۔

"وہ کیسی ہے؟" ایک نے دوسرے کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ جس نے تیز نارنجی پلی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"کون۔"

"جو گیٹ والی زنجیر کے پاس کھڑی ہے' نیلے دوپٹے والی' جو بھٹہ کھا رہی ہے۔" رش اب کم ہونے لگا تھا' سو فوراً "بھٹہ کھاتی لڑکی نظروں میں آگئی۔

"بے کار ہے۔"

"اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے پاس سے گزرتی لڑکی کو دیکھ کر ٹھوکا دیا۔ نارنجی شرٹ والے نے سیاہ گلاسز کے عقب سے لڑکی کو غور سے دیکھا' جو نظریں جھکائے' بے نیازی سے گزرتی چلی گئی۔

"اپنے ٹائپ کی نہیں۔"

"تجھے بہت پتا ہے۔" ایک نے چڑ کر کہا۔

"لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

"بڑھکیں کم مارا کر۔"

"اوئے۔ تیری تو۔"

"لڑنے کی کیا بات ہے' اپنا یار سب سے زیادہ ایکسپیرینسڈ بندہ ہے' بائی دا وے کنتواں کیس ہے؟"

"تعداد یاد نہیں رہتی۔" اس نے بے نیازی دکھائی۔

"اچھا۔۔۔ وہ تیرے والی ابھی تک باہر نہیں آئی۔"

"ابھی آجائے گی۔" رش بتدریج کم ہوتا جارہا تھا' ان کی متلاشی نگاہیں گیٹ پر جمی تھیں' اور چوکیدار مشکوک نگاہوں سے بار بار انہیں دیکھ رہا تھا۔ تب ہی وہ دونوں آپس میں باتیں کرتی باہر آئیں۔

"وہ رہی۔۔۔" نارنجی شرٹ والا ایکدم پرجوش ہوا۔

"یہ بلبل۔۔۔"

"نہیں یار ساتھ والی۔"

"یہ۔۔۔" تینوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ "یہ تو اس ٹائپ کی نہیں لگتی۔" میرون دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے وہ ٹشو سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتی اپنی سہیلی سے غالباً "الوداعی کلمات" ادا کر رہی تھی۔

"تو بکتا ہے' یہ وہ نہیں ہے۔"

"ابھی دیکھو۔۔۔" اس نے برا مانتے ہوئے جیب سے موبائل نکالا' لڑکی کو نظروں میں رکھتے ہوئے نمبر ملایا' سب نے دیکھا' وہ باتیں کرتی کرتی ایک دم چونک کر خاموش ہوئی' پھر بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا' موبائل باہر نکالے بغیر نمبر دیکھا' اس کی سہیلی بھی اس کے بیگ پر جھک آئی' اس نے ہنستے ہوئے کچھ کہا' جواباً" اس نے نفی میں سر ہلاتے موبائل آف کر دیا۔

"دیکھا۔۔۔" اس نے تفاخر سے دوستوں کو دیکھا۔

"مان گئے استاد' پر اسے کہاں تک لے جاؤ گے۔"

"جہاں تک چاہوں۔۔۔" وہ معنی خیز ہنسی ہنسا۔

"نہیں یار! بس فون تک رہے گی۔"

"تم دیکھنا۔ وہ میری خاطر گھر سے بھاگے گی' میں جسے چاہوں اپنی انگلیوں پر نچالوں۔۔۔ وہ کٹھ پتلی ہے' اور اس کی ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔" اس نے انگلیاں نچائیں' اس کے لہجے میں وہی سفاکی اور ڈھٹائی تھی' جو عادی مجرموں کے لہجے میں ہوتی ہے۔

"شرط لگالو۔"

"او کے۔۔۔" تاہل کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے چار شیطانوں نے کسی کی بربادی پر شرط باندھی تھی۔

☼ ☼ ☼

طارق کو کہیں جانا تھا' اسی نے کہا کہ وہ اسے میکے چھوڑ دے گا' واپسی پر پک کرلے گا۔۔۔ پاکستان آنے کے بعد وہ ایک آدھ بار مختصر وقت کے لیے مہرالنساء سے ملنے گیا تھا' میکے لفظ پر ایمن کو ہنسی آگئی۔

"میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے۔" طارق برا مان گیا۔

"نہیں۔۔۔ یونہی ہنسی آگئی۔"

"اس میں ہنسی والی کوئی بات تو نہیں تھی۔ یا خوش زیادہ ہوگئی ہو۔"

"میکہ والدین سے ہوتا ہے۔۔۔ ماں میری ہے نہیں' باپ پردیس میں ہے۔" ایمن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور پالنے والی کا کوئی حق نہیں؟" طارق نے جرح کی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا کنگھی کر رہا تھا۔ جبکہ ایمن بیڈ پر نیم دراز اک رسالہ کھولے ہوئے تھی۔

"مجھے مہرالنساء نے نہیں پالا۔"

"اچھا۔۔۔ خود بخود اتنی بڑی ہوگئی تھیں۔"

"مجھے خدیجہ بی نے پالا تھا۔ ہماری دور پرے کی عزیزہ۔۔۔ ان کے جانے کے بعد تو۔۔۔" اس نے دانستہ خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا' وہ جانتی تھی' طارق مہرالنساء کی کتنی عزت کرتا ہے۔

"تم مہرالنساء آپا کے بارے میں بہت غلط سوچتی ہو۔۔۔ میرے نزدیک وہ ایک سمجھ دار خاتون ہیں۔"

طارق نے ہمیشہ کی طرح مہرالنساء کی حمایت کی۔ ایمن تلملا گئی۔ نجانے اس عورت نے کیا گھول کر پلایا تھا' جب طارق مزید کہہ رہا تھا۔

"انہوں نے کبھی مجھ سے تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کی' جبکہ تم ہمیشہ ان کے خلاف برا ہی بولی ہو۔" اس نے پرفیوم اٹھالیا۔

"آپ انہیں جانتے ہی کتنا ہیں' اور وہ بھی محض چند سالہ جان پہچان۔ میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں۔"

"گویا آخری بات یہ کہ تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔" طارق کی تیاری ختم ہوگئی۔ ایمن کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ تھوڑا پرفیوم اس پر بھی چھڑک دے' مگر طارق جیسے بندے سے ایسی رومینٹک حرکت کی توقع ہی فضول تھی' اسے پرفیوم واپس رکھتے دیکھ کر ایمن مایوس سی ہوگئی۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں' آخر وہ میرے باپ کا گھر ہے' میرا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا مہرالنساء کی اولاد کا۔"

ایمن کو یہ خبر نہ تھی کہ وقار الحسن یہ گھر بہت پہلے مہرالنساء کے نام کر چکے تھے' جس طرح طارق نے اپنا گھر ایمن کے نام کیا تھا۔

"چلو۔۔۔ ٹھیک ہے' اب ذرا جلدی تیار ہو جاؤ' مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"آخر اتنی تیاریوں کے ساتھ جا کہاں رہے ہیں؟" ایمن نے اٹھتے ہوئے اس کی تیاری کو غور سے دیکھا۔

"ہک۔۔۔ ہا۔۔۔ پہلی بار کوئی بیویوں والا سوال کیا ہے۔"

ایمن چڑ کر وارڈروب کھول کر سوٹ نکالنے لگی۔ اس نے عقب سے آکر وارڈروب کے کھلے دروازوں پر ہاتھ رکھ کر رستہ مسدود کیا۔۔۔ وہ پلٹی تو اس سے ٹکرا گئی۔

"اُف۔۔۔ ہٹیں۔۔۔" ایمن نے غصے سے کہا اور ساتھ ہی اسے دھکیلنا چاہا۔

"لگاؤ زور۔۔۔ ذرا دیکھوں کتنا دم ہے۔" طارق ہنسا۔

"ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔" ایمن کو تاؤ آگیا۔

"اوئے۔۔۔ باپ رے' تیرے تو بڑے خطرناک ارادے ہیں کڑیے۔" وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایمن ڈریسنگ روم کے دروازے تک جا کر رکی اور طنزاً" مسکرائی۔

"بس اتنا ہی دم تھا۔"

"ہوں۔" وہ ٹھٹکا' پھر دانت پیس کر بولا۔ "رات میں پوچھوں گا۔"

"میں رات وہیں رکوں گی۔" ایمن نے اندر جاتے ہوئے مزید دھمکایا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ جب تک میں یہاں ہوں ایک بار بھی نہیں۔" طارق نے زور سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے۔۔۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ چھٹی کے بعد جب میں کالج گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تب۔۔۔" موحل نے زور دے کر کہا۔

"اوہ۔۔۔ تو تم نے اس لیے مجھے فون کیا ہے' اور میں سمجھا کہ۔۔۔" اس نے اک سرد آہ کھینچی۔

"زیادہ خوش گمان مت ہو، مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔"

"لیکن مریض عشق کے پاس تو کوئی اور کام نہیں۔۔۔ اک درد ہے اور ہماری ہائے۔۔۔ ہائے۔" وہ عاشقانہ انداز میں گویا ہوا۔

"میرے پاس یہ سب سننے کا بالکل وقت نہیں۔ میں نے صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے وقت بے وقت فون مت کیا کرو۔۔۔ تمہارا کیا جائے گا۔۔۔ مروں گی تو میں۔۔۔" موموول ہی دل میں اترائی نروٹھے پن سے بولی۔

"مریں تمہارے دشمن۔ فرشتہ اجل آیا تو تمہاری جان کی جگہ اپنی جان پیش کروں گا۔"

جتنا اس نے سوچا تھا کہ فوراً" سرزنش کرکے فون بند کروے گی اتنا ہی اس کی باتوں کے سحر میں جکڑتی جا رہی تھی۔

"اتنی محبت کرنے لگے ہو۔" موموکا لہجہ و آواز خود بخود مدھم ہو گیا۔

"کاش کوئی پیمانہ ہوتا۔۔۔ سمندروں کی گہرائی ناپی جاسکتی یا آسمان کی وسعت۔۔۔ سدا سے عاشقوں کا یہی المیہ ہے۔۔۔ بس ایک طریقہ ہے۔"

"کیا؟"

"دل چیر کر دکھا دوں۔۔۔ اک جان ہی جائے گی۔۔۔ لیکن تمہیں تو اعتبار آجائے گا۔"

"پلیز۔ ایسی باتیں مت کرو۔" مومونے بے ساختہ ٹوکا۔

"یہی بے خودی کا عالم ہے کہ کال کسی اور کو ملا رہا تھا کہ انگلیاں تمہارا نمبر ملا بیٹھیں۔"

"پلیز، آئندہ احتیاط کرنا، اب رات کو بات کروں گی، کوئی آجائے گا۔" اس کی باتیں لمبی ہو رہی تھیں۔ مگر مومو کو وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا، اسے خبر نہ تھی کہ کسی نے اس گفتگو کا ایک ایک حرف سنا تھا۔ وہ موبائل لبوں سے لگائے کسی گہری سوچ میں تھی۔ جب ایمن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح اچھلی، موبائل چھوٹ کر نیچے جا گرا اور کھل گیا۔

"یہ تمہارے پاس تھا؟"

مومونے جلدی جلدی موبائل اکٹھا کیا اور دراز میں ڈال دیا۔ وہ بہت زیادہ پزل ہو رہی تھی۔

"کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟" ایمن بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم کب آئیں؟" وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

"جب تم نے نمبر ملایا۔۔۔" ایمن نے اطمینان سے مومو کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے اور اپنی حاوی ہوتی پوزیشن نے اسے کمینی سی خوشی دی۔

"گویا کمینی نے اک اک لفظ سن لیا۔۔۔ کیسے بلی کی چال آئی ہے۔"

"دروازہ تو بند تھا۔"

"نہیں تھا۔"

مومو کا جی چاہا کس کر ایک تھپڑ اپنے گال پر مارے۔۔۔ مہرالنساء نے کہا تھا، وہ ذرا دیر کے لیے پڑوس میں جا رہی ہیں، وہ دروازہ اچھی طرح بند کرلے، پہلے ان کا اکلوتا گھر تھا، مگر اب اردگرد پوری کالونی بن چکی تھی، سو آس پڑوس میں جان پہچان بھی بڑھ گئی۔ مہرالنساء کبھی کبھار کسی نہ کسی کام کے لیے چلی جاتیں، ساتھ والی نورین کے پاؤں کا آپریشن ہوا تھا۔۔۔ جوجو چار بجے گھر آئی تو مہرالنساء انہیں تاکید کرکے چلی گئیں کہ وہ بس پندرہ منٹ میں آجائیں گی۔ جوجو، جو گرمی میں تھکی ہاری آئی تھی، مومو سے کہہ کر خود نہانے چلی گئی۔ اور مومونے ان پندرہ منٹ کو غنیمت جانا، کیا معلوم تھا کہ یہ بلا نازل ہو جائے گی۔

"طارق بھائی نہیں آئے۔۔۔؟" وہ خوامخواہ سوال جواب کر رہی تھی۔ ایمن کو ہنسی آنے لگی۔۔۔

"باہر سے چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔ رات کو لینے آئیں گے۔" ایمن نے سابقہ اطمینان سے جواب دیا، جبکہ اس کی معنی خیز نظریں مومو کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ اس کی نگاہوں سے خائف ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

"رات کو۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔"

"ارے۔ واقعی۔۔۔" ایمن دوبارہ ہنسی۔

"یس! تم۔۔۔"

"میں نے پوچھا کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟"

"کافی دن ہو گئے، بس اچانک ہی۔۔۔" موموں نے پسپائی اختیار کی۔

"مجھے دیکھ کر عبرت نہیں پکڑی۔"

"ضروری تو نہیں، سب کا نصیب ایک سا ہو۔"

"اوہ۔۔۔ گویا معاملہ بہت آگے جا چکا۔"

"ایمن! پلیز تم ممی سے۔۔۔" موموں نے ملتجی انداز میں ایمن کو دیکھا۔ "تم چاہو تو اپنا موبائل واپس لے لو۔"

"اچھا۔ پھر تم کیا کرو گی؟"

مومو لاجواب سی ہو گئی۔ ایمن نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے اندر کی خود غرض اور منتقم مزاج لڑکی انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔

"مجھے آوارہ کہنے والی مہرالنساء بیگم! تمہارا غرور ٹوٹنے کا وقت آپہنچا۔ کیسے نظریں ملاؤ گی۔۔۔ جب معلوم ہو گا کہ تمہاری اپنی بیٹی ان ہی راہوں کی مسافر بن چکی ہے۔"

"ایمی! تم کیا سوچ رہی ہو؟" مومو کو بے چینی لاحق ہوئی۔ کاش وہ ایمن کی سوچیں پڑھ سکتی۔

"یہی کہ ممی کب واپس آئیں گی؟" ایمن نے سادگی سے جواب دیا۔

"ایمی! تم۔۔۔" مومو کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔ "تم تو ممی کو جانتی ہو، وہ مجھے زندہ دفن کر دیں گی۔"

"نہیں۔ اپنی اولاد کو زندہ دفن کرنا آسان نہیں۔" ایمن کھڑی ہوئی، پھر اس کے قریب آئی۔

"اگر ہمت نہ تھی، تو ایسا کام کیا ہی کیوں؟"

"یہ اپنے بس میں تو نہیں۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔"

"ہاں۔۔۔" ایمن کے لبوں پر آہ ٹوٹ کر بکھری۔ "ہاں یہ بے بسی کی منزل ہے۔۔۔ فکر نہ کرو اتنی بھی کم ظرف نہیں ہوں۔"

"ایمی۔۔۔" مومو بے اختیار اس سے لپٹ گئی، تب ہی جوجو چلی آئی، اس کے بال تولیے میں لپٹے تھے۔

"ارے۔ ایمی! تم کب آئیں؟"

"ابھی۔۔۔" وہ جوجو سے ملنے لگی۔

"میں تمہارے لیے جوس لاتی ہوں۔" مومو جلدی سے باہر نکل گئی۔

"آؤ۔ لاؤنج میں چلتے ہیں، میں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔"

جوجو اسے لے کر لاؤنج میں آگئی۔۔۔ جب مہرالنساء واپس آئیں تو ایمن جوس سے اور جوجو کھانے سے فارغ ہو چکی تھی۔ صوفے پر آلتی پالتی مارے کشن گود میں رکھے وہ بے تکلفانہ انداز میں مومو اور جوجو کو بتا رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے لان میں کون کون سے نایاب پودے منگوا کر لگائے ہیں۔ اس کے لہجے میں واضح تفاخر چھلکتا تھا۔ مگر جوجو کو اسی بات کی خوشی تھی کہ کم از کم ایمن نے اسے اپنا گھر تو تسلیم کیا۔

"...سے آئیں؟"

"لگتا ہے آپ کو اب اپنے گھربار کی زیادہ پروا نہیں رہی۔" مہرالنساء کو سلام کرنے کے بعد ایمن نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ جہاں مہرالنساء چونکیں وہیں مومو کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیوں؟"

"طارق پوچھ رہے تھے؟" اس نے لاپروائی سے کہا تو مومو کی جان میں جان آئی۔

"...کا نہیں؟" مہرالنساء سامنے بیٹھ گئیں۔

"گھر میں کوئی تھا نہیں... کس لیے رکتے؟"

"ہمیں پڑوس میں تو گئی تھی ابھی آجاتی۔ تم نے طارق کو بتایا نہیں؟" انہوں نے مومو کو دیکھا۔ وہ متذبذب سی ایمن کو دیکھنے لگی۔ وہ تو خود طارق سے نہیں ملی تھی۔

"شام میں آجائیں گے بلکہ شام تو ہو گئی رات کا کھانا یہیں کھائیں گے۔"

مہرالنساء کو ایمن کے انداز و اطوار بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ وہ بڑے مطمئن اور آسودہ سے انداز میں بات کر رہی تھی خاص طور پر طارق کے لیے وہ جتنے عزت بھرے لہجے میں بات کر رہی تھی وہ مہرالنساء کے لیے نیا ہی تھا۔

"...ہیں! مجھے چھ بجے اکیڈمی جانا ہے۔" جوجو نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ہاں... ہاں... تھوڑا وقت ہے تم آرام کرو میں جانتی ہوں تمہاری روٹین خاصی ٹف ہے۔" ایمن نے جلدی سے کہا۔ "مجھے کمپنی دینے کے لیے ممی اور مومو ہیں نا۔"

جوجو ایک بار پھر معذرت کرتی چلی گئی۔

"جاؤ مومو! فریج میں دیکھو کیا کچھ ہے؟ کچھ منگوانا ہو تو لسٹ بنا دو۔" مہرالنساء نے کہا تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ممی! کیا بنانا ہے؟"

"کوفتے اور سندھی بریانی۔" جواب ایمن نے دیا۔ مہرالنساء نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرائیں۔

"اس کی پسند و ناپسند کا خوب خیال رکھنے لگی ہو۔"

"طارق کہہ رہے تھے مہو آپا کے ہاتھ کی یہ دونوں چیزیں کھانے کے لائق ہیں۔" اس نے لاپروائی سے اضافہ کیا۔ مومو باہر چلی گئی تب مہرالنساء نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لگتا ہے تمہیں عقل آگئی۔"

ایمن فوراً ہی ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

"یونہی سوچا اتنی عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر کیوں سرابوں کے پیچھے بھاگوں اتنا پیسہ... محبت کرنے والا شوہر جو میرے ماضی کی ہر بات بھلا کر مجھ پہ جان دیتا ہے اپنی نیند سونا اپنی مرضی سے کھانا قیمتی سے قیمتی زیور کام کاج کے لیے نوکر چاکر نہ سسرال کا جھنجٹ نہ کوئی اور ٹنٹا نمانے سے چاچا چاچی جو بہو کے ماتھے کی تیوری دیکھ کر ہی سہم جاتے ہیں جب رانی بن کر عیش کر سکتی ہوں تو وقت ضائع کرنے کا فائدہ۔"

ایمن کو پتا تھا اسے کس جگہ مہرالنساء کو کس طرح جلانا ہے۔ وہ حقیقتاً مہرالنساء کی نبض شناس تھی۔ مہرالنساء واقعی پہلو بدل کر رہ گئیں ایمن کا لہجہ مہرالنساء سے صاف کہہ رہا تھا کہ تم جو مرضی کر لو میری زندگی سبک خرام ندی کی طرح سہل اور رواں ہے۔

"بہت جلدی خیال آگیا۔" مہرالنساء نے طنز سے کہا۔
"دیر آید درست آید۔" ایمن نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
"اچھا۔ اگر جو طارق کو پتا چلے کہ ماضی میں تمہارے ایک نہیں 'دو' دو معاشقے چلے ہیں 'اور ایک کی خاطر گھر سے بھاگنے سے لے کر خودکشی تک کر چکی ہو تب تمہارے عیش و آرام کا کیا ہوگا؟"
فطرتاً دونوں ہی ایک جیسی تھیں 'منتقم مزاج' دوسروں کو نیچا دکھانے کی خواہش مند 'کم ظرف۔
"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے یہ سب کہہ چکی ہوں۔" ایمن نے قدرے جھوٹ سے کام لیا۔ مارے حیرت کے مہرالنساء کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایمن نے ان کی حالت سے خاصا مزا لیا۔
"بڑا ہی بے غیرت نکلا۔ تمہارے باپ نے تمہارے لیے ٹھیک کاٹھ کا الو ڈھونڈا ہے۔" مہرالنساء نے تھوڑی دیر کے بعد خود کو سنبھال کر کہا۔
"آپ یہ سوچیں کہ آپ کہاں سے ایسا کاٹھ کا الو ڈھونڈیں گی۔"
"کیا مطلب اس بات کا؟"
"طارق نے مہو آپا کو بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے 'اپنے بارے میں آپ کے خیالات پتا چلے تو برداشت نہ کر پائے گا۔" ایمن نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔
"اگر "وہ" سہ گیا تو "یہ" بھی سہ لے گا۔"
"تب ٹھیک ہے... ڈیڈی کب تک آرہے ہیں۔"
ایمن نے اک دم بات پلٹ کر دوستانہ انداز میں پوچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایمن والے واقعہ نے مومو کو کچھ اور محتاط کر دیا۔ اب وہ آدھی رات کے بعد بات کرتی 'رات کا پہلا حصہ انتظار میں گزرتا' دوسرا باتوں کے فسوں میں 'تیسرے پہر سوتی 'صبح مہرالنساء کی ڈانٹ سنتی اور کالج میں اونگھتی رہتی 'کلاسز میں حاضری نہ ہونے کے برابر تھی 'نائن کا اپنا افیئر آج کل عروج پر تھا اور وہ خاصی سنجیدہ بھی تھی۔
"مراد نے ساتھ دیا۔ تو میں فیصلہ کرلوں گی 'جاگیردار ہے 'ساری زندگی عیش میں گزرے گی 'ٹکے ٹکے کے لیے ترسنا تو نہ پڑے گا۔"
"مگر اس کی بیوی 'بچے... حویلی والے تو بہت تنگ نظر ہوتے ہیں 'بیویوں کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔" مومو کو مراد کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا 'اگرچہ وہ اس سے کبھی ملی نہ تھی 'مگر وہ باتوں سے ہی عیاش طبع لگتا تھا 'کئی بار اس کا ڈرائیور نائن کو کالج سے پک کرنے آیا 'بقول نائن 'مراد اسے پی۔ سی میں لنچ کروانے لے جاتا ہے۔
"مگر تمہاری اور اس کی عمروں میں بہت فرق ہے۔"
"بے وقوف 'ایسے مرد بیویوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔"
"اس نے تم سے شادی کی بات کی؟"
"ابھی تک تو نہیں... مگر جب بھی کی 'میں فوراً "ہاں" کہہ دوں گی 'شہر والی کوٹھی حق مہر میں لکھوالوں گی۔" اس کے لمبے چوڑے پلان تھے۔
"اور تمہارے گھر والے مان جائیں گے؟"
"مجھے ان کی پروا نہیں۔"
دونوں کالج کے پچھلے گراؤنڈ میں 'درختوں کے جھنڈ کے عقب میں سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے 'جہاں اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز تو ایک طرف 'کبھی نوکر بھی نہ جاتے تھے۔

"اور اس کا کیا بنے گا؟" مومو کا اشارہ اس کے سابقہ افیئر کی طرف تھا۔
"بھاڑ میں جائے... صرف باتیں... باقی سب باپ کا... مہینے کے مہینے جیب خرچ لینے والا 'مجھے کیا دے گا۔" وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے بولی 'پھر بات بدل کر پوچھنے لگی۔
"مینا بازار کے لیے کپڑے سے لیے؟"
"بہت ہیں 'ان ہی میں سے کوئی پہن لوں گی۔"
"مجھے تو مراد شاپنگ کروائیں گے... شہر کی سب سے بڑی بوتیک سے۔"
"واؤ۔" مومو نے رشک سے اسے دیکھا۔
"اسی لیے تو کہتی ہوں بندہ ہاتھ مارے تو کسی اونچی جگہ پر..." اس نے مومو کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تمہاری طرح نہیں کہ پہلی بار میں ہی لڑھک گئے۔"
مومو دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے نائن کی ایسی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیا تھا۔ اسی رات جب فون آیا تو باتوں باتوں میں اس نے پوچھا۔
"تمہارے کالج میں مینا بازار ہے؟"
"تمہیں سب خبریں ہوتی ہیں۔"
"کون سے رنگ کے کپڑے پہنوگی؟"
"کون سے رنگ کے کپڑے پہنوں۔" مومو نے برجستہ پوچھا۔
"پنک۔" اس نے فوراً جواب دیا۔
"تم نے مجھے دیکھنا ہے؟"
"میں تمہیں ہر روز دیکھتا ہوں... جس دن نہ دیکھوں... اس دن کو اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔" مومو کچھ دیر کے لیے کچھ بھی نہ بول سکی۔
"سنو 'اس دن کہیں باہر ملیں۔"
"نہیں..." مومو بوکھلا گئی۔
"بس ذرا دیر کے لیے... کہیں آئس کریم کھائیں گے 'پندرہ بیس منٹ میں واپسی۔" اس نے اصرار کیا۔
"پلیز۔ میں یہ کبھی نہ کر سکوں گی۔" مومو نے قطعی لہجے میں کہا۔
"اوکے۔ میں مجبور نہیں کروں گا۔" اس کے لہجے میں مایوسی سی در آئی۔
"میں مجبور ہوں۔" مومو کو اس کا لہجہ برداشت نہ ہوا۔
"ٹھیک ہے مومو... میں تمہیں دور ہی سے دیکھ کر آنکھوں کی پیاس بجھالوں گا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔
"اور میں... میں کیسے پہچانوں گی..." مومو نے جھجکتے ہوئے اپنی درپردہ خواہش کا اظہار کیا... وہ ہنس دیا 'پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔
"اس کے لیے تو کہیں باہر ملنا پڑے گا۔"
مومو چپ کی چپ رہ گئی۔
"پاگل مذاق کر رہا ہوں۔" وہ پھر سے ہنسنے لگا۔
مومو کے پاس گلابی لباس نہ تھا۔ مگر اب ناممکن تھا کہ وہ مینا بازار میں کوئی اور رنگ پہن کر جاتی۔ اس نے مہرالنساء سے کہا تو پاس بیٹھی جوجو فوراً بول اٹھی۔

"تم میرا نیا سوٹ پہن جاؤ۔"

مومو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ اس سبز سوٹ کو آگ لگانے کو دل چاہا، جو کل ہی سل کر آیا تھا۔ اوپر سے مہر النساء نے بھی کہہ دیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں وہی پہن جاؤ۔ جب ٹاپ تم دونوں کا ایک ہی ہے۔"

"ممی! ہم سب یعنی ہمارا گروپ پنک سوٹ پہن کر آرہا ہے۔"

"ایک تو تم لوگوں کے چونچلے۔۔۔ کل چلنا بازار۔" مہر النساء نے کہا، تو وہ خوش ہوگئی۔ مگر بازار میں اس نے مہر النساء کو خاصا زچ کیا، کوئی سوٹ پسند جو نہ آتا تھا، پتا نہیں اسے خریدنا کیا تھا، ہر ڈیزائن، ہر پرنٹ میں نقص۔

"بس یہ آخری سوٹ ہے، خریدنا ہے تو خرید۔۔۔ ورنہ اسی طرح واپس جاؤ گی۔"

مہر النساء نے اسے دکاندار کے سامنے ہی ڈانٹ دیا، پھر اسے خریدنا پڑا۔۔۔ مینا بازار والے دن وہ گھر سے تو صرف سوٹ ہی پہن کر گئی، مگر کالج جا کر خوب اچھی طرح میک اپ کیا، نائن تو یوں بھی میک اپ ایکسپرٹ تھی، منٹوں میں اس کے نقوش کو نکھار کر رکھ دیا، اسے مینا بازار میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اسٹال میں کیا تھا۔۔۔ ورائٹی پروگرام، جھولے اسے تو صرف وقت گزارنا تھا، مینا بازار کی وجہ سے گیٹ کھلا تھا، لڑکیاں آزادی سے آجا رہی تھیں، وہ اور نائن دین آنے سے بیس منٹ قبل ہی باہر نکل آئیں، وہاں لینے کے لیے آنے والوں کا خاصا رش تھا، بظاہر وہ دین کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی، مگر وہاں اتنے لڑکے تھے، جو اپنی اپنی بہنوں کو لینے آئے تھے، ہر آنے والی لڑکی کو دیکھتے بھی تھے، وہ کچھ بھی نہ اخذ کر پائی، مگر اسے لگتا تھا یونہی کھڑے کھڑے بے چینی سی لاحق ہوئی، اسے لگتا تھا وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے، کوئی ہے جو اسے مسلسل دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں اس کے ماتھے پر پسینہ سا آگیا۔

وہ پزل سی ہونے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہو۔" چیونگم چباتی نائن نے اسے بے حد حیرت سے دیکھا۔

"گرمی لگ رہی ہے۔" اس نے بیگ سے رومال نکالنا چاہا، تب ہی اس میں موجود موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی۔

اک نیا SMS اس کا منتظر تھا۔

"تم جس رنگ کا کپڑا پہنو وہ موسم کا رنگ۔"

وہ یہیں تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ مومو کو نجانے کیا ہوا؟ یکدم مڑ کر کالج کے اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

چاروں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیے۔

"کیسا؟" اس نے فخریہ انداز میں باقی تینوں کو دیکھا۔

"زبردست۔"

"یہ کوئی بڑی کامیابی نہیں۔" ایک نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟" اسے غصہ سا آگیا۔

"مزا تو جب ہے، جو یہاں بائیک پر تمہارے ساتھ بیٹھے۔"

"یار! شریف گھر کی لگتی ہے، پتا نہیں تجھ جیسے کھامڑ کی باتوں میں کیسے آگئی۔"

"جس پر ہماری نظر کرم ہو، وہ ہمارے پیچھے نہ آئے۔" وہ فخریہ انداز میں بولا۔ "دیکھنا ایک دن یہاں بھی آئے گی۔" اس نے بائیک پر ہاتھ مارا۔

"صرف اس سے کیا ہوگا۔ مزا تو تب آئے جب وہ۔۔۔" ایک نے انتہائی بے ہودہ بات کی۔۔۔ اتنی کہ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، شاید اس انتہا پر جا کر کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔

"بکواس مت کر۔۔۔ ہمارا مقصد صرف انجوائے منٹ ہے۔" ان میں سے ایک نے قدرے سنبھل کر کہا۔

"میں بھی انجوائے منٹ کی بات کر رہا ہوں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"لیو دس ٹاپک۔" ایک نے بے زار ہو کر کہا۔

"آج تو پریاں زمین پر اتر آئی ہیں۔"

سب گزرتی لڑکیوں پر تبصرہ کرنے لگے۔ مگر وہ خاموش تھا، اس کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا، نگاہ میں گلابی پیراہن سرسرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سمجھوتے کی راہ گزر پر قدم رکھے تو زندگی سہل سی ہوگئی۔۔۔ ایمن نے بہت کچھ فراموش کر کے خود کو مصروف کرلیا۔۔۔ اگرچہ کرنے کے لیے بہت کچھ نہ تھا، پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی، گھر اور گھر کے معاملات، آس پڑوس میں ملاقات۔۔۔ اسے احساس ہونے لگا، ہر کوئی کہیں نہ کہیں اپنی خواہشوں کو پس پشت ڈال کر سمجھوتے سے کام لیتا ہے، تب ہی سکھ کی زندگی مقدر ہوتی ہے، لوگ اس سے پیار سے ملتے، عزت سے پیش آتے اور وہ سوچتی۔

"یہ سب ایمن کی نہیں، ایمن طارق کی عزت کرتے ہیں۔" وہ شخص اس کا نام، اس کا حوالہ ایمن کو معتبر کر گیا تھا۔

خود طارق بھاگ بھاگ کر پاکستان آتا۔۔۔ آتا تو جانے کا نام نہ لیتا، چلا جاتا تو واپس آنے کے لیے بے تاب رہتا۔

"تم پڑھائی دوبارہ شروع کردو۔" جوجو نے کئی بار مشورہ دیا۔

"چھوڑو یار۔ اب پڑھا نہیں جائے گا۔" وہ ہمیشہ آلکسی سے جواب دیتی۔

وقت کا کام گزرنا تھا، سو گزرتا چلا گیا۔

یہ اس کی شادی شدہ زندگی کے تیسرے سال کا آغاز تھا۔

جب وقار الحسن اس کے گھر آئے۔

ایمن کو خبر بھی نہ تھی کہ وقار الحسن پاکستان آئے ہیں یا آنے والے ہیں۔

وہ تومالی کے ساتھ مل کر بہار کی آمد سے قبل نئے پھولوں کی نیری لگوا رہی تھی۔۔۔ چوکیدار بیگم صاحبہ کے والد کو روک تو نہ سکتا تھا، سو وہ آرام سے اندر آگئے، اب وہ غور سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے، وہ بیٹی! جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔۔۔ اور کتنا عرصہ ہوا وہ اس سے تمام رابطے توڑے ہوئے تھے، اور وہ بھی تو آخر ان ہی کی بیٹی تھی، مجال ہے جو ایک بار بھی ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو۔

اب وہ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

لمبے بال، چوٹی میں گندھے، ہاتھ پاؤں مٹی میں اٹے، وہ کس انہماک سے کیاری میں کھاد ملا رہی تھی، اور مالی ہاتھ روکے وقار الحسن کو دیکھ رہا تھا۔

"بیج بونے کے کتنے عرصے بعد پھول آجائیں گے؟"

اس نے ہاتھ کی پشت سے سامنے آجانے والے بال پیچھے کرتے ہوئے سوال کیا۔

"نئے بیج بوؤ گی تو نئے پودے سر اٹھائیں گے، تو ان پر پھول بھی مہکیں گے۔۔۔ ہمارا کام بیج بونا ہے، باقی کام قدرت کا ہے۔۔۔ یہی زندگی کا چلن ہے۔"

ایمن نے جھٹکے سے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، پھر تیزی سے کھڑی ہوگئی۔

"ڈیڈی۔" اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔ وہ لاکھ کہتی رہے کہ اسے وقار الحسن سے نفرت ہوگئی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس کی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا کر گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ ان سے لپٹ کر دھواں دھار رو رہی تھی۔ خود ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"تم نے میرے سارے کپڑے خراب کر دیے۔" بہت دیر کے بعد انہوں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ واقعی ان کے کپڑوں پر مٹی لگ گئی تھی۔

"اوہ۔ سوری۔" اس نے جلدی جلدی مٹی جھاڑنے کی کوشش میں ان کی شرٹ اور بھر دی۔

"تم اب بھی بڑی نہیں ہوئیں۔" وقار الحسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

"آئیں اندر چلیں۔"

اس نے جوتے لان میں ہی چھوڑ دیے۔

"آپ کیا پئیں گے۔" انہیں لاؤنج میں بٹھا کر اس نے پوچھا۔

"پہلے اپنا حلیہ درست کرو۔ اور میرا بھی۔"

تب ہی صغریٰ چلی آئی۔

"صغریٰ! پہلے الماری سے طارق کا کوئی کرتا نکال کر دو۔ پھر یہ شرٹ دھو کر سکھا دو۔" وہ خود بھی جلدی جلدی کپڑے بدل کر فریش ہو کر آئی۔ تو وقار الحسن پینٹ پر طارق کا کرتا پہنے 'جو انہیں قدرے تنگ تھا۔ سگریٹ سلگا رہے تھے۔

ایمن نے دیکھا' وہ آج بھی اتنے ہی گریس فل اور پیارے تھے۔

صغریٰ ان کے سامنے جوس کا گلاس رکھ گئی۔

"میں چائے کے لیے....."

"نہیں اور کچھ نہیں۔ تم میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے رسانیت سے منع کرتے ہوئے کہا تو ایمن کشن صوفے کے پاس گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے سلگایا ہوا سگریٹ بنا کش لیے ایش ٹرے میں مسل دیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔

"آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

"خوش ہو؟" ان کا انداز ہنوز سرسری تھا مگر وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

ایمن متذبذب سی چپ ہو رہی' اب جب بھی کوئی یہ سوال کرتا' وہ یونہی خاموش ہو جاتی' گویا سمجھ نہ پا رہی ہو کہ کیا جواب دے۔ وقار الحسن نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔

"تمہیں اب بھی یہی لگتا ہے کہ میں نے تمہارے لیے غلط فیصلہ کیا ہے؟"

"میں سب بھول جانا چاہتی ہوں۔" ایمن نے ایک نظر باپ کو دیکھ کر چہرہ جھکا لیا۔

"اچھی بات ہے۔"

کچھ لمحے فضا میں خاموشی سی چھائی رہی۔ وہ خاموشی سے لاؤنج کا اور گلاس وال کے دوسری طرف نظر آتے لان کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر ستائشی انداز میں بولے۔

"تم نے گھر بہت اچھے طریقے سے سجا رکھا ہے؟"

"میرے پاس کرنے کے لیے یہی ایک کام ہے۔" وہ بلاوجہ ہنسی۔

"مجھے طارق نے بتایا تھا۔" انہوں نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

"کیا؟"

"یہی کہ تم خیال رکھتی ہو گھر کا بھی اور... اس کا بھی۔"

"اچھا۔" وہ قالین پر بنے ڈیزائن پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"اپنا بھی رکھا کرو۔"

"اب ایک وقت میں بندہ کیا کیا کرے؟" ایمن مسکرائی۔

"میری بہت خواہش تھی۔" انہوں نے جوس کا ہلکا سا گھونٹ لیا۔ "اپنی زندگی میں تمہیں یوں اپنے گھر میں رچا بسا دیکھ سکوں۔ آج میری بے سکونی کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے ہر نماز کے بعد صرف تمہارے لیے دعا کی تھی۔"

"میں نے آپ کو بہت تنگ کیا۔"

"میں سب بھول چکا ہوں۔" انہوں نے برجستہ کہا۔ "اسی دن' جس دن میں نے طارق کی آنکھوں میں تمہارے ذکر پر سچی خوشی اور آسودگی چھلکتی دیکھی۔ مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔ اس کا اب وہاں دل نہیں لگتا' کام پر بھی توجہ نہیں دیتا۔ پاکستان آنے کے لیے بے چین رہتا ہے' کل میں نے اسے بہت ڈانٹا۔ کہ اگر کماؤ گے نہیں تو میری بیٹی کو کھلاؤ گے کہاں سے؟"

"آپ اسی لیے مجھ سے ملنے آئے ہیں' ورنہ ہمیشہ یونہی چلے جاتے تھے۔" ایمن نے شکوہ کیا۔

"میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا' تاکہ تم خود جائزہ لو' نتیجہ نکالو اور اس کے مطابق اپنا مستقبل پلان کرو۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے غلطیوں سے سیکھنا شروع کر دیا ہے۔"

"ڈیڈی! کیا ہم صرف اسی موضوع پر بات کریں گے؟"

"نہیں! ہم آئندہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کریں گے۔" انہوں نے خوشگواریت سے کہا۔ وہ اس کے پاس کافی دیر تک بیٹھے اور ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ چائے پی مگر کھانے کے لیے منع کر دیا۔

"چلو میرے ساتھ کچھ دن وہاں چل کر رہو۔"

"آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟"

"ایک ہفتہ ہے۔"

"گھر اکیلا کیسے چھوڑ جاؤں۔" ایمن نے عذر پیش کیا۔

"لڑکیاں میکے جا کر نہیں رہتیں۔"

"وہ اور بات ہے' یوں سارا گھر نوکروں کے سپرد نہیں کر سکتی۔ آپ ملنے آجایا کریں۔" وقار الحسن کو خوشی ہوئی۔ وہ اب مثبت انداز میں سوچنے لگی تھی۔

"سو مو اور جوجو سے کہوں گا' کبھی کبھی تمہارے پاس آجایا کریں۔"

"ممی نہیں آنے دیں گی۔" ایمن کا لہجہ مدھم اور چہرہ تاریک سا ہوا۔

"کیوں؟"

ایمن چپ ہو گئی' وقار الحسن نے بھی بات بدل دی۔ لیکن وہ جتنے دن پاکستان میں رہے' متواتر شام کو اس سے ملنے آتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"جیولر سے سیٹ اٹھانے ہیں۔" ان کے جانے میں ایک دن باقی تھا' جب مہرالنساء نے کہا۔
"ایک تو تمہیں ہر بات کی جلدی ہوتی ہے' کہا بھی تھا' کچھ مہینے ٹھہر جاؤ۔" وہ جھنجلا گئے۔
"میں پہلے ہی دے چکی تھی۔" چائے پیتی مہرالنساء نے اطمینان سے کہا۔
"تمہیں جلدی کس بات کی ہے؟"
"بس میں وقت کے وقت لڑکیوں کو رخصت کرنا چاہتی ہوں۔"
"ایمی کا معاملہ اور تھا' ان کو پڑھنے دو۔"
"شادی تو کرنا ہی ہے' آج کیا اور کل کیا۔۔۔؟"
"اچھا۔۔۔ میں جا کر بھجواؤں گا۔" وہ مہرالنساء کی فکر مندی دیکھ کر آمادہ ہوئے۔
"یاد سے۔۔۔"
"کوئی اچھا پرپوزل ہے نظر میں؟"
"ایک دو رشتہ کروانے والیوں کو کہہ تو رکھا ہے۔"
"خیال سے۔۔۔ یہ پیسے ٹھگنے کے لیے اوٹ پٹانگ رشتے بھی دکھا دیتی ہیں۔"
"اب میں ایسی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔" وہ مسکرائیں۔
"موموکا دیکھنا۔۔۔ وہ کچھ خاص پڑھ بھی نہیں رہی' لیکن جوجو کو ڈاکٹر بننا ہے' اس کی ابھی قطعاً کوئی بات نہیں کرنا۔" وقارالحسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔"
"اور بابر۔۔۔ اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔ اس کی منزل بھی زیادہ دور نہیں۔۔۔"
"ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔"
"تمہارے بھائیوں کی بیٹیاں بھی تو ہیں۔"
"نہیں۔" مہرالنساء نے فوراً" کہا۔ پھر قدرے سنبھل کر بولیں۔ "نوکری سے لگ جائے' کچھ کما لے' پھر سوچوں گی۔"
اماں تو کئی بار اشارے کنایوں میں کہہ چکی تھیں کہ بابر کا کرتے وقت بھائیوں کی بیٹیاں ذہن میں رکھنا۔۔۔ مگر بھابھیوں کے ساتھ ماضی کے تلخ تعلقات کے بعد ان کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔
تب ہی موموو قارالحسن کے لیے بھی چائے لے آئی۔
"شام کو سب تیار رہنا۔ ایمن کی طرف جائیں گے۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا تو مومو خوش ہو گئی۔
"جوجو تو کہیں چھ بجے فارغ ہوتی ہے۔ میں اور مومو بھی مصروف ہیں۔" مہرالنساء کو کوئی خاص عذر تو نہ ملا یونہی کہہ دیا۔
"کوئی بات نہیں چھ بجے کے بعد چلے چلیں گے۔ تم دونوں کو جو بھی کام ہے ابھی نمٹا لو۔" انہوں نے تحمل سے جواب دیا۔ مومو جلدی سے واپس مڑ گئی۔ جانتی تھی اب دونوں میں بحث شروع ہو جائے گی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آخری بات تو وقارالحسن کی چلے گی۔
"اسی کو بلا لیں۔ سارے گھر کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" مہرالنساء جھنجلائیں۔
وقارالحسن نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا اور اسی متحمل انداز میں بولے۔
"تم مصروف ہو تو کوئی بات نہیں۔ لڑکیاں میرے ساتھ جا رہی ہیں۔"
وہی ہوا۔ مہرالنساء وہیں کلستی رہیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کے ساتھ ایمن کی طرف چلے گئے۔ جو انہیں دیکھ کر

کھل سی اٹھی تھی۔ جلدی جلدی صغریٰ کو بہت اچھا سا کھانا بنانے کو کہا۔ وقارالحسن ان دونوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مومو کو یہی ڈر تھا کہ کہیں ایمن جوجو کے سامنے کوئی بات نہ کر دے۔ مگر ایمن کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کر مومو بھی مطمئن ہو گئی۔
"ممی نے تم دونوں کو آنے کیسے دیا۔" ایمن نے اسٹرابری کھاتے ہوئے پوچھا۔
"ڈیڈی کے سامنے ان کی چل سکتی ہے۔" مومو ہنس دی۔
"لیکن مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ورنہ ہر شام بہت تنہا اور اداس گزرتی تھی۔"
"پیاری آپی! دل تو چاہتا ہے ہر روز آ جائیں۔ مگر کیا کریں۔ ممی اور مصروفیت دونوں ہی اجازت نہیں دیتیں۔" جوجو نے برجستہ کہا تو سب ایک ساتھ ہنس دیں۔
"آپی! تمہیں یوں دیکھ کر ہم سب بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ بس یونہی اپنی زندگی بنائے رکھنا۔ خدا کی رضا میں راضی ہونے میں ہی عافیت اور سکون ہے۔ وہ ہمارا مقام ہم سے بہتر جانتا ہے۔ کسی شخص کو کس جگہ پر رکھنا ہے۔ اس کا فیصلہ زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتا ہے۔ ہمیں صرف شکر اور صبر سے کام لینا ہے۔"
ایمن نے پہلی بار جوجو کے خلوص بھرے لہجے میں کہے سادہ سے الفاظ پر غور کیا اور مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"تم اپسرا ہو۔ آسمان سے اتری کوئی حور۔۔۔ یا کوہ قاف کی پری۔"
کیا ہو تم۔۔۔؟ میں بہت دیر تک ہل نہ سکا۔ وہاں بہت لڑکیاں تھیں مگر مجھے صرف تم دکھائی دے رہی تھیں۔ تم ہر رنگ میں اتنی ہی خوب صورت لگتی ہو یا یہ گلابی رنگ کی خاصیت تھی۔"
وہ بے خود تھا تو یہ محجوب۔
"مجھے کیا پتا۔۔۔؟"
"تو پھر کسے پتا ہے۔ تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔"
"کیا بات ہے؟ کوئی نشہ وشہ تو نہیں کر رکھا؟" وہ سنبھلنے کی سعی کرنے لگی۔ ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ وہ بولتا رہے اور یہ ساری رات سنتی رہے۔
"تم نے پلا دی ہے۔ تمہارا نشہ ہی عجیب ہے چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سوچتا ہوں دور سے دیکھا ہے تو یہ حال ہے۔ قریب سے دیکھوں تو شاید مر ہی جاؤں۔"
"شٹ اپ۔۔۔" وہ اس کی وارفتگی پر لرز سی گئی۔
"تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کیونکہ تم محبت کی اس سطح پر نہیں پہنچی ہو جہاں میں کھڑا ہوں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں؟ میرا دل چاہتا تھا کہ ساری دنیا کی پروا کیے بغیر تمہارا ہاتھ پکڑ کر موٹر سائیکل پر بٹھاؤں اور کہیں دور وادیوں میں لے جاؤں۔ جہاں کوئی ظالم سماج نہ ہو۔ صرف تم ہو اور میں۔۔۔ جہاں محبت کا ساون برستا ہو۔ پیار کی بولیاں ہوں۔ عشق کے پھول مہکتے ہوں۔ مومل۔ مومل میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھ سے ایک بار مل لو۔"
وہ جو اس کا ہاتھ تھامے بہت دور محبت کی وادیوں میں جا نکلی تھی۔ چونک گئی۔ وہ جس ملتجی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ایک بار تو مومل کا دل چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ مگر دم توڑتی عقل نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کا آنچل تھام لیا۔ وہ متذبذب تھی۔ ہاں کہنا چاہتی تھی۔ مگر نہیں کہہ پا رہی تھی۔
"مومل صرف ایک بار۔ جہاں تم کہو۔ صرف پندرہ منٹ کے لیے۔" وہ اس کی خاموشی سے ہمت پکڑ کر بولا۔
"پلیز! مجھ سے ایسی فرمائش مت کیا کرو۔ میں تمہارے ساتھ پارک یا ہوٹلوں میں نہیں گھوم سکتی۔ میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔ اس میں بھی سو سو دھڑکے لگے رہتے ہیں۔ جس دن پکڑی گئی۔ یہیں گھر کے کسی کمرے میں بند

کردیں گے۔ تم میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ ہم سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مگر بہت سخت ہیں۔" وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا۔؟" وہ کسی سوچ میں ڈوبا۔ "میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن تمہارے کالج کے پیچھے فوٹو اسٹیٹ کی دکان ہے۔ وہاں تو مل سکتی ہو۔ محض دو منٹ کی واک ہے....."

"کسی نے دیکھ لیا تو....."

"وہ میرا دوست ہے۔ دکان کی پچھلی طرف اک چھوٹا سا کیبن ہے۔ سامنے پردہ ہے۔ تم فوٹو اسٹیٹ کروانے کے بہانے آجانا۔ بس پانچ منٹ بیٹھیں گے۔ کوک پئیں گے اور واپسی۔ وہاں تو کسی چھاپے کا ڈر نہیں۔ اور ملنے کے لیے اس چلتے پھرتے اشتہار کو لے کر مت آنا۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی بولڈ اور بے باک لڑکیاں۔ جو اپنی ہر ادا میں دعوت دیتی محسوس ہوں۔"

"کون نائلہ....؟"

"ہاں، لڑکیاں تو تم جیسی اچھی لگتی ہیں۔ چھوئی موئی، ڈھکی چھپی۔ جسے دیکھیں تو مزید دیکھنے کی ہڑک من میں بیدار ہو۔"

موموکا ذہن اس حد تک جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جس حد پر جا کر وہ اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا کہ بہرحال اس نے اپنی زندگی خاصی محدود اور محفوظ گزاری تھی۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔

اس سے پہلے صرف باپ اور بھائی سے واسطہ تھا اور اک غیر مرد کی ڈیمانڈز کیا ہوتی ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ وہ صرف اس کے پیار بھرے لفظوں اور خوب صورت لہجے پر اعتبار کر رہی تھی۔ اس خوب صورتی کے پیچھے چھپی ہوس تک پہنچ ہی نہ سکی۔

موموا سچ تو یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے۔" وہ ایکدم بھڑک اٹھا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" مومو پھنس گئی۔

"ایسی ہی بات ہے....ورنہ اب تم مجھے ٹالتی ناں....کیونکہ تم نے مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔" وہ جذباتی ہونے لگا۔ "مومو! تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ مجھے کیا سمجھتی ہو۔ غنڈہ، بدمعاش۔" اس کے پاس ایک سو ایک حربے تھے اور وہ پہلے پر ہی زیر ہو گئی۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ خود سے بھی بڑھ کر۔"

"تو اس اعتبار کا اظہار کرو۔" وہ منتظر تھا۔

وہ متذبذب۔

ایک تقدیر اٹل ہوتی ہے، جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

مگر ایک تقدیر وہ ہوتی ہے، جس میں انسان اپنی مرضی سے کمی بیشی کر سکتا ہے۔

وقت دم سادھے منتظر تھا کہ وہ اپنی تقدیر میں کیا رقم کرنے جا رہی ہے۔

یہ موسل وقارالحسن کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔

جو اسے تباہی کی طرف لے جا بھی سکتا تھا اور بچا بھی۔

فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔

اور وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

گلابی جاڑے کا اک اداس دن تھا۔ اس اداس دن کے دامن کو خاموش بارش کی پھوار نے بھگو ڈالا۔ بارش، ہوا، نیچے لان، منڈیر، درختوں، مہندی کی باڑوں، ننھے پودوں، خالی کیاریوں کو چھوتی زرد و سبز گھاس میں گم ہو رہی تھی۔

بارش، جو شیشے کی دیوار پر موتیوں کی صورت برس رہی تھی۔

وہ اسی دیوار کے پاس ایزی چیئر پر ٹانگوں کو گلابی کمبل میں چھپائے بہت دیر سے بارش کا خاموش منظر دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

بارش کے ساتھ اس کا رشتہ ہمیشہ ہی بہت عجیب رہا۔ اس نے ہمیشہ ایمن کی جھولی میں وحشت، خوف، تنہائی اور اداسی ہی ڈالی تھی۔ آج بھی بہت سی اداسی اپنے اندر جذب کر کے اس نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔

بند آنکھوں میں بھی وہی منظر تھا۔ مگر اس منظر میں کچھ انجانی آہٹیں بھی تھیں۔ جنہیں وہ پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر اک سبز کونپل پھوٹی ہے۔ جس کی تر و تازہ مہک سے اندر باہر سب تبدیل ہو رہا تھا۔

وہ کسی سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔

مگر کس سے....؟

کچھ سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ جب کسی نے دھیرے سے نرم انگلیوں کے ساتھ اس کی پیشانی کے بال سمیٹے۔ ایمن نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔ طارق کو دیکھ کر اک عجیب سی خوشی من میں جاگی۔ اب وہ ہمیشہ بنا بتائے یونہی اچانک اس کے سامنے آجاتا تھا۔

"ارے۔ آپ تو بارش میں بھیگ گئے ہیں۔"

اس نے ٹانگوں سے کمبل نوچا۔

"کہاں جا رہی ہو....پردیسی سے کوئی سلام دعا۔" طارق نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"سردیوں کی بارش ہے۔ بیمار شمار ہو گئے تو....."

وہ جلدی سے تولیہ لے آئی۔ وہ اس کی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔

"صاف کر دو۔" مزے سے فرمائش کی۔ ایمن عقب میں کھڑی ہو کر تولیے سے اس کے بال خشک کرنے لگی۔ "کپڑے گرما گرم چائے۔" وہ یوں بھاگ بھاگ کر کام کرتی کتنی پیاری لگتی تھی۔

"اس بار تو بہت جلدی چکر لگا لیا۔" جب طارق بالکل فریش ہو گیا۔ تب اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایمن نے کہا۔

"واپس چلا جاؤں؟"

"میں نے یہ کب کہا....؟" ایمن نے خفا سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم نے انتظار کیا....؟"

ایمن نے جواب نہیں دیا۔ صرف سر جھکا کر مسکرا دی۔

"تم وہاں رہنے ہی نہیں دیتیں۔ اس لیے میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ یہاں کاروبار شروع کروں۔ اس بار جلدی اسی لیے آیا ہوں۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہاں....اچھی بات ہے۔"

"ہروقت تمہارے سر پر سوار رہوں گا۔ برداشت کرلوگی۔" وہ اس کی سمت جھکا۔
"کرنا پڑے گا۔" ایمن نے آہ بھر کر جواب دیا۔
"کیا۔؟" وہ یکدم چیخا۔ "کڑیئے تو میری غیرت نوں للکاریا اے۔ ٹھہر جا۔"
وہ اٹھ کر بگٹٹ اندر کی طرف بھاگی۔
اگلے دن اک نکھری ستھری صبح ان کی منتظر تھی۔
ایمن نے اسے صبح صبح ہی جگا دیا۔
"واک کے لیے چلیں؟"
"اتنی سردی میں۔۔ دماغ خراب ہے۔"
"پلیز روز میں اکیلی جاتی ہوں۔"
"آج بھی اکیلی جاؤ۔" طارق نے سر تک کمبل تان لیا۔
"ٹھیک ہے۔" وہ غصے سے اکیلی ہی چلی گئی۔ مگر واپس اکیلی نہ تھی۔ تیمور اور سکندر اس کے ساتھ تھے۔ طارق جاگ چکا تھا۔ مگر بستر پر تھا۔
"اوئے۔۔ یہ بھالو کون ہیں۔۔؟" شوخ اونی لباس میں سر پر ٹوپیاں لیے وہ سچ مچ بھالو لگ رہے تھے۔
"میرے دوست ہیں۔" ایمن نے فخر سے بتایا۔ وہ دونوں اکثر ہی دادا جان کے ساتھ واک کے لیے نکلتے تھے۔
"واہ۔۔ بڑے کڑیل جوان دوست ہیں۔۔" طارق ہنس دیا۔ پھر بچوں کو پاس بلا کر باتیں کرنے لگا۔ ایمن اس کے لیے چائے بنالائی۔ تب تک طارق کی ان کے ساتھ پکی دوستی ہوگئی تھی۔
"میں انہیں چھوڑ کر آتی ہوں۔ چلو بچو! ماما انتظار کررہی ہوں گی۔"
ایمن نے کہا تو دونوں شرافت سے اٹھ گئے۔ ایمن انہیں گھر چھوڑ کر اور فرحت سے ہیلو ہائے کرکے لوٹی تو طارق لان میں تھا۔ وہ بھی اس کے قریب آگئی۔
"ناشتے میں کیا لیں گے؟"
"بہت پیارے بچے تھے۔" اس نے گویا ایمن کی بات سنی ہی نہ تھی۔
"ہاں۔۔ پیارے تو ہیں۔"
"امی! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں۔" طارق نے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا۔
"لگتے ہیں۔ اسی لیے تو دوستی کی ہے۔" وہ اس کی کیفیت سے بے خبر لاپرواسے انداز میں بولی۔ طارق گھوم کر اس کے سامنے آیا۔
"تمہیں نہیں لگتا۔ ہماری زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔"
ایمن اسی پل بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔
"ہوں۔"
"تمہیں اولاد کی خواہش نہیں ہوتی؟"
"اب ہوتی ہے۔" ایمن نے سر جھکا کر ایمان داری سے کہا۔ تو طارق نے طمانیت کے احساس کے ساتھ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔
"تب مجھے یقین ہے خدا بہت جلد ہم پر مہربان ہوگا۔"
ایمن نے دھیرے سے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"اور مجھے لگتا ہے کہ خدا ہم پر مہربان ہوچکا ہے۔"

طارق حیرت، بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بہت دیر تک کچھ بھی نہ بول سکا۔

☼ ☼ ☼

بات ہی ایسی تھی کہ سب ہی خوشی سے نہال تھے۔ خود وہ بھی جس نے پہلی بار اس خوشی کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹا تھا۔ اکثر رات میں نرم تکیے کو بازوؤں میں بھینچ کر سوچتی۔ وہ ننھا سا کیسا ہوگا۔ جو اس کے وجود کی تکمیل کرے گا۔ اس خوشخبری نے طارق کے واپسی کے فیصلے پر مہر لگادی تھی۔
"بس اب بہت جلد واپس آؤں گا۔ یہاں پر محنت کروں گا۔ اپنے بچے کو زندگی میں وہ سب کچھ دوں گا۔ جس کے لیے میں ترسا۔ اسے بہت سا پڑھاؤں گا۔"
اس کے پاس اپنے بچے کے لیے بہت سے پلانز تھے۔ وہ مسکراہٹ دباتی سنتی رہی۔ گاؤں سے چاچا چاچی نے بہت سی سوغاتیں بھیجیں۔ اسے سب سے زیادہ وقار الحسن سے شرم آتی۔ جنہوں نے اپنے طویل فون میں اسے ان ڈائریکٹلی اپنی صحت کا بہت سا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس نے اگر کسی کو نہیں بتایا تھا تو وہ صغریٰ تھی۔ جس کی جہاندیدہ نگاہیں یہ بات بہت پہلے سے بھانپ گئی تھیں۔
زندگی میں اک خوشگوار تبدیلی عود کر آئی تھی۔
وہ ہفتے کا دن تھا۔
طارق دو دن قبل واپس جاچکا تھا۔ اسے ایک دو چھوٹی موٹی ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ قریبی مارکیٹ دو سڑکیں چھوڑ کر ہی تھی۔ وہ اکیلی واک کرتی وہاں تک چلی آئی۔ مطلوبہ اسٹور کے سامنے رک کر اس نے پرس میں روپے چیک کیے کہ آنے سے قبل وہ پرس میں روپے رکھنا بھول گئی تھی۔ مگر اتنے روپے ابھی موجود تھے کہ وہ اپنی مطلوبہ اشیاء خرید سکے۔ وہ مطمئن سی ہو کر اندر چلی آئی۔ اسی عرصے میں سڑک کے دوسری طرف آئس کریم پارلر سے باہر نکلتا شخص ٹھٹک کر رکا۔ اس کی نگاہیں اسٹور کے اندر جاتی ایمن پر جم گئی تھیں۔
کچھ لمحے متذبذب سا اسٹور کے گلاس ڈور کے دوسری طرف نظر آتی ایمن کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قدم فیصلہ کن انداز میں اٹھے۔ تیزی سے خالی سڑک کو پار کرکے وہ اسٹور میں داخل ہوا ایمن اپنی اشیاء نکلوا رہی تھی۔ وہ اک بڑے سے ریک کے پیچھے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ایمن نیل پالش کے شیڈ چیک کررہی تھی۔ اس نے سبز دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور وہ اس کی آڑ سے اس کا آدھا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ لبوں کا کٹاؤ، وہی خمار پلکیں۔
وہ اک طویل سانس بھر کر رہ گیا۔
ایمن نے اشیاء والا شاپر اٹھایا۔ پے منٹ کی اور پرس سنبھالتی واپس پلٹی۔ اسے اس ریک کے پاس سے گزرنا تھا۔ وہ سیدھا ہوگیا۔ ایمن اپنے آپ میں گم پاس سے گزری تو اس نے آہستگی سے بازو تھام لیا۔
ایمن اچھل پڑی۔ دوسرے پل اس کے ہاتھ سے شاپر اور پرس نیچے جا پڑا۔ وہ ٹکر ٹکر اپنا بازو پکڑنے والے کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
اس نے آہستگی سے بازو چھوڑا۔ نیچے گری اس کی چیزیں اکٹھی کیں، پھر سیدھے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایمن ان تمام لمحوں میں نہ پلکیں جھپک سکی، نہ منہ سے کچھ بول سکی۔
"آؤ۔"
وہ اک معمول کی طرح اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

باقی آئندہ شمارے میں

راشدہ رفعت

موسم بہار کے اولین دن تھے اور ایک مدت بعد ایسی فراغت بھری بہار میسر آئی تھی۔ چوبیس سال تک بغرض تعلیم اسکول' کالجوں اور یونیورسٹیوں کی خاک چھاننے کے بعد آخر کار' آخری مادر علمی سے معقول سی ڈگری حاصل کرکے ہم نے ان سے اور انہوں نے ہم سے جان چھڑائی تھی' اور اب ہمارے لیے راوی' ستلج' چناب غرض ہر کوئی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخانے کا سلسلہ ہنوز شروع نہیں ہوا تھا کہ سیفی کہتے تھے' ابھی ہم کچھ عرصہ آرام کرکے بیتے برسوں کی تھکن اتاریں گے' سیفی کو تھکن اتارنے کا بہت شوق تھا حالانکہ وہ ہر کام بہت آرام سے کرنے کے عادی تھے پھر بھی جانے کیوں تھکن ان پر حاوی آجاتی تھی۔

سولہ جماعتیں پاس کرنے میں انہوں نے انیس برس لگا دیے تھے۔ ہر چار سال بعد وہ اتنا تھک جاتے کہ اگلی جماعت میں جانے کی ہمت نہ رہتی' مجبوراً" ممتحن ترس کھا کر انہیں اسی جماعت میں رکھ لیتا۔ یوں وہ تعلیمی سفر جو سیفی نے ہم سے تین برس پہلے شروع کیا تھا' وہ ہمارے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوا۔

اپنے متعلق کچھ بتانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کا سیفی سے تعارف کروایا جائے۔ جب میں نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تو سیفی اس دن دنیا میں اپنے پہلے قدم کی چوتھی سالگرہ منا رہے تھے۔ سیفی اپنی سالگرہ بہت دھوم دھڑکے سے منانے کے عادی تھے۔ میرے والد محترم جو سیفی کے چھوٹے چچا کے رتبے پر فائز تھے' سیفی سے پہلے ہی وعدہ کر چکے تھے کہ اس سالگرہ پر وہ انہیں بہت پیارا سا تحفہ لا کر دیں گے۔ اس تحفے کو لانے کی غرض سے والدہ محترمہ کو تین دن ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ سیفی کی سالگرہ والے روز شام کو والد اور والدہ کے ساتھ کمبل میں لپٹا ہوا میرا وجود گھر میں داخل ہوا تو سیفی سالگرہ کا کیک کاٹ کر وہ' ادھر' اغبارے پھوڑ رہے تھے۔ داوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر سیفی کو اپنے پاس کھینچا۔

"دیکھ تو سعیان! تیرے چچا تیرے لیے اصلی گڈا لے آئے ہیں۔" انہوں نے سیفی کے اندر اشتیاق جگانے کی کوشش کی۔ سیفی نے ذرا سا اچک کر مجھے دیکھا پھر کچھ برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"میرا خیال تھا' چچی جان اس دفعہ اسپتال سے واپسی پر گڑیا لائیں گی۔" انہوں نے اپنے خیال کو دل میں رکھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ سب لوگوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سب لوگ اس ٹھنڈی آہ کے بھرنے میں حق بجانب بھی تھے کہ امی' ابا ہسپتال سے واپسی پر مسلسل تیسری بار گڈا اٹھا لائے تھے۔ میں اپنے گھر کا تیسرا اور خاندان کا ساتواں گڈا میرا مطلب ہے لڑکا تھا۔

غصہ مجھے ٹھنڈی آہ بھرنے پر نہیں آیا بلکہ سیفی کے احساس دلانے پر آیا تھا۔ وہ یہ طعنہ دیتے اس وقت اچھے لگتے جب خود ایک لڑکی ہوتے۔

خیر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیفی سے ہمارے سفارتی تعلقات بہتر ہوتے گئے حالانکہ اصولاً

نہیں مجھ سے بڑے عاصم یا باسط سے دوستی کرنی چاہیے تھی۔ مگر ان کی عیار آنکھوں نے بھانپ لیا کہ مجھ سا بہترین دوست انہیں کوئی اور نہیں ملے گا۔ سو عمروں کے تفاوت کو نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنی دوستی سے سرفراز کردیا اور میں جو گھر کا مسلسل ساتواں لڑکا ہونے کی وجہ سے کسی کا بھی زیادہ لاڈلا نہیں بن پایا تھا۔ ان کی دوستی پاکر پھولے نہ سمایا۔ وہ اگرچہ پڑھائی میں مجھ سے تین برس آگے تھے مگر ان کے حصے سے زیادہ ہوم ورک کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں نے اٹھا رکھی تھی۔ اکثر تو وہ اسکول میں بریک کے دوران ہی اپنی کاپیاں اٹھا کر میری کلاس میں آجاتے۔

"گھر جاکر تو تم اپنا ہوم ورک کرو گے۔ میرے کام کے لیے فالتو میں رات کو جاگنا پڑے گا۔ یہ بات مجھے ہرگز اچھی نہیں لگے گی، تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ میرا سوشل اسٹڈی کا کام ابھی کردو۔"

وہ اتنی اپنائیت سے کہتے کہ میں جھٹ سر ہلا دیتا اور میں سوشل اسٹڈی کی کاپی پر لائنیں گھسیٹنے لگتا، اتنے میں سیفی میرے بیگ کی تلاشی لے کر لنچ باکس برآمد کرکے اس میں موجود چکن سینڈوچ سے انصاف شروع کردیتے۔

"یہ لو اپنا چکن سینڈوچ، چچی نے اتنا بڑا سینڈوچ بنا کر دے دیا تھا۔ تم سے تو کھایا بھی نہ جاتا پھر واپس بچا کر لے جاتے تو چچی سے ڈانٹ الگ پڑتی۔ میں نے آدھا کھالیا ہے اب باقی آدھا تم کھالو۔"

ان کے کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ مجھے احسان ماننے بنا چارہ نہ ہوتا تھا۔ مگر سیفی کی چالاکیاں زیادہ عرصے میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکیں۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ میں کمبل سے جان چھڑوانا چاہتا تھا مگر کمبل میری جان چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں جس کسی کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتا درمیان میں سیفی اپنی ٹانگ اڑا دیتے۔ اپنی طوطے جیسی ناک اور انتہائی عیار آنکھوں کے باوجود وہ اپنی ظاہری شخصیت میں کچھ ایسی کشش رکھتے تھے کہ ہر بندہ ان سے متاثر اور مرعوب ہوجاتا۔

یقیناً میرا ہر دوست کچھ عرصے بعد ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہوجاتا۔ جب ان کا حلقۂ احباب ضرورت سے زیادہ وسیع ہوگیا تو میں نے نئے دوست بنانا ترک کردیے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ان کے دوستوں کی خاطر مدارت کا بوجھ میری ہی ناتواں جیب پر پڑتا تھا۔

خیر یونہی وقت گزرتا گیا۔ لیکن اب جب ہم فراغت کے مزے لوٹ رہے تھے تو کچھ مزے لوٹنے کے بعد ہی یوں لگا جیسے وقت ٹھہر گیا ہے۔ دل و دماغ پر عجیب سی بوریت طاری ہونے لگی پھر ایک صبح سیفی تمتماتے چہرے کے ساتھ آن موجود ہوئے۔

"ہم کئی دنوں سے بوریت، بوریت کا راگ الاپ رہے تھے نا، میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے کیوں نہ ہم کچھ دنوں کے لیے نواب بہادر علی خان کی جاگیر پر جاکر وقت گزاریں۔" انہوں نے پرجوش انداز میں اپنا آئیڈیا پیش کیا۔

"کون نواب بہادر علی خان؟ کیسی جاگیر اور ہم کیوں جانے لگے وہاں؟" ہم نے ان کے جوش و خروش کو نظر انداز کرتے ہوئے اچنبھے سے دریافت کیا۔

"ارے تمہیں یاد نہیں؟ وہ دادا جان کے بھائی کے بیٹے کے صاحب زادے ہیں دادا جان اپنی زندگی میں ان لوگوں کا کتنا تو ذکر کرتے تھے۔" سیفی نے ہمیں یاد دلانا چاہا۔

"اوہ" آپ رشتوں کو چیونگم کی طرح کھینچ کیوں لیتے ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ دادا جان کے بھائی کے پوتے ہیں۔" ہم نے اکتاہٹ سے ان کی بات کاٹی۔

"اچھا بابا! تم جو مرضی کہہ لو، بس یہ بتاؤ کہ شام کی گاڑی سے ہمارے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے انکار کیا۔

"چلو ٹھیک ہے، پھر جلدی سے بیگ وغیرہ تیار کرلو، وہ پہاڑی علاقہ ہے موسم قدرے ٹھنڈا ہوگا، دو سوئیٹر ضرور رکھ لینا۔"

"دوسرا کس لیے؟" میں نے اچنبھے سے ان کی بات کاٹی۔

"لہٰذا اس کا مطلب ہے تم جا رہے ہو۔" وہ دانت نکوستے ہوئے بولے۔ میں بھنا کر رہ گیا۔

"جی نہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جارہے۔" اس بار میں نے چڑ کر دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

سچ تو یہ تھا کہ سیفی کی زبردستی اور دھونس اب ہمیں قطعی بھلی نہ لگتی تھی۔ سیفی ہمارے کورے جواب پر منہ لٹکا کر چلے گئے۔ لیکن شام کو جب ہم ٹینس کھیل کر کلب سے واپس گھر لوٹے تو ہماری الماری کسی نے بری طرح پھرولی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سیفی ہمارے بہترین سوٹ سمیت ٹائیوں کے ہمارے ہی بیگ میں ڈال کر اسٹیشن روانہ ہوچکے ہیں۔

وہ ہمیشہ یوں ہی کرتے تھے۔ ہمارے خریدے گئے سامان کو بہت مزے سے برت کر اپنی ٹور بناتے تھے۔ غصہ تو ہمیں بہت آیا لیکن پھر خس کم جہاں پاک کہتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔ سیفی کی زبردستی کی سنگت سے چند روز الگ گزارنے کا خیال ہی بہت سکون افزا تھا۔ ورنہ وہ ہمارے ہر معاملے میں دخیل ہونا اپنا حق سمجھتے تھے لیکن پھر غیر محسوس طریقے سے ہم سیفی کو یاد کرنے لگے سچ تو یہ تھا کہ ہم ان کے اتنے عادی ہوچکے تھے کہ اب ان کے بنا وقت گزارنا مشکل کام لگنے لگا تھا اور پھر جس سکون کی خاطر ہم نے گھر پہ رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتفاقیہ آنے والے مہمانوں کی آمد کے بعد وہ سکون بھی رخصت ہوگیا۔ ہم بنیادی طور پر گوشہ نشین قسم کے شخص واقع ہوئے تھے۔ مہمانوں اور مہمان داری وغیرہ کے سلسلے میں ہماری جان جاتی تھی۔ اب ہمیں سیفی کے ساتھ نہ جانے کے اپنے فیصلے پر افسوس ہورہا تھا۔ سیفی نے وہاں جاکر خیریت سے پہنچنے کا صرف ایک فون کیا تھا اس کے بعد چپ سادھ لی تھی۔ آخر ہم سے رہا نہیں گیا۔ چوتھے دن ہم نے انہیں خود ہی فون ملایا تھا۔ فطری تجسس تھا کہ آخر سیفی نواب صاحب کی جاگیر پر کیسے وقت گزار رہے ہیں۔ سیفی نے میری آواز سن کر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"تم اچھے رہے جو یہاں نہیں آئے۔ میں تو یہاں آکر بری طرح پھنس گیا ہوں۔"

"کیوں کیا نواب چچا کی جاگیر پسند نہیں آئی؟" ہم نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کیسی جاگیر کہاں کی جاگیر، نواب چچا کی جاگیر محض ان کی ایک بیگم، دو بچوں، تین ہرنوں اور چار کتوں پر مشتمل ہے اور ایک بیگم کو چھوڑ کر باقی ساری جاگیر کا انتظام ہمارے ناتواں کندھوں نے سنبھال رکھا ہے۔" انہوں نے دکھڑا رویا تھا۔

"کیا مطلب آخر نواب چچا کہاں گئے؟" ہمیں سیفی کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"نواب چچا اپنی بیگم کے پیچھے پیچھے گئے ہیں۔" انہوں نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری۔

"اور بیگم کہاں گئیں؟" ہم نے مزید حیرت سے اگلا سوال کیا۔

"اب ہم تمہیں کیا بتائیں، نواب چچا نے ادھیڑ عمری میں جاکر بیاہ رچایا۔ بیگم ماشاء اللہ جوان ہیں۔ دونوں کی عمروں میں تو کافی فرق ہے۔ مزاجوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ ناراض ہوکر میکے کا رخ کرلیتی ہیں۔ بے چارے نواب چچا انہیں منانے کے

لیے پیچھے پیچھے دوڑے جاتے ہیں۔ جس دن ہم یہاں پہنچے بس اسی صبح بیگم صاحبہ روٹھ کر میکے چلی گئیں۔ دوپہر کو نواب صاحب بچوں سمیت ساری ذمہ داری ہمیں سونپ کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ ادھر ان کا روٹھنا منانا ہی ختم نہیں ہو رہا اور یہاں ہم گھربار سنبھالنے میں بری طرح ہلکان ہو رہے ہیں۔ اول درجے کے شرارتی بچے ہیں نواب چچا کے۔ ہمیں تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیا ہے اور رات تو پھر بھی سکون سے گزر لی ہے لیکن دن۔ خدا کی پناہ' سارا دن اختر شماری کی نذر ہو جاتا ہے۔"

سیفی نے کہا تو ہمیں بے اختیار ان پر ترس آ گیا۔ ان کی اردو اتنی کمزور تو نہ تھی لیکن بے چارے وہاں جا کر چکرا کر رہ گئے ہیں۔ ہم نے ان کی تصحیح کرنا چاہی کہ اختر شماری رات کو ممکن ہوتی ہے لیکن اگلے ہی پل انہوں نے جملہ مکمل کر کے ہماری غلط فہمی دور کر دی۔

"صبح سات بجے اختر نامی گوالا دودھ دینے آتا ہے' پونے آٹھ بجے ایک اور اختر کوڑے کا ڈرم لینے کے لیے دروازہ بجاتا ہے۔ اخبار دینے والا اختر ٹھیک سوا آٹھ بجے آتا ہے۔ اس کے بعد آخری اختر کا انتظار شام تک کے لیے موقوف ہو جاتا ہے۔ آخری اختر شام پانچ بجے منّے کی پیانو کی کلاس لینے آتا ہے۔" انہوں نے صورت حال کی وضاحت کی تھی۔

"تو آپ بھاڑ میں ڈالیے ساری مروّت اور لحاظ' نواب صاحب کو فون پر بتا دیجیے کہ وہ گھر آئیں نہ آئیں آپ پہلی گاڑی سے گھر واپس جا رہے ہیں۔" سیفی کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا۔

"نہیں' خیر اب اتنا بھی بے مروّت نہیں ہوں' کچھ دن اور انتظار کر لیتا ہوں۔ نواب چچا کی بھی مجبوری ہے اب انہیں اپنی سالی صاحبہ کی نسبت طے ہونے تک وہیں رکنا ہے۔ بس جیسے ہی وہ لوٹتے ہیں میں بھی واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لوں گا۔"

سیفی نے کہا تو ہم چپ ہو گئے۔ ہم سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان سے بڑھ کر بے مروّت اور طوطا چشم کون تھا۔ خیر وہاں کی آب و ہوا نے اگر ان میں تھوڑی سی مروت اور جذبہ احساس بیدار کر ہی دیا تھا تو ہم کون ہوتے تھے انہیں کسی قسم کی خود غرضی کا مشورہ دینے والے سو نیک تمناؤں کا اظہار کر کے رابطہ منقطع کر دیا لیکن چشم تصور سے سیفی کی حالت کا مشاہدہ کیا تو ان پر بے پناہ ترس آیا۔ بے چارے اپنی بوریت دور کرنے گئے تھے اور وہاں جا کر پھنس کر رہ گئے تھے آج تک سیفی کی ہر مشکل میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا پڑا تھا اور یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اب انہیں وہاں کے حالات سے اکیلے نبرد آزما ہوتا سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور اگلی صبح کی ٹرین میں بیٹھ کر ہم بھی نواب چچا کی جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ شام ڈھلے ہم وہاں پہنچے تھے۔

"ارے تم یوں اچانک؟" سیفی ہمیں دیکھ کر ایسے گڑبڑائے کہ ہمیں کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔

"لگتا ہے' آپ ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔" ہم نے انہیں ٹٹولنا چاہا۔

"ارے نہیں کیسی باتیں کرتے ہو' تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہیں یوں اچانک دیکھ کر ہمیں کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ اکیلے رہتے رہتے ہم بری طرح اکتا گئے تھے۔"

انہوں نے لہجے میں گرمجوشی پیدا کرنا چاہی۔ یہ اور بات کہ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے لہجے سے مطابقت نہ رکھتے تھے لیکن ہم اتنا تھک چکے تھے کہ ان کے لہجے اور تاثرات پر غور کرنے کے بجائے آرام کرنے کو ترجیح دی اور لمبی تان کر جو سوئے تو صبح تڑکے ہی آنکھ کھلی' نواب صاحب کے دونوں صاحب زادے جنہیں سیفی نے ننھے شیطانوں کا نام دے رکھا تھا ہم سے بڑی تمیز سے ملے اور ہمیں تو دونوں بچے بہت معصوم اور پیارے لگے۔

ناشتے کا مینیو زبردست تھا اور ناشتے کے بعد دونوں بچے ہمیں علاقے کی سیر کروانے لے گئے۔ آس پاس کا علاقہ قدرتی حسن کا شاہکار تھا۔ طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ اب ہمیں سیفی کے اس بیان میں رتی برابر بھی صداقت نظر نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہاں بور ہو رہے ہیں۔ وہ یہاں خوب مزے میں تھے لیکن انہیں ہم سے غلط بیانی کی ضرورت پیش کیوں آئی' یہ عقدہ شام کو کھلا۔ آج سارا دن اختر شماری کی ذمّہ داری سیفی نے ہمارے سپرد کر رکھی تھی۔ آخری اختر منّے کو پیانو سکھانے ٹھیک پانچ بجے آ گئے تھے' منّے کو ان کے سپرد کر کے ہم باہر نکلے تو یونہی ٹہلتے ٹہلتے باغیچے میں چلے گئے۔ سیفی وہاں پر پہلے سے ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر گڑبڑا گئے۔

"کتنے مچھر ہیں یہاں۔ چلو اندر ہی چلتے ہیں۔" انہوں نے نادیدہ مچھروں کو ہاتھ سے بھگاتے ہوئے کہا۔ اور اتنے میں ہی نواب صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ایک دوشیزہ کی انگلی پکڑ کر خراماں خراماں تشریف لے آئے۔ سیفی اور دوشیزہ میں آداب و تسلیمات کا تبادلہ ہوا۔

"آپ لوگوں کا آج کیا پروگرام ہے؟ پہلے آپ لوگ باتیں کریں گے اور بعد میں مس مجھے پڑھائیں گی یا پہلے مس مجھے پڑھائیں گی اور بعد میں آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کریں گے؟"

گپلو سے ببلو نے بڑی متانت سے دریافت کیا۔ سیفی گڑبڑا کر رہ گئے۔

"شریر کہیں کا' پڑھائی سے جان چھڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ جاؤ جا کر کتابیں لے آؤ۔" سیفی نے ہولے سے ان کا کان مروڑا تھا۔ وہ سیفی پر ایک تیکھی ناراض نگاہ ڈال کر اندر کتابیں لینے چلا گیا اور تب سیفی کو ہمارے تعارف کا خیال آیا۔

"یہ ببلو کی ٹیچر مس صوفیہ ہیں۔ اسے میتھس پڑھاتی ہیں۔" مس صوفیہ نے ایک مختصر سی مسکراہٹ میری جانب اچھالی تھی۔

"اور مس صوفیہ! یہ آفاق ہیں' ہمارے چچا زاد بھائی۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

مس صوفیہ نے رسمی جملہ بولا جو اکثر ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ ہم بھی خندہ پیشانی سے مسکرا دیے۔ البتہ دل ہی دل میں سیفی پر خوب تاؤ آ رہا تھا۔ کیا خوب صورت مصروفیت ڈھونڈ رکھی تھی سیفی نے نواب صاحب کے گھر میں' اور گھنے اتنے کہ منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی تھی۔

"یہ ببلو کہاں رہ گیا۔ ذرا دیکھنا جا کر۔" سیفی نے تعارف کے مرحلے تک تو ہمیں برداشت کر لیا تھا لیکن اب صاف ظاہر تھا کہ ہمیں منظر سے ہٹانا چاہ رہے ہیں۔ اتنے میں ہی ببلو بستہ سنبھالے خراماں خراماں تشریف لے آئے۔ مس صوفیہ پہلے ہی بید کی کرسی سنبھال چکی تھیں۔ دوسری کرسی پر ببلو میاں دھپ سے بیٹھ گئے۔ باقی بچی ایک کرسی اس پر سیفی براجمان ہو گئے۔

"آج ذرا اس ببلو کے کان کھینچیے گا۔ پڑھائی پر بالکل توجہ نہیں دیتا۔ نواب صاحب کا کل بھی فون آیا تھا۔ اسی کے متعلق زیادہ فکرمند ہو رہے تھے۔" سیفی نے مس صوفیہ کو مخاطب کیا۔

"ہاں یہ واقعی بہت نکما ہو گیا ہے۔ پرسوں میں نے اسے تقسیم کا قاعدہ سمجھایا اور کل اس نے تقسیم کے سارے سوال غلط کر رکھے تھے۔"

"وہ مجھے سفیان بھائی نے کروائے تھے۔" ببلو نے بلبلا کر وضاحت دی۔

"وہ دراصل لائٹ گئی ہوئی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں رقمیں صحیح نظر نہیں آئیں اور شاید میں نے عینک بھی نہیں لگائی ہوئی تھی۔" سیفی نے کھسیا کر وضاحت دی۔

"آج تو آپ نے عینک لگائی ہوئی ہے نا اور ابھی دن کی روشنی بھی باقی ہے' آج ببلو کے ساتھ آپ بھی ریاضی سمجھیں گے۔" مس صوفیہ نے انہیں شوخی سے مخاطب کیا۔

"ضرور ضرور۔" سیفی نے سر تسلیم خم کیا اور ہم جو ابھی تک بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے تھے ایک دم اپنی نامناسب پوزیشن کا خیال آیا۔ مس صوفیہ

سے تو تعارف ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ سیفی نے بھی ہمیں قطعاً" نظرانداز کر دیا تھا۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔

ہم غصے کے گھونٹ پیتے اندر چلے گئے۔ ایسے طوطا چشم اور بے مروت دوست کی تنہائی کا خیال کر کے ہم دوڑے دوڑے یہاں چلے آئے تھے۔ غصہ ہمیں سیفی سے زیادہ خود پر آرہا تھا۔ ببلو صاحب تو تھوڑی دیر میں پڑھ کر واپس آگئے تھے۔ البتہ سیفی اور مس صوفیہ شام ڈھلنے تک وہاں بیٹھے رہے۔ گھڑیال نے سات بجائے تو سیفی نے اندر آکر جھانکا۔

"ہم مس صوفیہ کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ ہم کھانے پر ہمارا انتظار مت کرنا ہو سکتا ہے ہمیں کچھ دیر ہو جائے۔" وہ کہہ کر پھر غائب ہو گئے۔

"بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی مس صوفیہ۔"

ہم صرف دانت کچکچا کر رہ گئے اور رات کو سیفی دیر سے ہی لوٹے تھے۔ ہم ان کے آنے پر جاگ رہے تھے مگر پھر بھی سوتے بن گئے۔

جانتے تھے کہ اس وقت انہیں اپنے تازہ ترین افیئر کی تفصیلات بتانے کی بے چینی ہو رہی ہوگی۔ سیفی کی یہ پرانی عادت تھی۔ اپنے ہر افیئر کو وہ حتی الامکان مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں ان سے کم عمر اور زیادہ اسمارٹ ہوں۔ اسی لیے وہ مجھ سے کچھ خائف رہتے تھے لیکن سچ تو یہ تھا کہ میں اپنی اسمارٹ نیس کے باوجود لڑکیوں کو اتنا متاثر نہیں کر پاتا تھا جتنا سیفی اپنی چرب زبانی سے کر لیتے تھے اور جب سیفی سمجھتے تھے کہ لڑکیاں ان کی شخصیت کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو گئی ہیں، تب وہ مجھے شروع سے آخر تک کی ساری تفصیل مزے لے لے کر بتاتے اور جلاتے کلساتے اور آج میرا جلنے کلسنے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لیے ان کے شانہ ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کے باوجود میں کروٹ بدل کر سوتا بن گیا۔

صبح میری آنکھ بہت جلدی کھل گئی تھی۔ سیفی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ آج میرا اختر شماری کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ سیفی کی ذمہ داریاں انہی کو مبارک۔

میں نے سوئے ہوئے سیفی پر ایک نگاہ ڈالی اور جاگرز کس کر باہر نکل آیا لیکن شومئی قسمت کہ گھر سے نکلتے ہی ہمارا پہلا سامنا آخری اختر سے ہو گیا۔ میرا مطلب ہے پیانو سکھانے والے اختر جاگنگ ٹریک پر ہم سے ٹکرا گئے۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کے نوجوان تھے۔ دراز قد، گندمی رنگت اور غلافی آنکھیں۔ ہم انہیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائے۔

"صبح بخیر اختر صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں۔" ہم نے رسماً" ان کا حال احوال دریافت کیا۔

"اچھا ہوں۔" انہوں نے بھی مسکرا کر جواب دیا لیکن اس مسکراہٹ میں عجیب سی اداسی جھلک رہی تھی بلکہ ان کی پوری شخصیت کا ہی ایک عجیب سی اداسی اور پژمردگی نے احاطہ کر رکھا تھا۔ چونکہ ہم نے بی اے میں اختیاری مضمون کے طور پر نفسیات رکھی تھی، اس لیے مختلف لوگوں کی نفسیات اور نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانا ہمارا اچھا خاصا مشغلہ بن چکا تھا۔ لیکن اختر صاحب سے ہماری کوئی اتنی بے تکلفی تو تھی نہیں کہ ہم ان سے اس خوب صورت اور دلفریب صبح کے باوجود چہرے کی آزردگی کا سبب دریافت کرتے۔ البتہ شام کو جب وہ منے کی پیانو کی کلاس لینے آئے اور ایک انتہائی افسردہ دھن چھیڑ کر ماحول کو انتہائی اداس بنا دیا تو ہمارا فطری تجسس انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ آج ان سے ان کی اداسی کا سبب دریافت کر کے رہیں گے۔

خیر اداس تو آج ہم بھی بہت تھے۔ باہر حسب معمول سیفی اور مس صوفیہ کی محفل جمی ہوئی تھی۔ جانے ہر خوب صورت لڑکی ان پر ہی فریفتہ کیوں ہو جاتی ہے۔ یہ فریفتگی ہی ہماری دل گرفتگی کا باعث تھی اور سے اختر صاحب کی ماہرانہ انگلیاں پیانو سے رنج و الم کا ایسا نغمہ تخلیق کرنے میں مصروف تھیں کہ پورے ماحول کو سوگواری نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پیانو کی کلاس لے کر اختر صاحب اپنا کوٹ کندھے پر ڈال کر آہستہ روی سے جانے لگے تو ہم نے انہیں

روک لیا۔

"بیٹھ جائیے ... لے کر آرہا ہے اختر صاحب! چائے پی کر جائیے گا۔"

"نوازش، لیکن ہم پہلے ہی سوختہ جگر لیے گھوم رہے ہیں۔ گرم چائے سے اجتناب ہی کرتے ہیں۔" وہ سیفی سے معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔ ہم ان کی شخصیت کے اسرار میں کھو سے گئے۔

اتنے میں بٹلر چائے لے آیا تھا۔

"چلے گئے نا اختر میاں، مجھے پہلے ہی پتا تھا۔" ادھیڑ عمر بٹلر چائے کی ٹرے میز پر سجاتے ہوئے تاسف سے بولے۔

"اختر صاحب پیانو بہت اچھا بجاتے ہیں لیکن جانے کیوں اتنی اداس دھنیں تخلیق کرتے ہیں۔" میں نے خود کلامی کی۔

"محبت کا روگ لگا بیٹھے ہیں اختر میاں۔ دکھے دل سے ساز بجائیں گے تو ایسی ہی دھنیں نکلیں گی۔"

"خوب ہمیں بھی شک تھا کہ یہ محبت میں ناکامی والا ہی معاملہ ہوگا۔" اپنے اندازے کی درستی پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"بعض لوگوں کے ہاتھوں میں محبت کی لکیر ہی نہیں ہوتی۔ اختر میاں بھی ایسے ہی شخص ہیں۔" بٹلر نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کلامی کی۔

"آپ کیا جانتے ہیں اختر صاحب کے متعلق؟" ہمیں فطری تجسس ہوا۔

"کیا بتائیں میاں، بہت بھلے مانس شخص ہیں اختر احمد! نیک طینت، شریف النفس اور خاموش طبع، بھری دنیا میں بالکل اکیلے ہیں۔ والدین بچپن میں ایک حادثے میں جدا ہو گئے لیکن اتنے دکھوں نے اختر میاں کا دل گداز کر دیا۔ ایسے شخص کا ساتھ ٹھکرا کر صوفیہ بی بی پچھتائیں گی۔ یہ تو ان کا دامن محبتوں سے بھر دیتے۔ ایسے پرخلوص، نیک دل اور بے ریا آدمی اب کہاں پائے جاتے ہیں۔"

"کون صوفیہ بی بی؟" ہم نے بٹلر کی بات تیزی سے کاٹی۔ وہ جواباً" ہماری لاعلمی پر طنزیہ سے انداز میں مسکرائے۔

"صوفیہ بی بی جو اپنے ببلو میاں کو ریاضی پڑھاتی ہیں۔ اختر میاں کی کزن ہیں۔ اختر میاں ان ہی کے ہاں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ بے چارے کب سے صوفیہ بی بی کی خاموش محبت سینے میں چھپائے اظہار کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتے رہے اور کوئی دوسرا موقعہ سے فائدہ اٹھا گیا۔" بٹلر عبدالکریم کا لہجہ طنز اور تلخی سے بھرپور تھا۔ ہم قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی چور سے بن گئے۔

"کہیں آپ کا اشارہ سیفی کی جانب تو نہیں؟" ہم نے دبے دبے لہجے میں استفسار کیا۔

"چھوٹے صاحب، چھوٹا منہ بڑی بات، آپ لوگ نواب صاحب کے مہمان ہیں اور مہمانوں کا اکرام ہم پر واجب ہے۔ وہ تو اختر میاں میرے بیٹے کے دوست ہیں اور مجھے بھی اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہیں بس اسی لیے ان کے دکھ پر دل بھر آیا۔ ورنہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ انہونی بات تو نہیں۔ دنیا صاف شفاف اور بے ریا دل میں جھانکنے کا تردد کب کرتی ہے۔ ظاہری شخصیت کی چکاچوند پر ہی مرتی ہے اور صوفیہ بی بی بھی تو آخر اسی دنیا کا حصہ ہیں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے عبدالکریم! سیفی اور صوفیہ میں محض بے ضرر سی بے تکلفی ہے۔ سیفی یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ دوستی بھی قصہ پارینہ بن جائے گی۔" ہم نے ان کی تشفی کے لیے یقین دہانی کروائی۔

"غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہے۔ آپ کے سیفی صاحب کو آج کل صوفیہ بی بی کے ہاں ممکنہ دامادوں والا پروٹوکول مل رہا ہے۔ جانے کیا کچھ وعدے وعید ہو چکے ہیں دونوں کے درمیان۔"

بٹلر عبدالکریم نے گویا ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ہم گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ سیفی کی دل لگی کسی کی دل کی بربادی کا سبب بن رہی تھی اور یہ ہمیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ عبدالکریم چلے بھی گئے۔ مگر ہم ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھے سیفی کی توجہ صوفیہ سے ہٹانے

کے لیے کوئی ترکیب سوچتے رہے اور ہم اپنے خیالوں میں اتنے مگن تھے کہ سیفی کی آمد کا پتا بھی نہ چلا وہ تو جب انہوں نے ایک شوخ گانے کی دھن پر سیٹی بجانا شروع کی تو ہم چونک کران کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

"چلی گئیں مس صوفیہ؟" ہم نے سرسری سے لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں ابھی ابھی گئی ہیں۔ ویسے کیا حسین خاتون ہیں۔ بلکہ ان کی شخصیت حسن اور ذہانت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔" سیفی کے کہنے پر ہم مسکرا دیے۔

"ذہین تو یقیناً ہوں گی اور شاید خوب صورت بھی مگر حسین کہنا زیادتی ہوگا۔"

"تم نے صوفیہ کو غور سے نہیں دیکھا اس لیے یہ کہہ رہے ہو۔" سیفی نے بھی جیسے ہمارا مذاق اڑایا تھا۔

"ہم نے تو مس صوفیہ کو غور سے دیکھا ہے لیکن شاید آپ نے زہرہ جبیں کو نہیں دیکھا۔ آپ انہیں دیکھتے تو پتا چلتا کہ حسن کس چڑیا کا نام ہے اور واقعی حسین شخصیت کہلانے کا مستحق ہے۔"

"کون زہرہ جبیں؟" سیفی کے کان یکدم کھڑے ہوئے تھے۔

زہرہ جبیں، صولت پھوپھو کی نند کی صاحب زادی لیکن آپ کو وہ کہاں یاد ہوں گی۔ آپ نے تو شاید انہیں ایک آدھ بار بچپن میں ہی دیکھا ہوگا۔"

"تو تم نے کب اور کہاں دیکھ لیا؟" سیفی نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

"ہم آپ کو بتانا بھول گئے تھے۔ زہرہ جبیں آج کل اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے گھر رہنے آئی ہوئی ہیں۔ جس روز آپ یہاں پہنچے تھے۔ اس سے اگلے دن ہی تو وہ پہنچی تھیں۔ ہم ہی انہیں اسٹیشن سے لے کر آئے تھے۔ خوب صورتی، نزاکت اور نفاست ختم ہے زہرہ جبیں پر، ہم تو انہیں دیکھ کر اتنے مرعوب ہوگئے کہ مخاطب کرنے کی جرات ہی نہ کرسکے ورنہ ہم بہت ہنس مکھ پائی ہے انہوں نے۔ چند گھنٹوں [illegible] سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔"

"تم سے گاؤدی اور چغد شخص نے ان سے [illegible] ہوکر کرنا بھی کیا تھا۔" سیفی نے ہمارا تمسخر [illegible] ہم نے قطعاً "برا نہ مانا۔

"البتہ ان کی والدہ ہمارے ساتھ بہت شفقت [illegible] پیش آئیں۔ امی جان سے ہماری فرماں برداری [illegible] خوب تعریف کی۔ ہم دو تین بار انہیں اور زہرہ جبیں [illegible] لے کر بازار گئے تھے۔ کسی شادی کے لیے [illegible] کرنا تھی انہیں اور آپ کو تو پتا ہے گھر میں کوئی [illegible] کہاں، ڈرائیونگ کے فرائض ہمیں ہی انجام [illegible] پڑتا تھے۔"

"تم شکل سے لگتے بھی تو ڈرائیور ہی ہو۔" [illegible] جانے کیوں اتنا چڑ گئے تھے۔

"اچھا چھوڑیے اس ذکر کو۔ آپ یہ بتایئے کہ [illegible] صوفیہ سے آج کی نشست میں کیا باتیں ہوئیں۔ [illegible] تو تھوڑی دیر میں پڑھ کر آگئے تھے۔" آپ مس [illegible] کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کے [illegible] قہقہوں کی گونج یہاں تک سنائی دے رہی تھی [illegible] کوئی دلچسپ موضوع چھیڑا ہوگا آپ نے۔" ہم [illegible] زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

"ہاں پتا نہیں کیا بات تھی۔ ویسے صوفیہ [illegible] قہقہے بہت بلند لگاتی ہے۔ ہم بھی ان کے قہقہوں [illegible] بدمزہ ہورہے تھے لیکن مروت کے مارے ٹوک [illegible] سکے۔"

"نہ صرف قہقہے بلند لگاتی ہیں بلکہ ہمیں تو [illegible] آواز بھی بہت چبھتی ہے عجیب سی کرختگی ہے ان [illegible] آواز میں۔ ہم اسی لیے تو آپ کی محفل میں مخل [illegible] ہوتے۔ سماعت کو ایسی کراری آواز ناگوار گزرتی [illegible] ایک زہرہ جبیں ہیں کیا نغمگی پائی جاتی ہے آواز میں۔" ہمیں پھر زہرہ جبیں کی یاد ستائی تھی۔

"اچھا تم یہ بتاؤ، رات کے کھانے کے لیے خان [illegible] کو کیا ہدایت دی ہیں۔ ہمیں بہت بھوک لگی ہے۔"

سیفی نے یکدم موضوع بدلا، ہم نے بھی فی الحال تھوڑے کو بہت جانا اور سیفی کی بات کا جواب دینے لگے۔

☼ ☼ ☼

سیفی کی [illegible] ت کا ہمیں بخوبی اندازہ تھا۔ انہوں نے بہت ہرجائی طبیعت پائی تھی اور ہمیں ان کی اسی فطرت کا فائدہ اٹھانا تھا۔ اگلے دو دن تک ہم گاہے بگاہے زہرہ جبیں کا ذکر کرکے ان کے آتش شوق کو بھڑکاتے رہے اور اب ان کی مس صوفیہ سے دلچسپی کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کمبل چھوڑنا چاہتے تھے مگر کمبل انہیں چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ انہوں نے کبھی مس صوفیہ کی زلفوں کی تعریف کی تھی اور اب مس صوفیہ انہیں عمر بھر کے لیے اپنی زلفوں کا اسیر بنانا چاہتی تھیں۔ چند وعدے جو سیفی انجانے میں ان سے کر بیٹھے تھے اب ان کی جان کا عذاب بن گئے تھے۔ سیفی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ صوفیہ سے جان کیسے چھڑائیں۔ اوپر سے ہم وقتاً "فوقتاً" انہیں اپنی واپسی کا مژدہ سناتے رہتے۔

"ہمارا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔ ہم آج شام کی ٹرین سے واپس جارہے ہیں۔"

اور یہ سنتے ہی سیفی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ ہم اکیلے گھر واپس جاکر زہرہ جبیں یا ان کی والدہ کو متاثر کردیں۔ البتہ اپنی شخصیت پر انہیں خاصا زعم تھا کہ ان کی موجودگی میں وہاں ہماری دال نہیں گلے گی۔ اسی لیے وہ ہر ممکن طریقے سے ہمیں روکنا اور صوفیہ صاحبہ سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے کیونکہ نواب صاحب کی واپسی تک وہاں رکنا ان کی مجبوری تھی۔

اس ساری صورت حال کا نتیجہ ان پر طاری شدید ترین جھنجلاہٹ کی صورت میں نکل رہا تھا اور ہم تھے کہ ساری صورت حال سے خوب لطف اٹھا رہے تھے۔ اس روز بھی جب مس صوفیہ ببلو کو پڑھانے آئیں تو سیفی ان سے ملنے کے بجائے اندر ہی بیٹھے رہے۔

ذرا دیر بعد مس صوفیہ ببلو کی معیت میں خراماں خراماں اندر تشریف لے آئیں۔ ہم ساتھ والے کمرے میں کھڑکی کے پردے گرا کر بیٹھ گئے تاکہ دونوں کی گفتگو با آسانی سن سکیں۔

"ببلو بتا رہا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ کل بھی آپ ہماری آمد کے باوجود اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ کیا ہوا؟ کیا طبیعت زیادہ ناساز ہے؟" مس صوفیہ نے انتہا درجے کا تفکر چہرے پر طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"بس کچھ فلو ہے اور موسمی بخار۔" سیفی نے نڈھال سے لہجے میں جواب دیا اور پھر ثبوت کے طور پر تین عدد چھینکیں بھی ماردیں۔ مس صوفیہ نے اپنے ننھے سے پرس میں سے رومال نکال کر انہیں تھمایا جو سیفی نے بادل نخواستہ تھام لیا اور پھر ببلو کو مخاطب کیا۔

"تم کہاں کھسک رہے ہو، جاؤ اپنا بستہ لے کر آؤ۔ آج اچھی طرح پڑھنا ہے۔ ہم فی الحال دوسرے کمرے میں جاکر آرام کررہے ہیں۔ رات کو تمہارا ٹیسٹ لیں گے۔"

"آج اتوار ہے سفیان بھائی! مس صوفیہ صرف آپ کا حال پوچھنے آئی ہیں۔" ببلو نے انہیں آگاہ کیا اور مزے سے رفوچکر ہوگئے۔ سیفی انہیں پیچھے سے پکارتے ہی رہ گئے۔ مس صوفیہ انہیں شکوہ کناں نگاہوں سے گھورنے لگیں اور وہ اس گھورنے میں حق بجانب بھی تھیں کہ پچھلے تین دنوں سے سیفی ان سے کنی کترا رہے تھے۔ سیفی کو ان کی نگاہوں کا احساس ہوا تو کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔

"دیکھیں۔ کیا نالائق لڑکا ہے فوراً" نو دو گیارہ ہوگیا۔" انہوں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے صوفیہ کو مخاطب کیا۔ وہ اب بھی خاموشی سے انہیں تکتی رہیں۔

"ویسے یہ نو دو گیارہ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ کبھی یہ سننے میں کیوں نہیں آیا کہ آٹھ چار گیارہ ہوگیا۔ ان کی خاموشی سے خائف ہوکر سیفی نے بلاوجہ کا نکتہ اٹھایا۔

"کیونکہ آٹھ چار گیارہ نہیں ہوتے۔" وہ اپنی ننھی

سی ناک سکوڑ کر نخوت سے بولیں۔

''اوہ سوری! میرا حساب کچھ کمزور ہے۔'' ذرا دیر بعد سیفی کی سمجھ میں اپنا ہی جملہ آیا تو مزید شرمندہ ہو گئے۔

''اور حساب میری کمزوری ہے۔'' وہ کچھ خفگی جتاتے ہوئے بولیں۔

''یعنی آپ کی اور ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔'' سیفی سے اندرونی خوشی چھپائے نہ چھپی۔

''دیکھیے ہونے کو تو ہماری بات چیت بھی نہیں ہو سکتی مگر ہو رہی ہے۔''

''یعنی؟'' سیفی نے ناک پر پھسلتی عینک کو اپنی جگہ پر جما کر تجاہل عارفانہ اختیار کیا۔

''یعنی یہ کہ آپ پہلی فرصت میں اپنے والد صاحب کو یہاں لے کر آئیں اور میرے والد صاحب کے پاس بھیجیں۔'' مس صوفیہ نے بھی اب صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی تھی۔ سیفی ان سے اتنی دو ٹوک بات کی توقع نہیں کر رہے تھے اس لیے بوکھلا کر رہ گئے۔

''دیکھیں صوفیہ! ہم نے دنیا جہان کے معاملات ڈسکس کر لیے لیکن کچھ اہم باتیں ایسی ہیں جو میں آپ کو ابھی تک نہیں بتا پایا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ اب میری کسی مذاق میں کی گئی بات کو زیادہ ہی سیریس لے بیٹھی ہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کے درمیان محض.....''

''آپ مجھے صرف یہ بتائیے کہ آپ اپنے والد کو میرے والد کے پاس کب بھیج رہے ہیں؟'' مس صوفیہ نے برہمی سے ان کی بات کاٹی تھی۔

''میں اپنے والد کو آپ کے والد کے پاس نہیں بھیج سکتا البتہ آپ کے والد کو اپنے والد کے پاس بھیج سکتا ہوں اور آپ چونکہ اپنے والد کی واحد وارث ہیں اگر مجھے معاف کر بھی دیا تو شاید میں سزائے موت سے تو بچ جاؤں مگر عمر قید تو کاٹنی پڑے گی۔''

''مطلب؟'' صوفیہ اس طویل اور لایعنی بات سن کر چکرا گئی تھیں۔

''مطلب یہ کہ میرے والد دوسرے جہان [illegible] ہیں۔'' سیفی نے قدرے چڑ کر جتایا۔

''اوہ بہت افسوس ہوا۔'' انہوں نے [illegible] تاسف چہرے پر طاری کیا اور ایسا کرنے کی کوشش [illegible] وہ ضرورت سے زیادہ احمق لگیں اتنی احمق کہ [illegible] اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ پائے۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔'' وہ ناراض ہو [illegible]

''جب بھی ڈیڈی کا ذکر آتا ہے مجھے ہنسی آ [illegible] ہے۔ دراصل ان کی آخری وصیت تھی کہ ہنستے [illegible] کھیلتے زندگی گزارنا۔'' ان کے خطرناک تیور [illegible] گھبرا کر سیفی نے مسکراہٹ کو فوری بریک لگا کر [illegible] وجہ گھڑی۔

''تو پھر اپنی والدہ کو میرے والد کے پاس بھیج [illegible] وہ تو حیات ہیں نا؟'' انہوں نے اس بار احتیاطاً [illegible] لیا۔ جواباً سیفی نے اتنی ٹھنڈی آہ بھری کہ کمرے [illegible] درجۂ حرارت یکلخت کئی سینٹی گریڈ نیچے گر گیا۔

''وہ میری پیدائش سے ڈیڑھ سال قبل ہی وفات [illegible] پا گئی تھیں۔'' چند منٹوں کی سوگوار خاموشی کے [illegible] انہوں نے رقت بھرے انداز میں بتایا۔

''یعنی یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی [illegible] آپ کی پیدائش سے ڈیڑھ برس پہلے وفات [illegible] تھیں۔'' وہ قدرے چیختے ہوئے بولیں تو سیفی کو اند[illegible] ہوا کہ والدہ کی رحلت کی ٹائمنگ میں کتنی خطرنا[illegible] غلطی کا ارتکاب کر چکے ہیں۔

''اب آپ یہ کہیں گے کہ آپ کی پیدائش بھی [illegible] بالا میں ہوئی ہے۔ براہ کرم یہ بھی بتا دیجیے کہ [illegible] تشریف آوری کیسے ہوئی۔ بارش کے ساتھ [illegible] شہاب ثاقب کی طرح تھاہ کر کے زمین پر گرے [illegible] وہ اس قدر غصے میں تھیں کہ سیفی کو ان کے چہ[illegible] کے آس پاس باقاعدہ چنگاریاں پھوٹتی ہوئی نظر آ[illegible]

''وہ دراصل والدہ کے انتقال کے بعد مجھے مجبو[illegible] اپنی پھوپھی کے ہاں پیدا ہونا پڑا۔'' بہت پہلے کسی [illegible] نگار کا لکھا ہوا فقرہ انہیں بروقت یاد آیا تھا۔

''آپ کیا اول فول ہانک رہے ہیں۔'' مس صوف[illegible]

غصہ اب جھنجلاہٹ میں بدل رہا تھا۔

"دراصل میری پھوپھی کے سات بیٹے ہیں سب سے آخری والا میں ہوں۔ انہوں نے اپنے بھائی یعنی میرے والد کی بے رونق زندگی کا خیال کرکے مجھے ان کی گود میں ڈال دیا۔" اب سیفی کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کی حقیقی والدہ حیات ہیں۔" مس صوفیہ کو اس سارے قصے میں واحد کام کی بات یہی پتا چل سکی۔

"لیکن میں انہیں اپنی پھوپھی ہی سمجھتا ہوں۔" وہ دوبارہ دفاعی پوزیشن پر آکھڑے ہوئے، سو ہکلاتے ہوئے وضاحت دی۔

"بس پھر آپ اس سنڈے کو انہی والدہ آئی مین اپنی پھوپھی کو ہمارے ہاں لے کر آرہے ہیں، ہم اکٹھے ڈنر کریں گے۔" مس صوفیہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

"ڈنر تو ہم اکٹھے کرلیں گے۔" سیفی کو ان کا خانساماں یاد آیا تو فوراً" سر ہلا دیا۔ "لیکن میری پھوپھی آپ کے ہاں آکر وہ والی بات ہرگز نہیں کریں گی۔ یہ میں آپ کو پیشگی بتا رہا ہوں۔"

"کون سی والی بات؟" مس صوفیہ نے ابرو چڑھائے۔

"آپ کی اور ہماری شادی والی بات۔"

"آخر کیوں؟" وہ چیخ پڑیں سیفی تصور میں ان کے ہاتھ اپنی گردن سے چند انچ کے فاصلے پر دیکھ سکتے تھے۔

"کیونکہ وہ میری شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہتی ہیں۔" وہ اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے ہکلائے۔

"آپ کی شادی اپنی بیٹی سے؟ ان کی بیٹی آپ کی بہن ہوئی۔" وہ چبا چبا کر بولیں۔

"نہیں آپ غلط سمجھیں۔ دراصل ان کی اپنی کوئی بیٹی نہیں۔ انہوں نے بیٹی کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنے دیور کی بیٹی گود لی ہوئی ہے۔" سیفی کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

"آخر آپ کے خاندان میں اتنے بچے گود کیوں لیے جاتے ہیں۔" وہ جھنجلائی۔

"کیونکہ وہ گود سے اترتے ہی شرارتیں شروع کردیتے ہیں۔" سیفی نے پھر انٹ شنٹ بکا۔

"اُفوہ! آپ کی باتیں سن کر میں پاگل ہوگئی ہوں۔" وہ غرائی۔

"سوری میں ایک پاگل سے شادی نہیں کرسکتا۔" سیفی نے کہنے کے ساتھ ہی بھاگ لینا مناسب سمجھا اور مس صوفیہ ناقابل یقین نگاہوں سے کمرے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہیں پھر انتہائی تھکے تھکے انداز میں آنکھیں اور خاموشی سے اٹھ کر چل پڑیں۔ اسی لمحے آخری اختر بھی پیانو کی کلاس لے کر باہر نکلے تھے۔ ہم کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر دونوں کو جاتا دیکھتے رہے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرکے اختر صوفیہ کے ہم قدم ہوگئے تھے۔ چند مزید قدم طے کرنے کے بعد انہوں نے اپنا رومال صوفیہ کو پیش کیا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھیں اور اس سے پیشتر وہ اگلے مرحلے میں اپنا کندھا بھی انہیں پیش کرتے، ہم نے کھڑکی کے پٹ بند کردیے۔

اگلے دن نواب صاحب کی واپسی متوقع تھی لیکن ہم ان کا انتظار کیے بغیر ہی اپنے شہر روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچنے کی بے تابی ہم سے بھی زیادہ سیفی کو تھی۔ وہ جلد از جلد زہرہ جبیں سے مل کر ہمارے بیان کی صداقت کو پرکھنا چاہ رہے تھے اور جب سیفی نے زہرہ جبیں کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ بلاشبہ بلا کی حسین تھیں۔ سیفی کے مطابق ہم نے ان کا حلیہ کھینچنے میں مبالغے کے بجائے کسر نفسی سے کام لیا تھا۔ سیفی ان پر دل و جان سے فدا ہوگئے تھے۔

زہرہ جبیں اور ان کی والدہ کی شاپنگ کا سلسلہ ہمارے جانے کے بعد ٹھپ پڑا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اس جبری ڈرائیونگ کے باعث ہی ہم سیفی کے پیچھے نواب صاحب کی جاگیر کو بھاگے تھے لیکن اب ہماری واپسی پر گھر کے بڑوں نے دوبارہ ڈرائیونگ کی ذمہ داری ہمیں سونپنا چاہی جو سیفی نے ازراہ ہمدردی اپنے سر لے لی۔

اگلے دن صبح سے شام تک سیفی انہیں شاپنگ کروانے میں ہلکان ہوتے رہے۔ شام کو وہ گھر لوٹے تو چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ہم نے انہیں دور سے دیکھا اور رفوچکر ہوگئے۔ وہ یقیناً ہماری گردن مروڑنے کے لیے ہماری تلاش میں تھے۔ شاید انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ دھڑا دھڑ شاپنگ زہرہ جبیں کی شادی خانہ آبادی کے سلسلے میں ہی کی جارہی ہے۔ اگرچہ بعد میں ہم نے انہیں یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ ہم اس بات سے بالکل لاعلم تھے لیکن سیفی ہمارے بارے میں ایک عرصے تک مشکوک ہی رہے۔

زہرہ جبیں اور ان کی والدہ اپنے آبائی شہر سدھار گئی تھیں۔ ہم بھی اپنی ساری غیر سنجیدگی ترک کرکے سنجیدگی سے نوکری تلاش کرنے لگے۔ سنجیدگی تو اب سیفی پر بھی طاری رہنے لگی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتے۔ ہم ان کی دلی کیفیت سمجھ سکتے تھے، ان کے ساتھ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والا معاملہ درپیش تھا۔ ہر دفعہ حسیناؤں سے جی بھرنے پر وہ انہیں چکمہ دے کر جان چھڑاتے تھے۔ اس دفعہ چکمہ دیتے دیتے وہ میرے دیے گئے چکمے کا شکار ہوگئے تھے۔

اور ایک شام جب ایک جگہ انٹرویو دے کر ہم گھر لوٹے تو سیفی اپنے کمرے کی بتیاں گل کیے دروازہ بھیڑے بیٹھے تھے۔ گھر والوں نے بتایا کہ ڈاکیا کوئی چٹھی دے گیا ہے، جب سے سیفی کمرے میں ہی بند ہیں۔ اگلی صبح ہم نے ان کی غیر موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی تو دراز سے مس صوفیہ اور آخری اختر کی شادی کا کارڈ مل گیا۔

ہم کارڈ واپس رکھنے ہی لگے تھے کہ مس صوفیہ کے دیے گئے رومال پر نظر پڑ گئی۔ اس رنگین رومال پر جابجا آنسوؤں کے نشانات تھے۔ ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ کیا اتنا وقت گزرنے کے بعد سیفی مس صوفیہ کی محبت میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یقین نہ آتا تھا مگر قرائن یہی بتا رہے تھے۔ ہمیں دکھ تو ہوا کیونکہ سیفی سے اس درجے حساسیت کی ہمیں ہرگز توقع نہ تھی لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ سیفی بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیں گے۔ بس کسی اور اچھے سے چہرے کے ملنے کی دیر ہے۔

ہمیں اپنے دوست کی وقتی افسردگی اور پژمردگی پر افسوس تو ضرور ہے لیکن اس کہانی میں اپنے ادا کیے ہوئے کردار پر کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں۔ ہماری نظر میں یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین اختتام ہے۔ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟

☼

راحت جبیں

ٹوٹی پھوٹی اینٹوں والی گلی' قطار در قطار مکانوں کا سلسلہ' کچی نالیاں جو اوپر سے بھی ڈھکی ہوئی تھیں' بارش کے دنوں میں بھی زیادہ مسئلہ نہ ہوتا' اس گلی میں کوئی خصوصیت تھی تو یہ کہ ہر گھر کے سامنے شہتوت کا ایک درخت ضرور موجود تھا' جہاں اسکول آتے جاتے بچے' کالے' جامنی شہتوت چن چن کر اپنی جومیٹری اور لنچ بکس بھر لیتے' کبھی کبھار گلی سنسان دیکھ کر کالج کی لڑکیاں بھی موج میں آجاتیں۔ شہتوت چنتی' بلاوجہ کھلکھلاتی جاتیں.... اسی مناسبت سے یہ گلی شہتوت والی گلی کہلاتی تھی۔

اسی گلی کے عین درمیان میں آمنے سامنے دو گھر تھے' کچھ سال پہلے تک دونوں گھروں کا اندرونی و بیرونی نقشہ ایک سا تھا' جب عبدالرحمٰن مرحوم نے اپنے دو مکان دونوں بیٹوں کے نام کیے' اور بڑھتے ہوئے خاندان کے پیش نظر عبدالقدوس سامنے والے گھر میں منتقل ہوئے' تو سال بھر میں گھر کا اندرونی و بیرونی حال بدل کر رہ گیا' ٹوٹے پھوٹے دروازے کی جگہ براؤن گیٹ' صحن سے کمروں تک ٹائلیں' جدید اسٹائل کا کچن' دیواروں پر وال گرافی' حالانکہ یہی عبدالقدوس تھے' جو گھر میں خرچہ دیتے' سو سو رونے روتے' یہ چھپا خزانہ کہاں سے نکلا ہے' کوئی نہ جانتا تھا۔

تبدیلی کا یہ عمل صرف گھر تک محدود نہ رہا' بلکہ رویوں میں بھی در آیا.... چنانچہ بے بے نے عبدالغفور کے ساتھ رہنا منظور کیا' جہاں پہلے ہی انواع و اقسام کے بچوں کی بہتات تھی' عبدالغفور صاحب اور کسی معاملے میں خود کفیل ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں' اولاد کے معاملے میں ضرور تھے۔ اور گھر وہی برسوں پرانا' سبز زنگ لگا لوہے کا دروازہ' چوں' چاں کی آواز سے کھلتا' تو اکھڑی اینٹوں والی نیم تاریک ڈیوڑھی سامنے آجاتی' جہاں برسات میں پانی بھرتا تو اینٹوں کا رستہ بن جاتا' اسی کہکشاں پر چل کر ڈیوڑھی ختم ہوتی تو سامنے صحن' برآمدہ' آگے پیچھے تین کمرے' چھوٹا سا کچن اور ڈیوڑھی کے اختتام پر موجود غسل خانہ' سب کچھ ایک دم سامنے آجاتا' پلستر اکھڑی' سیلن زدہ دیواریں' کائی جمے پیندوں والے گھڑے' ہر کمرے میں کئی کئی نفوس اور ہر نفس کی زبان پر ایک ہی آواز۔

"ربیا! کپڑے دھل گئے...؟"

"ربیا! ابا کو کھانا دو...."

"ربیعہ بیٹی! دادی کو کھانسی کی دوا دے دی۔"

"اری ربو! یہ چھوٹا کیوں رو رہا ہے؟" چھوٹو کا بھونپو اور کسی کونے کھدروں سے اماں کی صدائیں۔

"ربیا! آج کھانا ملے گا یا بھوکا ہی دکان پر چلا جاؤں۔" بڑے بھیا چلاتے۔

"آپا' میری اچھی آپا' تختی پر پور نے ڈال دو۔" منی کندھے پر لٹک کر تختی ناک میں گھسا دیتی۔

"سارے مل کر آپا کے گلے پہ چھری پھیر دو' اس عید پر قربانی آپا کی کر دینا۔" اس کی خوش نصیبی تھی یا بد نصیبی کہ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی' اور بڑی بیٹی اس طبقے میں کولہو کا بیل سمجھی جاتی ہے' اس سے بڑے

صرف بھیا تھے' جو سب پر رعب جمانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے۔

"اری ربا! ذرا دیکھنا' تمہارے ابا گوشت لائے تھے' کہیں تھیلی باہر ہی تو نہیں بھنچ گئے۔"

اس نے عصر کی نماز پڑھ کر ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ اماں کی دہائی شروع ہو گئی' اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ اللہ میاں سے لمبی لمبی دعائیں مانگے' تایا عبدالقدوس جیسا گھر' اسفی بھیا جیسی گاڑی' آپی عافیہ جیسے کپڑے اور کچھ نہیں تو نے والی فاطمہ نسیم جیسا نسیا خوبصورت محبت کرنے والا شوہر۔ اللہ اتنی ساری دعاؤں میں سے کوئی ایک دعا تو قبول کرے گا ہی' اور اس کی خواہش تھی کہ یہ قبول ہونے والی دعا آخری ہو' مگر اماں کو اس کی لمبی لمبی دعائیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں' خوامخواہ بے چین ہونے لگتیں۔

"اری بس کر' فرشتے بھی تھک گئے دعائیں لکھتے' اٹھ کر ہانڈی چڑھا' روٹی کی فکر کر' مغرب کے ساتھ سب کو کھانا چاہیے۔"

اب بھی یہی ہوا' اس نے جھنجلا کر جائے نماز لپیٹی اور کچن میں آ گئی' ابا نے سنبھال کر تھیلی فریج میں رکھی تھی۔

"آپا' آج گوشت پکے گا۔" چھوٹو موٹو صحن میں ناچنے لگے۔ "میں بڑی بوٹی لوں گا۔"

"ہاں آیا کہیں کا شاہ رخ خان۔"

وہ چھری سے پیاز کاٹنے لگی' گوشت دھو کر ککر میں ڈالا' ادرک' لہسن چھیلا' کوٹا' تھوڑی دیر میں سارے گھر میں ککر کی شوں' شوں ہونے لگی۔

"ادرک' لہسن ڈال کر خوب اچھی طرح بھونو' عبدالغفور کے لیے مسالے والی بوٹی نکال لو۔" بے بے چٹخارہ سا لے کر کہتیں۔ "اس سے پانی والی بوٹی حلق سے نہیں اترتی۔"

"ہاں' اس کو مسالے والی بوٹی کھلاؤ' اور باقیوں کو۔"

"رہنے دو آلو ڈال لینا' ورنہ پورا نہیں پڑے گا۔" اماں چمک کر کہتیں تو بے بے کو غصہ آجاتا۔

"سارا دن ہڈیاں گھسائے اور دو بوٹیوں کا حق بھی نہیں۔"

ربا کان لپیٹ کر اپنا کام کیے جاتی' اس نے آلو ڈالے' شوربہ بھی بنایا اور ابا کے لیے مسالے والی تین بوٹیاں بھی الگ کر کے چولہے کے نیچے گھسا دیں' گرم مسالے اور ہرا دھنیا ڈالا تو خوشبو سارے گھر میں پھیل گئی' تب ہی بے بے اپنے پلنگ سے اتر کر ہولے ہولے چلتی ہوئی کچن میں آ گئیں۔

"بن گیا سالن؟" کہتے کہتے ربا کے ہاتھ سے ڈوئی لے لی۔ ربا کا دل چاہا کہ بے بے کے ہاتھ سے ڈوئی چھین لے' انہیں کچھ سخت سنا کر یہاں سے جانے پر مجبور کر دے' لیکن وہ مجبور تھی' اپنی مروّت بھری طبیعت اور اس محبت کے ہاتھوں' جو اسے اپنی بے بے سے تھی' لیکن یہ محبت اس محبت سے کہیں کم تھی' جو بے بے کو عبدالقدوس سے تھی۔

بے بے کو پتا تھا' ربا انہیں گھور رہی ہے' کلس رہی ہے' پھر بھی انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے الماری سے چاندی کی کٹوری نکالی' سالن اس میں ڈالا' پھر تھالی سے ڈھک دیا۔

"کوئی اچھی چیز پکے تو دوسروں کا حصہ بھی نکالنا چاہیے۔"

انہوں نے مخصوص جملہ کہا' ربا کا دل چاہا' وہ انہیں بتائے کہ جن لوگوں کا حصہ وہ نکالتی ہیں' وہ اس سے کہیں اچھا کھاتے ہیں' مگر انہیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ان لوگوں یا کم از کم بے بے کا حصہ ہی نکال دیں' اسے کٹوری لے کر جانا ہی تھا' وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے بے وہ سب دیکھیں یا سنیں' جو وہ دیکھتی یا سنتی تھی' وہ یہ کٹوری کسی بچے کے ہاتھ بھی بجھوا سکتی تھی' مگر وہی ہوتا کہ وہ آکر سب من و عن بے بے سے کہہ جاتا' اور ربا بے بے کے چہرے پر پھیلی مایوسی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"جا' عبدالقدوس کھانا کھالے گا۔"

اس نے اک طویل سانس لے کر دوپٹہ ٹھیک کیا' کٹوری ہاتھ میں لی۔

"روٹی آکر پکاتی ہوں۔"

ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا' جب بھی اس گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی' بے بے عبدالقدوس کا حصہ ضرور نکالتیں' خواہ انہیں اپنا حصہ کیوں نہ دینا پڑے' پچھلے ہفتے وہ کھیر لے کر گئی تھی' سب گھر والے ایک جگہ بیٹھے تھے' ٹرائفل کا بڑا سا باؤل درمیان میں پڑا تھا۔

"اچھا کھیر ہے' بے بے تو ناحق زحمت کرتی ہیں' بھلا اب یہ کم دودھ اور زیادہ چاولوں والا ملغوبہ کون کھائے گا' حلیم نے آج فروٹ ٹرائفل بنایا ہے' بہت مزے کا ہے' تم کھاؤ گی؟"

"جی نہیں۔" شکریہ کے الفاظ ابھی ربا کے لبوں میں پھڑپھڑاتے کہ تائی اگلی بات شروع کر دیتیں۔ وہ ہونقوں کی طرح پلیٹ ہاتھ میں لیے ان کی شکلیں دیکھ رہی ہوتی' آخر تایا کو مروّت نبھانا یاد آتا۔

"ہاں ہاں' کچن میں رکھ دو' میں بعد میں کھاؤں گا' آخر میری بے بے نے بھجوائی ہے۔" حالانکہ ربا کو یقین تھا کہ وہ یہ کھیر کبھی نہیں کھائیں گے۔

"بے بے کو میرا سلام کہنا۔"

گویا اب وہ جا سکتی تھی' وہ پلیٹ کچن میں رکھ کر مرے مرے قدموں سے لوٹی۔

"عبدالقدوس نے کھالی۔" بے بے نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی' مزے سے۔" اس نے تھوک نگل کر بمشکل کہا تھا' بے بے کی بوڑھی آنکھیں چمکنے لگیں' اسے ٹھنڈی ٹھار ٹرائفل یاد آئی' کیا بے بے چند چمچے کی حق دار بھی نہ تھیں۔

وہ گلی عبور کر کے سامنے والے گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

اور اس سے پچھلے ہفتے جب وہ آلو قیمہ کا سالن لے کر گئی تھی' تو سب کے ایف۔ سی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

آج دروازہ احسن نے کھولا.... "ربا آپی آئی ہیں۔" کہتا باہر ہی بھاگ گیا' وہ اندر آتے ہی چکرا گئی' کچن میں خاصا رش تھا' انواع و اقسام کی خوشبوئیں سارے گھر میں چکرا رہی تھیں۔ وہ کچن کے دروازے میں ششدر سی کھڑی تھی' کڑاہی میں مچھلی شوں' شوں کر رہی تھی' تو توے پر کباب فرائی ہو رہے تھے' مختلف اقسام کے سلاد بن رہے تھے' بڑے بڑے پتیلوں میں کیا تھا' وہ بنا ڈھکن اٹھائے بتا سکتی تھی' بریانی' کڑاہی گوشت' کوفتے۔

اپنی کم مائیگی کے احساس سے ربا کی آنکھیں بھر آئیں' ہاتھ میں وہ کٹوری لرز گئی' جس میں شوربے میں دو بوٹیاں اور چند آلو ڈوبے تھے۔

یہ ان کے گھر کا اچھا کھانا تھا۔

"امی! یہ لیں آئس کریم اور رس ملائی' یہ پیپسی کے چار لیٹر پیک' اب اگر کچھ منگوانا ہو تو احسن کو بھیجئے گا' کیسی ہو ربا؟"

اسفی بھیا نے سامان حفصہ کے ہاتھ میں تھمایا اور بنا اس سے جواب لیے واپس مڑ گئے' تائی نے اسے یوں دیکھا' جیسے کہتی ہوں۔

"تم پھر آ گئیں۔"

اس نے جلدی سے کٹوری میز پر رکھ دی۔

"بے بے سے کہو۔ خوامخواہ زحمت مت کریں' کوئی کھانا تو ہے نہیں۔" تایا تو تھے نہیں' سو انہوں نے آرام سے کہہ دیا' وہ بس اثبات میں سر ہلا کر مڑ گئی۔

"کن سوئیاں لینے کی عادت ہے' کسی نہ کسی بہانے بھیج دیتی ہیں۔" ان کی بڑبڑاہٹ ربا نے پوری طرح سنی۔ "پتا چل گیا ہو گا کہ آج میرے میکے کی دعوت ہے۔"

"اب اس فقیروں والے سالن کا کیا کرنا ہے؟"

ربا کے قدم دانستہ آہستہ ہوئے' سماعتیں چوکنا ہو گئیں۔

"کسی فقیر کو دے دینا یا نوکرانی کو۔"

"ہونہہ... ایسا کھانا تو نوکرانی بھی نہ کھائے۔"

چاندی کی کٹوری پٹخی گئی۔ اریبہ بھاگتی ہوئی گھر کا دروازہ عبور کر گئی' جھکے سے آکر کچن میں پیڑے بنانے لگی' شوربے والے گوشت کی خوشبو نے سب کی بھوک جگا دی' لیکن اریبہ کی بھوک نجانے کیوں مر گئی تھی' اس

کے پیچھے ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی۔

"ربو! عبدالقدوس نے کھانا کھالیا۔" لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"جی بے بے' بہت شوق سے۔" اس نے رخ بدل لیا' آنسو اک تواتر سے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

سنی پتا نہیں کیسے سیڑھیوں سے پھسل گیا' اس کی چیخوں نے سارے گھر کو ہلا دیا' سب ہی کھانا کھا رہے تھے' سنی ان کی بہن کا بیٹا تھا' بلا کا شرارتی' اچھی بھلی دعوت چل رہی تھی' سب کی تعریفیں سن سن کر دل شاد ہو رہا تھا' اگرچہ کھانا تو لڑکیاں بھی بنا لیتی تھیں' مگر جو ذائقہ خود ان کے ہاتھ میں تھا' وہ بیٹیوں میں نہ آیا' سو شارجہ سے آئے بہن اور بہنوئی کی دعوت میں انہوں نے زیادہ چیزیں خود ہی بنائیں' اسی شہر میں موجود اپنے دیگر بہن' بھائیوں کو بلاتے ہوئے انہیں ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ سامنے والے گھر میں بھی بلاوا بھجوا دیں۔ جب یہ خیال عبدالقدوس کو نہ آیا تو انہیں کیا ضرورت تھی' سنی ماڈل ٹاؤن والی بہن کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے' ٹخنہ اتر گیا ہے۔" بچے کی چیخوں سے یہی لگ رہا تھا' اسفی نے جلدی سے گاڑی نکالی' بہن کی تسلی کے لیے وہ بھی ساتھ بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانے اور ٹریٹ منٹ میں خاصی رات ہو گئی۔

اسفی' ہمیں تو اب گھر ہی اتار دو۔" بہن نے کہا تو انہیں ماڈل ٹاؤن ڈراپ کر کے رات گئے گھر لوٹے' اسفی مردوں کے ساتھ ہی کھانا کھا چکا تھا' جبکہ انہوں نے صرف پکایا ہی پکایا تھا' اس وقت مارے بھوک کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے' سر الگ چکرا رہا تھا' سب مہمان کھا پی کر بڑے کمرے میں جمع تھے' آئس کریم اور چائے کا دور چل رہا تھا۔

"سب نے کھانا ڈھنگ سے کھالیا۔" انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں حفصہ سے پوچھا' جو کچن سمیٹ رہی تھی۔

"جی' کھالیا' توبہ امی! آپ کے میکے والے تو کھاتے ہیں' سب چٹ کر گئے' ایسا لگتا تھا' زندگی میں پہلی اور آخری دعوت کھا رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو' اور کھانا دو' اب تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔" وہ وہیں ٹیبل پر بیٹھ گئیں۔

"ارے آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا۔" وہ چونک کر مڑی۔

"مہمانوں کو کھلاتی یا خود کھانے بیٹھ جاتی۔" انہوں نے چڑ کر کہا۔

"اب تو سب ختم ہو گیا' جو تھوڑا بہت بچا میں نے رضیہ کو دے دیا' سارا دن کام کرواتی رہی کہہ رہی تھی گھر میں بچے بھوکے ہیں۔"

"نہیں' سب کا سب مچھلی' چاول' گوشت......" وہ فریج کی طرف لپکیں۔

"شکر کریں' پورا ہو گیا' بے عزتی نہیں ہوئی' فریج میں انڈے پڑے ہیں' وہ بنا دیتی ہوں۔" حفصہ نجانے کس کے لیے چائے لے کر باہر نکل گئی' اوندھے سیدھے پڑے خالی تیلے' بھائیں بھائیں کرتا فریج' چچوڑی ہوئی ہڈیاں' مچھلی کے کانٹے' روٹی کے ٹکڑے۔

"کمبخت' کمینے' سب کے سب خود غرض' مال پکا پکا کر بھادی ہو گئی' انہیں اتنا خیال نہ آیا کہ میرے لیے کھانا بھی رکھنا ہے۔ سب ٹھونس ٹھانس گئے۔" ان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ ہائے وہ کراری مچھلی' خوشبودار بریانی' کمینوں نے ایک کباب بھی نہ چھوڑا۔ ہاٹ پاٹ میں ایک ڈیڑھ روٹی پڑی تھی۔

"بس ہا اچار کے ساتھ ہی کھالوں۔ بیٹیوں میں پانی ڈال دیا تھا' ورنہ لگا لگا کر ہی کھالیتی' تب ہی آنسوؤں کی دھند کے پار کارنس پر پڑی چاندی کی کٹوری دکھائی دی' انہوں نے لپک کر اٹھائی' سالن موجود تھا' دھنیے اور گرم مسالے کی خوشبو سے پیٹ میں دوڑتے چوہے دھمالیں ڈالنے لگے۔ انہوں نے کٹوری سامنے کی اور مزے سے شوربے میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھانے لگیں۔

☼

نگہت سیما

پل صراط

اور یہ میں ہوں اسید عبدالرحمٰن میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں میری سمجھ نہیں آرہا۔ وہاں سے جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی یا وہاں سے جب میرا دل پہلی بار آمنہ کے نام پر دھڑکا تھا۔یا وہاں سے جب وہ میری زندگی میں داخل ہوئے تھے۔وہ جو میرے کوئی نہیں تھے بلکہ جو میری زندگی کا اہم سنگ میل تھے۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کاش! وہ مجھے نہ ملے ہوتے تو میری زندگی بہت آسان ہوتی۔ میں ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزار کر چلا جاتا۔یوں ہر لمحہ پل صراط سے نہ گزرنا پڑتا۔ سوچتا ہوں میرے ساتھ انہوں نے اچھا نہیں کیا یا پھر شاید اچھا کیا۔

لیکن جس راستے پر وہ مجھے ڈال گئے ہیں۔ وہ بڑا مشکل راستہ ہے۔پل صراط۔

پل صراط کیا ہے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز اور اس پل کو عبور کرکے ہی جنت میں جایا جاسکے گا۔

دادی کہتی تھیں ”اس کے نیچے آگ دہکتی ہوگی۔ جہنم کی آگ اور گناہ گار اس پل صراط کو پار نہ کرسکیں گے اور آگ میں گر جائیں گے اور نیک لوگ آرام

مکمل ناول

سے پل پار کر جائیں گے" اور میرا چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ "دادی! جو لوگ قربانی دیتے ہیں، وہ تو اپنے اپنے قربانی کے جانوروں پر بیٹھ کر پل صراط پار کریں گے۔"

"بھلا نہ ہو تو۔" دادی ہنس پڑتی تھیں۔ "پلے میں کوئی عمل نہ ہو تو خالی خولی قربانی کے جانور کس کام کے۔"

لیکن یہ پل صراط جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اگر دنیا میں ہی اس سے واسطہ پڑ جائے تو آدمی کیا کرے۔ ہر لمحہ یوں لگے جیسے آدمی تنے ہوئے رسّے پر چل رہا ہو میں بھی اس پل صراط سے گزر رہا ہوں مسلسل چھ سال سے اور ہر لمحہ یہ خوف کہ ذرا سی بے احتیاطی ذرا سی لغزش نیچے آگ کے دہکتے گڑھے میں گرا دے گی اور اس خوف کی کیفیت میں زندگی گزارنا کیسا ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔ آفتاب حسین کی وجہ سے۔ جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئے تھے میری زندگی بہت سکون اور آرام سے گزر رہی تھی اور آئندہ بھی گزرتی رہتی ایسے ہی جیسے میرے جیسے ہر متوسط گھرانے کے لڑکے کی گزرتی ہے۔

میں اسید عبدالرحمٰن نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ میرے والد محکمۂ زراعت میں کلرک تھے جبکہ میرے دادا پرائمری اسکول ٹیچر تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ شاید اس لیے میرا بچپن اور لڑکپن ابا کے بجائے دادا کی نگرانی میں زیادہ گزرا۔ میری والدہ بھی جب میرا چھوٹا بھائی چھ سال کا تھا، وفات پا گئی تھیں یوں والدہ کی جگہ دادی نے ہماری پرورش کی تھی۔ اور ہم چاروں بھائی ہی دادا دادی کے زیادہ قریب تھے لیکن میں چونکہ بڑا تھا۔ اس لیے دادا کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی اور میں خود بھی دادا کی ذہانت سے متاثر تھا۔ دادا نہ صرف یہ کہ حساب کے سوال منٹوں میں کر لیتے تھے بلکہ ان کے پاس بے تحاشا نالج تھی۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے

بڑے کمرے میں تین الماریاں ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس لیے جب میں چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ میں دادا کی طرح استاد بنوں گا۔

دادا کے پرانے شاگرد جہاں کہیں بھی دادا سے ملتے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ محفل میں ہوتے تو دادا کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ میں بھی جب ذرا بڑا ہوا تو مجھے کتابوں کا چسکہ پڑ گیا۔ شروع میں دادا نے مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں تاکہ میری اردو اچھی ہو جائے لیکن جب میں ہائی کلاسز میں پہنچا تو دادا نے مجھے اجازت دے دی کہ میں ان کی کتابوں میں سے جو کتاب بھی چاہوں لے کر پڑھ لوں۔ یوں کتابیں میرے لہو میں داخل ہو گئیں۔

دادا کے پاس بے شمار اچھی اعلا پائے کی ادبی کتابیں بھی تھیں۔ جب دادا نے وہ کتابیں خریدی تھیں تو ان کی قیمت بہت کم تھی بڑی بڑی ادبی کتابوں کی قیمت پڑھ کر مجھے ہنسی آتی تھی۔ چار آنے، دو آنے، چھ آنے "غبارِ خاطر" ابوالکلام آزاد کی یہ کتاب غالباً میں نے چھٹی جماعت میں پڑھی تھی اور مجھے یاد ہے اس کی قیمت چھ سات آنے ہی تھی۔ میں ہنستا تو دادا سمجھاتے۔

"یار! اس وقت روپے کی قیمت تھی۔ جانتے ہو میری تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔ میں ہر ماہ دس روپے گاؤں اپنی ماں کو خرچ بھیجتا تھا اور تیس روپے میں، تمہاری دادی، ابا میں اور پھوپھی اچھا خاصا گزارا کر لیتے تھے بلکہ ہر ماہ دو تین روپے کی کتابیں خریدنے کی عیاشی بھی کر لیتا تھا۔ دادی کی الماری میں اس زمانے کے مشہور رسالے بھی جلد کیے ہوئے پڑے تھے مثلاً "ہمایوں، نیرنگِ خیال، ساقی، قوس و قزح" اور رسالے ہی نہیں اپنے زمانے میں نکلنے والے ہفت اخبار مثلاً" اودھ پنچ وغیرہ کی فائلیں بھی موجود تھیں تو یوں یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے جب نے میٹرک

پاس کیا تو میں استاد بننے کا ارادہ موقوف کر چکا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا میں یا تو ادیب بنوں گا یا صحافی۔

"ادیب پیدائشی ہوتا ہے میری جان!" دادا نے میری بات سن کر کہا تھا۔ "یہاں کسی کالج یا یونیورسٹی میں ادیب بننے کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہاں تم ادب پڑھ سکتے ہو انگریزی ادب، اردو ادب، فارسی ادب یہ تعلیم تمہاری صلاحیتوں کو پالش ضرور کر دے گی لیکن تمہیں ادیب نہیں بنا سکے گی اگر تمہارے اندر پہلے سے ہی ٹیلنٹ موجود نہیں ہے۔ تم صحافت پڑھ لو۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"تو ٹھیک ہے میں جرنلزم لوں گا۔"

میں نے سوچ لیا تھا حالانکہ ابا چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر یا انجینئر بنوں اور انہوں نے اس سلسلے میں تھوڑی سی جذباتی بلیک میلنگ سے بھی کام لیا یعنی یہ کہ تمہاری مرحومہ ماں کی خواہش تھی۔ ممکن تھا کہ میں اس جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو جاتا کہ دادا نے ابا سے کہا۔

"اس کا راستہ نہ روکو اور اس پر زبردستی نہ کرو۔ اس کا مزاج نہیں ہے سائنس پڑھنے کا۔ تمہارے کہنے پر لے تو لے گا لیکن چل نہ سکے گا۔"

اور ابا نے کبھی دادا کی بات نہیں ٹالی تھی اور یوں میں نے آنرز، بی اور بی اے کے بعد جرنلزم میں داخلہ لے لیا۔ زندگی یوں ہی گزر رہی تھی بڑے سکون سے کہ احمر کو بلڈ کینسر ہو گیا۔ احمر ہمارے ڈپارٹمنٹ کا سب سے ذہین لڑکا تھا اور میرا گہرا دوست۔ احمر میری ہی طرح ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اس کے آدرش بہت بلند تھے۔

وہ اونچے اونچے خواب دیکھتا۔

اس ملک کو بدل دینے کی باتیں کرتا تھا۔

کبھی کبھی میں احمر کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی دنیاؤں کی بات کرتا تھا۔ اس نے اپنی ایک یوٹوپیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ایک ایسا پاکستان جس کا ہر فرد ریاست سے مخلص تھا۔

جہاں کرپشن نہیں تھی۔

جہاں انصاف تھا۔

میں ساکت سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

لیکن پھر وہ اپنی تمام خوب صورت سوچوں اور اعلا اونچے نصب العین کے ساتھ منوں مٹی تلے سو گیا۔

احمر نوید جب بیمار ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ اسے بلڈ کینسر ہے تو ہم دوستوں نے اس کے لیے پیسے اکٹھے کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ ذہین، خوب صورت لڑکا ہماری آنکھوں کے سامنے تیزی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسے موت کے منہ میں جانے سے روک نہیں سکتے تھے لیکن اس کی اذیت کم کر سکتے تھے علاج اور دواؤں سے اسے سکون دے سکتے تھے، کئی لوگوں نے مدد کی۔ کئی لوگوں نے ٹرخا دیا۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ملے جن کے پاس پیسوں کی فراوانی تھی لیکن جن کے دل اتنے تنگ تھے کہ ان کی جیبوں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکلا تھا۔

اس روز "صبحِ نو" کے دفتر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں بلا ارادہ ہی اندر چلا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس اخبار کا مالک جرم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کر رہا تھا اور ایک مخیر شخص تھا اور پھر جیسا میں نے سنا تھا ویسا ہی پایا۔ میں نہ صرف یہ کہ آفتاب حسین کی شخصیت سے متاثر ہوا بلکہ میں نے اپنے دل میں ان کے لیے بڑی اپنائیت بھی محسوس کی۔ گو میں نے پہلی بار آفتاب حسین کو دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ دنیا میں اگر آفتاب حسین جیسے چند لوگ بھی ہوں تو یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔ میں نے سب ہی دوستوں سے ان کا ذکر کیا حتیٰ کہ احمر کے پاس بیٹھ کر میں نے کتنی ہی بار آفتاب حسین کو سراہا۔ یہ دو تین دن بعد کی بات تھی جب میں نے احمر کے دادا ابو کو بتایا کہ آفتاب حسین نے کہا ہے کہ اگر احمر کو باہر بھجوانا پڑا تو وہ پوری مدد کریں گے۔

"یہ آفتاب حسین کون ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

اور جب میں نے بتایا "صبحِ نو" کا مالک تو وہ چونک

پڑے۔

"حسین احمد کا بیٹا۔"

"ہاں شاید یہی نام ہے ان کے والد کا۔" مجھے یاد آیا تھا کہ "صبح نو" کے پہلے صفحے پر مالک کا نام یہی لکھا ہوتا ہے۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے پھر بے چینی سے پوچھا۔

"کیا اس نے بھی تمہاری مدد کی ہے؟"

"جی ایک لاکھ کا چیک دیا ہے۔ ابھی ہمارے پاس ہی ہے۔ کل احمر کو ہسپتال میں لے جائیں گے تھراپی کے لیے تو...."

"نہیں۔" وہ یکدم کھڑے ہوگئے تھے۔"یہ رقم اسے واپس کردو بیٹا!"

"لیکن کیوں دادا جان!" (احمر کی طرح ہم سب دوست بھی انہیں دادا جان کہنے لگے تھے۔) "آپ جانتے ہیں علاج کس قدر مہنگا ہے' ایک ایک انجکشن بہت قیمتی ہے۔"

"جانتا ہوں پھر بھی آفتاب حسین کی رقم تم واپس کردو۔ میں نے نوید کی وفات کے بعد بہت محنت کی ہے۔ سب کو رزق حلال کھلایا ہے' اب اس کے آخری لمحوں میں اس کے خون میں رزق حرام شامل کروں۔ نہیں۔"

ان کا انداز حتمی تھا۔

"لیکن دادا جان! اور جن جن لوگوں نے مدد کی ہے' ان کے متعلق بھی تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ رقم جائز ذریعے سے کمائی گئی ہے یا ناجائز۔" میرے ایک دوست نے کہا تھا۔

"آپ صحیح کہتے ہو بیٹا! لیکن میں ان کے متعلق بے خبر ہوں۔ جانتے بوجھتے میں حرام کی آمیزش نہیں کرسکتا۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"حسین احمد میرا ہم جماعت تھا اور ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ جو شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا' میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا سوائے اس کے کہ اس نے یہ سب ناجائز طریقوں سے کمایا ہے۔ اور اس کا یہ بیٹا اسی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ میں حسین احمد کو اتنا جانتا ہوں جتنا شاید آفتاب حسین بھی نہیں جانتا ہوگا۔"

انہوں نے مزید بات نہیں کی تھی اور اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔

"اس وقت اس طرح کی غیرت دکھانا بے وقوفی ہے۔"

ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا۔ تب احمر نے اپنی بند آنکھیں کھولی تھیں۔

"مجھے اپنے دادا پر فخر ہے اسید! پلیز جو دادا نے کہا ہے' وہی کرو۔"

دوسروں کی نظر میں وہ بے وقوف ہی سہی لیکن میری نظروں میں ان کا قد بڑھ گیا تھا۔ یہ بڑے حوصلے کی بات تھی۔ اور ایسا ہر کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ احمر ہی کر سکتا تھا یا اس کے دادا جان۔

آفتاب حسین کا بت میرے اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ یہ بت اگرچہ دو دن پہلے ہی تو میرے اندر بنا تھا لیکن اس کی کرچیوں نے مجھے زخم زخم کردیا تھا۔

پتا نہیں کیوں۔ دو تین دن تک میں عجیب حزن کی کیفیت میں گھرا رہا پھر احمر کا علاج شروع ہوگیا اور مصروفیت بڑھ گئی۔

انجکشن تھراپی

ایک تکلیف دہ عمل

اور زندگی کی امید صفر

پھر بھی آدمی آخری سانس تک کوشش تو کرتا ہے۔ سو ہم بھی کر رہے تھے۔ طلباول کھول کر ڈونیشن دے رہے تھے۔ اور امید تھی کہ ہم احمر کو باہر بھجوا سکیں گے۔

میں ذرا سنبھلا تو آفتاب حسین کو چیک واپس دینے چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے آفتاب حسین کا چہرہ جگہ جگہ سے چٹخ رہا ہو اور وہ کسی اذیت سے گزر رہے ہوں۔ مجھے خیال گزرا تھا کہ کہیں دادا جان کو غلط

نہیں ہوئی۔ یہ شخص ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ میں نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں۔ اس سے ان کے چہرے پر بکھرا سوز اور گداز مجھے پگھلا دے رہا تھا۔

میں یک دم ہی ان کے دفتر سے نکل آیا تھا۔ میں آتو گیا تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے میں نے ان کے ساتھ زیادتی کردی ہو۔ میں نے اچھا نہیں کیا۔ ضروری تو نہیں کہ بیٹا بھی باپ جیسا ہو۔ اور پھر اس طرح کے لوگ تو پیسے کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے۔

پھر میں نے آفتاب حسین کے متعلق جاننے کی کوشش شروع کردی۔

آفتاب حسین ایک بڑا ادیب

ایک سچا کالم نگار

کھرا صحافی

آفتاب حسین' ایم پی اے

ایک بلیک میلر

دوغلا

کسی انڈر گراونڈ تنظیم کا بگ باس

ان انکشافات نے مجھے گہری اذیت سے دوچار کردیا۔ بہت دن لگے مجھے خود کو یقین دلانے میں کہ ایسا ہی ہے۔

یہ دنیا ہے۔ یہاں لوگوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے اوڑھ رکھے ہیں۔

اور میں نے آفتاب حسین کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ یوں بھی احمر کی طبیعت کافی خراب تھی۔ پہلی تھراپی کے بعد وہ بے حد ویک ہوگیا تھا اور میں یونیورسٹی کے بعد روز ہی اس کی طرف چلا جاتا تھا۔

"کاش میں کچھ دن اور جی سکتا۔" مرنے سے چند دن پہلے اس نے کہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے میں زیادہ دن جی نہ سکوں گا۔" زندگی کی حسرت اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔

"میرے بعد میرے بابا جان اکیلے ہوجائیں گے اسید! تم کبھی کبھار ان کے پاس آتے رہنا اور کبھی کبھی سلال سے بھی مل لیا کرنا۔"

میں نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے لگا تھا میں اگر بولا تو حلق میں جمع ہوجانے والے آنسو آنکھوں سے بہہ نکلیں گے۔

"میں نے سوچا تھا میں...."

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہوگیا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا۔

"اسید!" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے میں اپنے سارے خواب تمہیں منتقل کردوں۔ تم جانتے تو ہو نا میرے خواب۔"

میں نے اب بھی بنا بولے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وعدہ کرو اسید عبدالرحمن! ہمیشہ جھوٹ کے' ظلم کے' ناانصافی کے خلاف جنگ جاری رکھو گے۔ جب قلم اٹھاؤ گے تو اس کی حرمت کبھی نہیں بیچو گے۔ ہمیشہ سچ لکھنا میرے دوست!"

اس کے سفید ہوجانے والے ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"میں نے سوچا تھا کہ میں صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کروں گا۔ میں اپنے قلم کی طاقت سے ملک کی تاریخ بدل دوں گا۔ تھا نا دیوانے کا خواب۔"

وہ ہولے سے ہنسا تھا' ایسی ہنسی جس میں ہزاروں

حسرتوں کی کرچیاں تھیں۔

"پتا ہے اسید! بابا جان اکثر کہتے ہیں۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا"

اسے اقبال سے عشق تھا اور اسے اقبال کے سینکڑوں اردو اور فارسی کے شعر یاد تھے اور اکثر وہ ہمیں یہ اشعار سناتا رہتا تھا۔ صرف اقبال کے نہیں اور بھی شعرا کے شعر۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے کوئی شعر سنایا تھا۔

"سنو' یہ واقعی مشکل راہ ہے لیکن راہِ حق کے دیوانے راہ کی صعوبتوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔ میں سوچتا تھا۔

میرا ملک

میرا پاکستان

اقبال کا خواب

جناح کی کوششوں کا حاصل

میں اس کے لیے تن من دھن وار دوں گا۔ میں ان سانپوں بچھوؤں کا سر کچل ڈالوں گا جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میں ان سب ملک دشمن لوگوں کے خلاف اپنی آخری سانس تک قلم سے جہاد جاری رکھوں گا۔ لیکن آہ میں اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

پھر وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ خاموش۔ چپ چاپ۔ اس کے لب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"سنو اسید! عبدالرحمٰن! عہد کرتے ہو کہ میرا مشن جاری رکھو گے؟"

اور میں نے اس کی آنکھوں کی گفتگو سے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر رکھے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

"ہاں میں اسید عبدالرحمٰن وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارا احمر نوید کا خواب پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

احمر کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' میں اس بار تھراپی کی اذیت برداشت نہ کر پاؤں گا۔" اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا تھا۔

"لیکن مجھے یقین ہے ہم یہ تکلیف برداشت کر لیں گے اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے ایک روز ہم دونوں قدم سے قدم ملائے اور کندھے سے کندھا جوڑے اس مشن کو شروع کریں گے اور ایک دن ان سارے سانپوں اور بچھوؤں سے اپنے ملک کو صاف کر دیں گے۔"

وہ بولا نہیں تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے وہ میری خوش فہمی پر دل ہی دل میں ہنسا ہو۔

"ہاں۔ تم یہ مشن ضرور جاری رکھنا اور سنو۔" اس کی آنکھوں میں یک دم جیسے روشنیاں سی کوندی تھیں اور زرد چہرے پر رنگ سے بکھر گئے تھے۔

"وہ ہے' ناصدف' میری کزن!"

"کیا صرف کسی کا نام لینے سے ہی چہرے پر یوں رنگ اتر آتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"وہ بھی کہتی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی۔ وہ بھی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اسید وہ۔"

اس کی آنکھوں کی روشنیاں ماند پڑ گئیں اور چہرے کے رنگ مدھم ہو گئے۔ "اگر کبھی اپنے مشن کے لیے تمہیں کسی مخلص ورکر کی ضرورت پڑے تو اسے اپنے ساتھ شامل کر لینا۔ میں نے ایسی بہادر اور سچی لڑکیاں کم ہی دیکھی ہیں۔"

"وہ۔ کیا تم اور وہ۔؟" میں کچھ پوچھتے پوچھتے جھجک گیا۔

"ہاں۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیسے برداشت کر پائے گی وہ میری موت کو۔ بہت بچپن میں ہی خالہ اور امی کے درمیان یہ طے پا گیا تھا۔"

"فار گاڈ سیک احمر! تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے ان شاء اللہ اور پھر دیکھنا ہم سب نے تم سے ٹریٹ لینی ہے زبردست سی۔ چھپے رستم ہو بتایا نہیں۔ خیر اب ساری کسر نکال لیں گے۔"

✲ ✲ ✲

لیکن میرا یقین مجھ پر ہنستا ہی رہ گیا اور وہ چلا گیا۔ بہت سارے دن میں اپ سیٹ رہا۔ بہت سارے دن میں سوچتا رہا ایسے سچے کھرے محب وطن لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور آفتاب حسین جیسے بلیک میلر زندہ رہتے ہیں۔ کیا تھا اگر احمر نوید کے بجائے آفتاب حسین مر جاتے۔ میں نے کئی بار سوچا تھا پتا نہیں کیوں میں آفتاب حسین کو بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ آگے چل کر انہیں میری زندگی میں ایک اہم کردار کرنا تھا۔

احمر نوید۔

اور آفتاب حسین' احمر نوید سے بالکل مختلف۔

ایک رزق حلال پر پلنے والا۔

دوسرا جس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں حرام شامل تھا لیکن دونوں نے ہی جاتے جاتے مجھے ایک ہی عہد میں باندھا تھا۔

قلم کی حرمت برقرار رکھنے کا عہد۔

سچ کے پرچار کا عہد۔

اور میں ان دو بندوں کے عہد سے بندھا چھ سال سے پل صراط پر چل رہا ہوں۔

اس روز جب میں چیک واپس کر کے ان کے دفتر سے نکل رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی پھر اس شخص سے ملوں گا بلکہ میں زندگی میں پھر کبھی انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہوا یوں کہ وہ بار بار مجھ سے ٹکرانے لگے۔

حتیٰ کہ وہ میرے گھر تک پہنچ گئے۔

کبھی دادی سے ملنے کا بہانہ۔

کبھی ابا اور دادی کی خیریت معلوم کرنے کا جواز۔

کیوں آخر کیوں وہ یہاں آتے ہیں۔ میں الجھ رہا تھا اور میرے خاندان کے لوگ ان کے اخلاق کے اسیر ہو رہے تھے دادی نے تو جھٹ سے انہیں بیٹا بنا لیا تھا۔ میرے گھر کے چھ کے چھ فرد ان کے اخلاص و محبت کے گن گاتے تھے۔

"دادا! کیا آپ کو بھی لگتا ہے کہ آفتاب حسین اچھے آدمی ہیں کیا ان کا باطن بھی ان کے ظاہر جیسا ہے۔"

"کسی کے باطن کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں بیٹا۔ وہ جیسے بھی آدمی ہیں لیکن تنہا ہیں۔ گھر کے ماحول اور اپنوں کی محبتوں کو ترسے ہوئے۔ وہ ہم سے کچھ طلب نہیں کرتے پھر تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ یہاں نہ آیا کریں۔ اگر ہماری ذات سے انہیں چند لمحوں کی خوشی مل جاتی ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے بیٹا! وہ بھی تمہاری طرح بچپن میں ہی ماں کی محبت سے محروم ہو گئے تھے۔"

دادا مجھے وہ سب بتا رہے تھے جو آفتاب حسین نے انہیں اپنے متعلق بتایا تھا۔

میں دادا سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن انہیں تو روک سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی اذیت سے دوچار ہو گئے ہوں۔ ان کا چہرہ' ان کی آنکھیں سب ظاہر کر رہی تھیں کہ کوئی گہرا درد ان کے دل کو چھیل رہا ہو۔ میں نے نظریں چرا لیں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا حالانکہ میں اندر سے کمزور ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ میں ان کے بھائی نایاب سے مشابہ ہوں اور یہ مشابہت انہیں میری طرف کھینچتی ہے اور تب میں بے اختیار اس خواہش کا اظہار کر بیٹھا جو کبھی کبھی میرے دل کے اس چور حصے سے ابھرتی تھی جہاں آفتاب حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

"آپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں آتے سر!" اور انہوں نے بس ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ کیسی بے بسی اور حسرت سی تھی ان نظروں میں کہ میرا دل پگھل کر پانی ہونے لگا تھا۔

اس رات میں نے نہ صرف خود ان کے لیے دعا کی بلکہ دادا اور دادی سے بھی دعا کے لیے کہا اور اب پتا نہیں یہ ہماری دعائیں تھیں یا پھر ان کی تقدیر میں پہلے سے ہی رقم تھا کہ اپنے آخری دنوں میں وہ اس دلدل سے نکل آئیں گے جب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس

دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں نے حیرت اور خوشی سے ان کی بات سنی تھی۔

ان دنوں میں فری لانسر کی حیثیت سے مختلف اخباروں میں لکھ رہا تھا۔ میرے کالم اور میرے آرٹیکل دونوں ہی پسند کیے جا رہے تھے۔ اور ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں معاشرتی مسائل پر یہ آرٹیکل چھپ رہے تھے، جب مختلف معاشرتی مسائل پر لکھتے لکھتے میں نے منشیات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے گلیوں، قبرستانوں، پارکوں اور ویران زیرِ تعمیر عمارتوں میں گرے نشے میں دھت سترہ اٹھارہ سالوں کے بچوں کے بارے میں لکھ رہا تھا۔

"وہ منشیات کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں یہ لت کیسے پڑی؟" ننھے معصوم بچے کیسے نشے کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ہر ٹاپک پر لکھنے سے پہلے اس کی اچھی طرح سے تحقیق کرتا تھا اور پھر ایک روز مجھ پر جو انکشاف ہوا، اس نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔

میں نے آفتاب حسین کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں نے ان کے آرٹیکل اور کالم لائبریریوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھے تھے کہ لوگ کہتے تھے کہ میری تحریر میں آفتاب حسین کی تحریر کی سی کاٹ ہے۔ میری لفظوں سے آفتاب حسین جھلکتا ہے۔

لوگوں کی کمزوریوں کو کھوج کر انہیں بلیک میل کرنے والے شخص کو تو میں نے اپنی طرف سے بشری کمزوری کا مارجن دے کر معاف کر دیا تھا لیکن ایک ایسی تنظیم کے باس کو میں کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے ملک میں زہر پھیلا کر میری نسل کو تباہ کر رہا تھا۔ نہیں، میں ان سب چہروں کو بے نقاب کروں گا۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا لیکن اس رات پتا نہیں کیوں ڈھیروں آنسو بلاوجہ ہی میری آنکھوں میں چلے آئے تھے۔

انہوں نے کہا تھا۔

"تم میرا لحاظ نہ کرو اور بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھ سے ملے تھے۔ تم وہی کرو جو تمہارا ضمیر کہتا ہے۔ ایک صحافی کبھی اپنا قلم نہیں بیچتا۔"

"تو۔۔۔؟" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"تو۔۔۔؟" وہ مسکرائے تھے۔ "تمہاری [illegible] سرے جہاں تک جاتے ہیں، وہاں تک ضرور جانا [illegible] مین!"

میری ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔

اور اس رات میں نے جب اپنا آرٹیکل مکمل کیا میری آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے لیکن میں اپنے آفس جاتے ہوئے وہ مضمون اخبار کے میں دینے کے لیے رکا تو ایڈیٹر نے معذرت کر لی۔

"سوری مسٹر اسید! ہم مضامین کا یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ آپ پلیز کسی معاشرتی مسئلے پر لکھیں۔"

"لیکن سر! کیا یہ معاشرتی مسئلہ نہیں ہے۔"

"تم اس موضوع پر بہت لکھ چکے ہو، لوگ تنگ ہو گئے ہیں پڑھ پڑھ کر، وہ اب کچھ نیا چاہتے ہیں۔"

"لیکن سر! اس قسط میں تو بڑے بڑے انکشافات کیے ہیں میں نے۔ آپ حیران ہوں گے کتنے بڑے بڑے لوگ ملوث ہیں اس کاروبار میں۔"

"ایسے کاموں میں بڑے لوگ ہی ملوث ہوتے ہیں میری جان!"

وہ مدبرانہ انداز میں مسکرائے تھے۔

"بہرحال، مجھے آپ کے نئے آرٹیکل کا انتظار رہے گا۔ کل تک لکھ لیں گے نا آپ۔"

"اوکے سر!" میں سمجھ گیا تھا جو لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے، ان کی رسائی یہاں بھی تھی میں آفس سے باہر آگیا اور سوچا کوئی تو ہوگا ایسا جی دار جو یہ چھاپ دے دوسرے اخبارات سے بات کروں گا یا کسی میگزین سے۔

☆ ☆ ☆

مگر پھر ان کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے حادثے کی خبر پڑھی تو تھی لیکن مجھے [illegible]

[illegible] تھا کہ وہ ساری کشتیاں جلائے کہیں لمبے سفر پر جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میرا دل جیسے ڈوب سا گیا اور کچھ دیر میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ مجھے زیرِ بار نہ کریں۔" میں ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے [illegible] تھا اور [illegible] آواز میں نہ جانے کہاں سے آکر بہت [illegible] شامل ہو گیا تھا۔

"لیکن یار! میں نے کہاں زیرِ بار کیا ہے تمہیں۔"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ اور کیسے زیرِ بار کرتے ہیں۔ [illegible] کر لیا آپ نے مجھے۔

"تم اپنے قلم کا کبھی سودا نہ کرنا اسید!"

وہ مجھ سے عہد لے رہے تھے اور میں اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ ایک عہد میں نے احمر سے کیا تھا اور اب ایک عہد میں آفتاب حسین سے کر رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اسے نبھانا کتنا مشکل ہوگا کہ میں ہانپ ہانپ جاؤں گا۔ میں نے جو انہیں پہلی نظر میں پسند کیا تھا اور میں نے شاید ان سے نفرت بھی کی تھی لیکن میں جو ان کا کوئی بھی نہیں تھا، ان کے آخری لمحوں تک ان کے ساتھ تھا۔ جب انہوں نے آخری سانس لی تو ان کا سر میری گود میں تھا اور سامنے بینچ پر بیٹھے دادا مسلسل یاسلام کا ورد کر رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کر ان پر پھونک رہے تھے۔ آخری لمحے میں انہوں نے آنکھ کھول کر پہلے مجھے اور پھر دادا کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی اور پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دادی کہتی تھیں۔ بیماریاں انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتی ہیں اور پھر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، جب وہ سچے دل سے توبہ کر لے۔

ان کی بند آنکھوں پر دھرے میرے ہاتھوں میں لرزش تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر [illegible] لیکن مجھے ابھی خود کو سنبھالنا تھا۔ میں نے آہستگی سے ان کا سر تکیے پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دادا ان کی نبض دیکھ رہے تھے، جب میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا لیکن جانے والا جا چکا تھا۔ اپنے آخری چار دنوں میں جب میں ان کے پاس رہا، انہوں نے مجھ سے اپنے متعلق بہت باتیں کی تھیں انہوں نے مجھے فاطمہ کا بتایا تھا اور ایک کہانی بند لفافے میں مجھے دی تھی کہ یہ میں فاطمہ کو دے دوں۔ انہوں نے فاطمہ کا نمبر مجھے لکھواتے ہوئے تاکید کی تھی کہ میں ان کی موت کی اطلاع فاطمہ کو ضرور دوں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم بس کبیر کو فون کر دینا۔ وہ سب سنبھال لے گا۔

میں نے کبیر کو اطلاع دے دی تھی۔ میں نے فاطمہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ میں نے کبیر کو بتا دیا تھا کہ میں انہیں گھر لا رہا ہوں۔ ایمبولینس میں میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

"میرا جی چاہتا ہے، تمہیں کسی روز اپنے گھر لے جاؤں۔ تمہیں سنی بابا کا، تایاب کا کمرہ اور ان کی تصاویر دکھاؤں۔ تم دیکھنا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمہیں لگے گا جیسے تایاب ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلا ہو۔ میں نے اس کے تکیے کے پاس اوندھی پڑی کتاب کو بھی کبھی سیدھا نہیں کرنے دیا۔ تاکہ جب میں اس کے کمرے میں جاؤں تو لگے جیسے ابھی پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کر باہر گیا ہے۔"

اور اب میں ان کے گھر جا رہا تھا لیکن اس طرح کہ میں انہیں ان کے گھر لے جا رہا تھا۔

ان کے گھر کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ان کے اخبار کے ورکرز صحافی اور نہ جانے کون کون، کبیر نے لان میں ٹینٹ لگوا دیے تھے۔ اندر لاؤنج میں بھی سب تیار تھا۔ ہم انہیں لاؤنج میں لے کر گئے تھے۔ وہاں دادی اور پھوپھی کے علاوہ اس وقت صرف پاس پڑوس کی چند خواتین تھیں۔ غالباً دادا پھوپھی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ باہر ابا اور تینوں بھائیوں کے ساتھ وہ خود موجود تھے۔ ہم انہیں اندر چھوڑ کر باہر آئے تو میں نے دیکھا۔ صرف دادی تھیں، جو رو رہی تھیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ خود بخود ہی لوگ دادا ابا اور میرے پاس آنے لگے تھے۔

جو بھی آتا۔ وہ دادا اور ابا کو پرسہ دیتا۔ میرے ساتھ

افسوس کرتا۔ لوگوں نے خود ہی تصور کرلیا تھا کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ ان کے جنازے کو کندھا دینے والے بھی ہم چاروں بھائی تھے۔ وہاں آنے والے کئی صحافیوں نے مجھے پہچان لیا۔

"ارے اسید آپ!"

"اچھا تو آفتاب حسین آپ کے کوئی عزیز تھے۔ کوئی قریبی عزیز تب ہی آپ کی تحریروں میں ان کی تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔"

"سچ بتایئے کہیں آپ کے پردے میں وہ خود تو نہ تھے۔"

"اور ہاں یہ یکایک انہوں نے اخبار کیوں بند کردیا؟"

مجھے ایسی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ اندر ایک شخص کی میت پڑی تھی اور یہ لوگ پتا نہیں کیسے غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ان کا حلقہ احباب وسیع تھا۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔

جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے بھی تھے۔ سیاست دان بھی تھے اور بیوروکریٹ بھی۔ جرنلسٹ بھی تھے اور صحافی بھی۔ لیکن سب کے سب کلف لگے مصنوعی لوگ۔ میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنے دل میں اس دکھ کو پھیلتے محسوس کرتا رہا جو کسی اپنے کے بچھڑ جانے پر ہوتا ہے۔

اندر لاؤنج میں بھی عورتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ ماڈرن اور قیمتی ملبوسات میں لپٹی' ہلکے میک اپ کے ساتھ اور ہلکی پھلکی جیولری پہنے وہ یہاں پرسہ دینے آئی تھیں۔

یہ سب آفتاب حسین کی ملنے والیاں تھیں۔ اندر بھی سب خواتین دادی سے ہی افسوس کر رہی تھیں۔

تیسرے دن لوگوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوا تو میں نے کبیر سے کہا۔

"اب کل سے ہم نہیں آئیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" کبیر چونکا۔ "اب کس نے آنا ہے اور یہ مکان تم جانتے ہو ناکہ۔۔۔"

"جی۔" میں کھڑا ہوگیا اس وقت وہاں صرف میں اور کبیر تھے۔ اندر لاؤنج میں دادی تھیں اور کوئی آس پاس کے گھر سے آئی ہوئی خواتین۔

"ابا! آپ ٹیکسی دیکھیے۔ میں دادی کو لاتا ہوں۔"

کبیر نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے شاید حسین کے زمانے سے ہی ان کے ساتھ تھا۔ اسے آفتاب حسین کے یوں اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا۔ میں نے کئی بار ان تین دنوں میں اسے آنسو پونچھتے دیکھا تھا۔

"نہیں ڈرائیور چھوڑ آتا ہے اسید! آپ پھر رک جائیں۔ آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی ذاتی چیزیں آپ دیکھ لیں۔ دو تین روز تک سب ہوجائیں گی اور پھر کل تک میں سب ملازمین کو فارغ کردوں گا۔"

"یہ لوگ کہاں جائیں گے؟ شاید برسوں سے ہی سرونٹ کوارٹرز میں رہ رہے ہیں۔" ابا نے بے ساختہ کہا تھا۔ "ایک غریب ہی دوسرے غریب کی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہے۔"

کبیر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"عبدالرحمن صاحب! آفتاب صاحب نے سب کے لیے بندوبست کردیا تھا۔ بڑے دل والے اور بڑے آدمی تھے۔ انہیں سب کا احساس تھا۔"

کبیر انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔ میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ نیچے کارپیٹ پر دادی کے پاس ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کوئی خاتون بیٹھی تھیں اور خاتون کے ساتھ ایک کم عمر سی لڑکی ادھر ادھر لاؤنج میں نظریں دوڑا رہی تھی۔

"دادی!"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں پکارا تو دادی اور وہ خاتون دونوں ہی مجھے دیکھنے لگیں۔ خاتون کی آنکھوں کے گوشے نم تھے اور ان آنکھوں کی سرخی شدت غم کا پتا دے رہی تھی۔

"آجاؤ بیٹا!" دادی نے دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا تھا۔

"دادی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"اچھا!" وہ کھڑی ہوگئیں اور پھر قریب بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! یہ فاطمہ ہے۔ تیار ہی تھی کہ تم نے فون کرکے اطلاع دی تھی تابی بیٹے کی۔"

میں چونکا۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی فاطمہ کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ آج آئی تھیں یا اسی روز آگئی تھیں اور پھر ان کی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے ایک اور بات بھی یاد آگئی کہ ان کی ایک امانت بھی تھی میرے پاس۔ میں یکدم دو قدم آگے بڑھا۔

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔"

انہوں نے اثبات میں سرہلادیا۔ ان کی آنکھوں کی سطح نم تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟ مجھے ایڈریس دے دیجیے گا' میں وہاں پہنچادوں گا۔"

انہوں نے پھر سرہلادیا تھا۔

"آپ ابھی یہاں ٹھہریں گی۔"

"دو تین روز اور۔۔۔" ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ پہلی بار بولی تھیں۔ "تم۔۔۔ اسید عبدالرحمن ہو۔"

"جی۔۔۔!" میں نے اثبات میں سرہلادیا۔ نیچے کارپیٹ پر بیٹھی لڑکی دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تو یہ فاطمہ ہیں۔" ان کے چہرے کے جمال پر آج بھی نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی اور اگر آفتاب حسین نے اس چہرے کے بعد کسی اور چہرے کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی تو بجا تھا اور ان کی رفاقت کی خواہش کے بعد کسی اور کی رفاقت کو ان کا جی نہ چاہا تھا تو کچھ غلط تو نہ تھا۔

"اسید!" ابا نے مجھے آواز دی تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"تم جارہے ہو اسید؟" بے اختیار انہوں نے پوچھا۔

"میں ابھی آتا ہوں ذرا دادی جان کو چھوڑ آؤں۔"

دادی جان' فاطمہ سے ملیں لڑکی کی پیشانی چوم کر دعا دی۔

"میں جانے سے پہلے آپ سے ملنے آؤں گی؟"

لڑکی ان کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی۔ میں دادی کو پیچھے آنے کا کہہ کر مڑ گیا اور جب میں واپس آیا تو فاطمہ لاؤنج میں لگی اس بڑی سی تصویر کے پاس کھڑی تھیں جو غالباً "نایاب کی تھی۔ میں بھی ہولے ہولے چلتا ہوا اس تصویر کے پاس کھڑا ہوگیا۔

"یہ نایاب کی تصویر ہے نا!" فاطمہ نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن آفتاب اس کا اتنا ذکر کرتے تھے کہ مجھے اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا اور تم۔۔۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھا۔

"آفتاب نے بتایا تھا جب چند ماہ پہلے وہ آغا خان میں مجھے ملے تھے کہ تم نایاب سے بہت مشابہ ہو۔"

"ہاں' وہ یہی کہتے تھے۔" میں نے افسردگی سے کہا اور نایاب کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ واقعی کہیں کوئی مشابہت تو تھی۔

"آفتاب صحیح کہتے تھے بہت مشابہت ہے۔" ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"آپ کب آئیں کیا۔" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میں جنازے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔"

ان کے لبوں کے گوشے کپکپانے لگے تھے۔ تب ہی کبیر ہولے سے کھنکارتا ہوا اندر آگیا۔ وہ مجھے اندر جانے کا کہہ کر خود پورچ میں ہی رک کر مالی یا چوکیدار سے بات کرنے لگا تھا۔

"یہ فاطمہ ہیں۔"

میں نے تعارف کروایا تو کبیر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے فاطمہ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا

تھا۔ شاید وہ جانتا تھا یا شاید اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فاطمہ مڑ کر پھر تصویر کو دیکھنے لگی تھیں اور کارپٹ پر بیٹھی لڑکی بھی اٹھ کر ان کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"اسید!" کبیر نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھے۔ "آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ تم ان کی ذاتی اشیاء میں سے کچھ لینا چاہو تو لے لو۔"

"میں ـــ مجھے بھلا کیا لینا ہے۔" میرے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"ان کی مراد اپنے کاغذات یا کتابوں وغیرہ سے تھی۔ تم ان کا کمرہ دیکھ لو' انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بعد میں تمہیں ان کا' نایاب کا اور سنی بابا کا کمرہ دکھا دوں۔"

اور مجھے یاد آیا کہ انہوں نے ایک بار خواہش کی تھی کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ وہ مجھے نایاب اور سنی بابا کا کمرا دکھائیں گے۔

فاطمہ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگی تھیں۔

"کیا میں بھی اسید کے ساتھ چل سکتی ہوں۔"

"Sure" (یقیناً")۔

"یہ نایاب کا کمرہ ہے۔" کبیر نے کمرہ کھولا۔ مجھے لگا جیسے میں بہت بار اس کمرے میں آیا ہوں۔ کتنی جزئیات کے ساتھ انہوں نے سب کچھ بتایا تھا۔

تکیے کے پاس اوندھی پڑی کتاب۔

"میں نے یہ کتاب کبھی سیدھی نہیں کی اتنے سالوں میں' پتا ہے کیوں اس لیے کہ میں جب کمرے میں آؤں تو مجھے لگے جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرے سے گیا ہے اور بس ابھی آ جائے گا۔"

ایک بار انہوں نے بتایا تھا۔

"آدمی بھی خود کو کیسے کیسے دھوکے دیتا ہے۔ جھوٹے بہلاووں سے خود کو سنبھالے رکھتا ہے حالانکہ آخری سفر پر جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔" کمپیوٹر ٹیبل شیلف میں لگی میڈیکل کی کتابیں' دیوار پر نایاب حسین احمد اور آفتاب حسین کی تصاویر۔ یہ گروپ فوٹو تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حسین احمد ہی ہوں گے' باوقار سے لبوں پر شفیق سی مسکراہٹ لیے وہ کچھ کچھ آفتاب حسین سے مشابہ تھے۔ شاید اتنی عمر میں وہ بھی ایسے ہی لگتے اور اب نہیں ان کی کیا عمر ہو گی؟ میں نے سوچا۔ دیکھنے میں چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ پچاس سال سے زیادہ کے نہیں ہوں گے وہ۔

میں کبیر کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا۔ سیدھا سادا سا بیڈ روم جیسا نایاب کا تھا۔ دیوار کے ساتھ ہی شیلف میں کتابیں' دائیں طرف دیوار پر وہی گروپ تصویر اور اس کے آس پاس نایاب اور حسین احمد کی ایک فل سائز تصویر۔ ٹیبل پر کچھ فائلیں جن میں غالباً" ان کی تحریریں تھیں۔

ان کے تکیے پر گڑھا سا پڑا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی سو کر اٹھا ہو۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک دو ڈائریاں' بالکل غیرارادی طور پر میں نے ایک ڈائری اٹھا کر اسے کھولا۔ اس میں سے کارڈ سائز کچھ تصاویر نیچے گر گئیں۔ یہ یونیورسٹی کے کسی فنکشن کے گروپ فوٹو تھے۔ میں نے تصاویر فاطمہ کی طرف بڑھائیں۔ جو بھری بھری آنکھوں کے ساتھ ساکت کھڑی تھیں۔

"یہ یونیورسٹی کی تصاویر ہیں۔ یہ آفتاب ہیں' یہ میں' یہ صدف' یہ......"

وہ بتا رہی تھیں کہ کبیر کے فون کی بیل ہوئی۔ وہ معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ فاطمہ تصاویر دیکھ رہی تھیں جب میں نے ڈائری کھولی۔ جو صفحہ میرے سامنے تھا اس کا پہلا جملہ تھا۔

"اور پتا نہیں میں فاطمہ کے بغیر زندگی کیسے گزاروں گا۔"

میں نے ایک دم ڈائری فاطمہ کی طرف بڑھا دی۔

"سوری۔ میں چند لفظ پڑھنے کا مجرم ٹھہرا۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ چاہیں تو ضائع کر دیں۔ چاہیں تو رکھ لیں۔"

فاطمہ نے بنا کچھ کہے ڈائری لے لی اور پرس میں رکھ لی اور تصویریں میری طرف بڑھا دیں۔

"آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں۔"

"نہیں۔ میرے پاس ہیں۔" وہ جیسے تھک کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

"آفتاب کی بڑی خواہش تھی کہ کبھی میں اس کے ساتھ ان کے گھر چلوں لیکن میں سوچتی تھی کہ مجھے نہیں جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس گھر کا خواب میری آنکھوں میں اتر جائے جہاں میں نے نہیں آنا۔"

وہ ہولے ہولے بول رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کبھی کبھی جسے جہاں ہونا ہوتا ہے وہ وہاں نہیں ہوتا اور شاید قدرت اسی طرح اپنے بندوں کو آزماتی ہے۔

تب ہی کبیر اندر آ گیا۔ "آپ کیا لینا چاہیں گے اسید؟"

"یہ تصاویر آفتاب صاحب اور ان کے بھائی اور بابا کی اور ان کا یہ تحریری مواد میں کوشش کروں گا کہ کبھی ان کی کہانیوں کا مجموعہ چھپوا دوں۔"

کبیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ کتنی عجیب بات ہے اسید عبدالرحمٰن! کہ آفتاب صاحب تمہیں تم سے زیادہ جانتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسید تصویریں لے گا۔ اور میرا تو کوئی وارث نہیں ہے جس کے لیے یہ تصاویر ایسے ہی قیمتی ہوں جیسی میرے لیے ہیں۔ اگر اس نے تصاویر نہ لیں تو پھر انہیں جلا دینا۔"

میں عجیب سی کیفیت میں گھرا کبیر کی بات سن رہا تھا جب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اور آفتاب صاحب نے کہا تھا کہ ان کی کتابیں آپ کے دادا جان کو گفٹ کر دی جائیں۔ وہ بہت باذوق اور قدردان شخص ہیں اور اگر وہ لینے سے انکار کریں تو کسی لائبریری کو ڈونیٹ کر دینا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فاطمہ نے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پلیز مرے ہوئے شخص کی خواہش کو ٹھکراتے نہیں۔"

اور میں بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاطمہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہیں میں لاؤنج میں آ کر کچھ دیر ٹھہر گیا۔ وہ لڑکی جو ایک پینٹنگ کے پاس کھڑی اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میرے قریب آ گئی۔

"آپ وہی اسید عبدالرحمٰن ہیں نا! جن کے آرٹیکل "طلوع" میں چھپتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' میں اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ مجھ پر یک دم گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ کل تک یہ گھر آباد تھا۔ یہاں لوگ چلتے پھرتے تھے اور اب..... یہاں اس ٹیبل پر بیٹھ کر کبھی نایاب آفتاب حسین اور سنی بابا نے کھانا کھایا ہو گا پھر پہلے نایاب پھر پاپا اور پھر سنی بابا ایک ایک کر کے چلے گئے۔ آفتاب حسین اکیلے رہ گئے۔ اس گھر میں یہاں اس صوفے پر کبھی وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوں گے۔ کبھی یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے نایاب کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا ہو گا اور اکیلے میں اس سے چپکے چپکے باتیں کی ہوں گی اور اب کل یہاں کوئی اور چلتا پھرتا ہو گا۔ کسی اور کی ہنسی یہاں گونجے گی اور بس یہ ہی ہے زندگی کا مال۔ میں نے دل گرفتی سے قیمتی فرنیچر' فل سائز ایل ای ڈی اور دوسری اشیاء پر نظر ڈالی۔

اس سب کے لیے جو یہاں ہی رہ جاتا ہے' انسان کتنی بددیانتی کرتا ہے اپنے ساتھ دوسروں کے ساتھ۔ یکایک مجھے لگا لڑکی کی نظریں مسلسل مجھ پر ہیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بہت بے باکی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ماما کو بھی آپ کی تحریر پسند ہے۔ مجھے بہت شوق تھا جرنلسٹ بننے کا لیکن ماما نہیں چاہتی تھیں کہ میں جرنلسٹ بنوں۔ حالانکہ وہ خود... آپ کو تو پتا ہو گا نا۔ انہوں نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا لیکن پاپا نے نہ تو کبھی انہیں لکھنے کی اجازت دی اور نہ کبھی کسی اخبار کو جوائن کرنے کی حالانکہ ماما میں لکھنے کی بہت صلاحیت تھی' بلکہ کالج یونیورسٹی میں وہ شاعری بھی کرتی تھیں۔"

وہ بہت باتونی سی تھی۔ گندمی رنگ' بڑی بڑی خوب صورت بے تحاشا چمکتی آنکھیں' متناسب قد۔ میری

نظر غیر ارادی طور پر پھر اس کی طرف اٹھی۔ بلا کی معصومیت اور کشش تھی اس میں۔

"میں آمنہ ہوں۔ مما نے بتایا ہے آپ کو؟ ان کی بیٹی۔"

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ کر تعارف کروایا۔ میں نے فوراً" نظریں جھکالیں۔

"اور پتا ہے ' مجھے بھی بہت شوق ہے لکھنے کا۔ اور پتا ہے میری کہانیاں خواتین کے ایک ڈائجسٹ میں چھپتی ہیں۔ آمنہ شاہ کے نام سے 'آپ نے بھی پڑھیں۔"

"نہیں میں خواتین کے ڈائجسٹ نہیں پڑھتا۔"

"پڑھنے چاہئیں۔" اس نے دانش مندی سے سر ہلایا۔ "جو پڑھتے ہیں وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ خواتین کے ڈائجسٹوں میں جو کہانیاں چھپتی ہیں وہاں سے آئیڈیے لے کر بلکہ چرا کر ٹی وی کے لیے لکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے 'ہے نا!"

"بدقسمتی سے میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔" میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپایا۔

"ویری سیڈ (Very sad)۔"

"خیر۔ کبھی آپ کراچی آئے نا تو میں آپ کو اپنی کہانیاں پڑھواؤں گی۔"

"آپ کے پاپا نے آپ کو منع نہیں کیا لکھنے سے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

فاطمہ ابھی تک آفتاب حسین کے بیڈ روم میں تھیں جبکہ کبیر لاؤنج سے باہر چلا گیا تھا شاید اس کا ڈرائیور پاپا اور دادی کو چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔

"نہیں بلکہ پاپا تو بہت خوش ہوتے ہیں میرا افسانہ اور پھر اس کی تعریفیں پڑھ کر۔"

"اور آپ نے پوچھا نہیں کہ یہ کیا تضاد ہے 'مما کو اجازت نہیں۔۔۔ بیٹی کو ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ آدمی کی سوچ بدل جاتی ہے اب جیسا کہ میں بالکل بھی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ مما اور پاپا کی خواہش تھی اور جب میں پڑھنے لگی تو مجھے لگا کہ مجھے اسی میں ماسٹرز کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ ماسٹرز کر رہی ہیں؟"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرسٹ ایر یا سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوگی۔

"ہاں میرا فائنل ایر ہے۔"

تب ہی فاطمہ آگئیں۔ میں نے دیکھا ان کی پلکیں پھر بھیگی بھیگی سی تھیں۔ شاید وہاں اکیلے کمرے میں پھر روئی تھیں۔ میں نے ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آپ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہیں گی یا چلیں گی؟"

"نہیں چلتی ہوں' اب ٹھہر کر کیا کرنا' یہ گھر کون خرید رہا ہے؟"

"معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے انہوں نے یہ کسی ادارے کو ڈونیٹ کر دیا تھا۔ کبیر صاحب کو سب تفصیل معلوم ہوگی۔ آپ پتا کرنا چاہیں تو۔۔؟"

"نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔"

"اوکے' شاید ایک دو ملاقاتیں اور ہوں آپ سے۔"

کبیر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ فاطمہ گیٹ کے ساتھ کھڑی سفید کرولا کی طرف بڑھیں' پھر گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"آیئے اسید! ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

"تھینک یو میم! میں چلا جاؤں گا۔"

"تکلف مت کریں آیئے۔ پھر مجھے آپ سے وہ امانت بھی تو لینا ہے۔ آپ کہاں تکلیف کرتے پھریں گے۔"

"وہ کیا ہے؟ آفتاب انکل نے کیا دیا ہے مام کو؟" آمنہ نے پوچھا۔

میں ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور اسے پتا سمجھا رہا تھا۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"یہی کہانی ہے شاید انہوں نے کسی کی فرمائش پر لکھی ہے۔۔ ان کی آخری کہانی۔ ایک طویل گیپ کے بعد انہوں نے لکھی ہے۔"

"اچھا! پاپا میں وہ کہانی پڑھ سکتی ہوں؟"

پتا نہیں' فاطمہ نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے سنا ہی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر آفتاب حسین کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ میں نے ان سے نفرت کرنے کی ان سے دور رہنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن نہ تو میں ان سے نفرت کر سکا اور نہ ہی ان سے دور رہ سکا۔ آج اور کل کے ہر اخبار میں ان کی موت کے متعلق خبر چھپی تھی۔ اکثر کالم نگاروں نے اپنے اپنے کالموں میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔

ہر ایک کی اپنی رائے اپنا خیال تھا اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں ان کے متعلق کیا رائے رکھتا ہوں تو شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔

"یہاں سے کدھر جانا ہے؟"

ڈرائیور نے پوچھا تو میں چونکا۔

"بس یہاں ہی ایک سائیڈ پر کر کے پارک کر لیں۔ اندر گلی میں گھر ہے اور وہاں گاڑی کا جانا ذرا مشکل ہے۔"

ڈرائیور نے روڈ سے ہٹ کر ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کی۔

"تھینک یو میڈم!" میں نے فاطمہ کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ پلیز پانچ منٹ ویٹ کریں۔ میں آپ کی امانت لاتا ہوں۔"

"کیوں کیا آپ ہمیں اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتے۔"

آمنہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ غریب خانے پر آنا پسند نہ کریں۔"

"یہ آپ کی سوچ ہے' ویسے آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ کو ہمیں گھر چلنے کو کہنا چاہیے تھا۔"

"سوری مس! اب چلیں آپ کو غریب خانہ اس قابل نہیں کہ۔۔۔"

"ہم بھی کوئی جدی پشتی' دولت مند لوگ نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق بھی متوسط گھرانے سے ہے اور اب بھی ہم کوئی رئیس نہیں ہیں۔ یہ گاڑی میرے بھائی کی ہے۔ جو دیار غیر میں نہ جانے کتنی محنت کر کے اپنی فیملی کو سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔"

فاطمہ گاڑی سے باہر آگئی تھیں۔ میں مزید شرمندہ ہوا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دادی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"ارے یہ اچھا کیا بیٹا! کہ تم اسید کے ساتھ آگئیں۔ وہاں تو تم سے ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو پائی تھی۔ اللہ' آفتاب بیٹے کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔"

اور یہ بزرگ بھی خوب ہوتے ہیں لمحوں میں اجنبیوں سے بے تکلف ہو کر رشتے جوڑ لیتے ہیں۔ دادی بھی ایسی ہی تھیں اور ایک میں تھا۔ مجھے تو کسی سے بے تکلف ہونے میں بہت وقت لگتا تھا۔ انہیں دادی کے پاس چھوڑ کر میں بیٹھک میں آیا اور اپنی الماری سے وہ پیکٹ نکالا جو آفتاب حسین نے مجھے دیا تھا۔

وحید فوراً" ہی پیپسی گلاسوں میں ڈال کر لے گیا۔

وحید اور سعید تینوں ہی کچن اور گھر کے کاموں میں دادی کا ہاتھ بٹاتے تھے جب کہ مجھے ذرا بھی ان کاموں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دادا بھی اکثر کچن میں دادی کے پاس بیٹھے کبھی انہیں پیاز کاٹ کر دے رہے ہوتے۔ کبھی آلو اور سبزی کاٹی جا رہی ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دادی پر اس عمر میں بہت ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ پھوپھی کا گھر نزدیک تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی آکر ہاتھ بٹا جاتیں۔ خاص طور پر جب دادی بیمار ہوتیں ان کے تین بچے تھے دو بیٹیاں ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی تو آمنہ کی ہی ہم عمر ہوگی۔ یا کچھ کم۔ بی اے کی طالبہ تھی۔ اس کی وجہ سے بھی دادی کو آسانی ہو گئی تھی وہ جب بھی فارغ ہوتی دادی کے پاس آجاتی۔

"سعید بیٹا! ذرا عاشی کو بلا لو' کتنا مہمان آئے ہیں۔"

میں نے صحن میں دادی کی آواز سنی اور ساتھ ہی

فاطمہ کی آواز آئی۔

"پلیز خالہ جان! کوئی تکلف وغیرہ مت کریں۔" پتا نہیں دادی نے کیا کہا تھا۔ میں نے سنا نہیں اور واپس بیٹھک میں آگیا۔ سعد، عاشی کو بلا لایا تھا۔

اور جب کچھ دیر بعد فاطمہ اور آمنہ جا رہی تھیں تو میں نے دیکھا عاشی اور آمنہ میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ بلکہ ایک دوسرے سے ایڈریس اور فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہو رہا تھا۔

"یہ لڑکیاں بھی بس۔"

اب بھلا ایک کراچی میں رہنے والی لڑکی اور ایک لاہور کی لڑکی کی ایک دوسرے سے دوستی کرکے کیا کرے گی۔

میں انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ عاشی بھی نئی نئی دوستی نبھانے کو ساتھ تھی۔ وہ دونوں آگے آگے جا رہی تھیں جبکہ فاطمہ اور میں کچھ پیچھے تھے۔

"آفتاب نے آخری دنوں میں بھی میرے متعلق کوئی بات کی؟"

انہوں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔" میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ "آپ کی ذہانت کی، آپ کی سوچ کی، آپ کے خیالات کی، مرنے سے چند منٹ قبل انہوں نے نایاب اور سنی بابا کو یاد کیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے سنی بابا کے لیے ضرور دعا کیا کروں اور کہا تھا اگر کبھی آپ سے میری ملاقات ہو جائے تو آپ سے بھی درخواست کروں کہ ان کی اور سنی بابا کی مغفرت کی دعا کریں کہ ان کے لیے تو دعا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

اور پھر گاڑی تک خاموشی رہی۔ واپس آتے ہوئے عاشی مسلسل بول رہی تھی۔

"آمنہ بہت اچھی ہے۔ آپ کو نہیں پتا، اسید بھائی! کہ مجھے آمنہ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ پتا ہے۔ وہ بہت اچھے افسانے لکھتی ہے۔ میں نے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ اس کے بچے اور فاطمہ آنٹی بھی بہت اچھی ہیں، انہوں نے میری بنائی ہوئی چائے کی بہت تعریف کی لیکن وہ جل ککڑ سعید فوراً بول [illegible] دم تو میں نے کی تھی۔ اس نے تو صرف [illegible] ہے۔ میری تعریف سے ہمیشہ جل جاتا ہے۔"

سعد، عاشی اور راحیل یوں ہی ایک دوسرے [illegible] لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور تینوں میں دوستی [illegible] تھی۔ اور۔۔۔

☆ ☆ ☆

پھر کئی دن گزر گئے۔ میں نے دفتر جانا شروع [illegible] تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا [illegible] میں وہ سب کچھ کر سکوں گا جس کی خواہش آفتاب حسین نے کی تھی۔ نہیں۔ یہ میرے بس کی [illegible] نہیں۔ اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور [illegible] جیسا بندہ جس کا کوئی مددگار نہیں، وہ بھلا کیا کر [illegible] ہے۔ میں کبیر سے کہوں گا کہ میں یہ ذمہ داری [illegible] اٹھا سکتا۔ تم مہربانی کرو اور یہ مکان بھی کسی ادار[ے] ڈونیٹ کردو۔ اور مجھے معاف کردو۔ میں فیصلہ [illegible] کئی دنوں کے بعد مطمئن ہوا، تو مجھے اس آر[ٹیکل کا] خیال آیا جسے میرے ایڈیٹر نے چھاپنے سے انکار [کیا] تھا۔ میرا خیال ہے مجھے دوسرے اخبارات [سے] رابطہ کرنا چاہیے۔

اس روز اور اس سے اگلے کئی روز تک میں [نے] اخبارات سے بات کی لیکن سب نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے اخبار کے [illegible] آگ لگادی جائے اور یہاں توڑ پھوڑ کی جائے۔" ایک صاحب نے کہا۔

ایک اور اخبار کے ایڈیٹر نے جواب دیا۔ "صاحب [illegible] ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہمیں ان [کا] مستقبل عزیز ہے۔"

میں بے حد مایوس سا گھر آیا تھا اور صحن میں [illegible] چارپائی پر بازو کا تکیہ بنائے لیٹ گیا۔ اور یہ [illegible] مشکل ہے ہر آدمی کی اپنی ترجیحات ہیں اور [illegible] میں نے یوں ہی خوامخواہ اتنی تحقیق کی۔ ہاں اگر [illegible] اخبار ہوتا تو میں اپنی مرضی سے جو چاہے چھاپ لیتا۔

ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔

"نہیں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اسید!" دادا بے حد چپکے سے آکر میرے پاس بیٹھے تو میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"دادا! آپ۔۔۔؟"

"تم کچھ پریشان ہو بیٹا؟"

"ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"

وہ ذرا سا مسکرائے۔

"مجھے بتاؤ شاید مجھ بڈھے کی عقل میں کوئی بات سما جائے۔"

میں چند لمحے دادا کے شفیق چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر میں نے وہ سب جو سوچ رہا تھا دادا کو بتا دیا۔

"دادا جان! ہم اتنے بزدل کیوں ہیں؟ ہم حقائق سے کیوں منہ پھیر لیتے ہیں۔"

"مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹا!"

"کیسی مجبوریاں۔" میں نے ایک شکوہ بھری نظر ان پر ڈالی۔

"کئی قسم کی بیٹا! ہر شخص اپنی مجبوریوں کے حصار میں قید ہوتا ہے، ہو سکتا ہے جن لوگوں کو تم بے نقاب کرنا چاہتے ہو، وہ اتنے پاور فل ہوں کہ لوگ ان کی طاقت سے ڈرتے ہوں کہ وہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔"

"پھر یہ مجبوری تو نہ ہوئی نا بزدلی ہوئی۔"

"اپنے اپنے اندازِ فکر کی بات ہے بیٹا! ہو سکتا ہے ان کے نزدیک یہ بزدلی نہ ہو۔ مصلحت اور عقل مندی ہو۔"

"اور پھر بابا! یہ کالی بھیڑیں کیسے ان کی شناخت ہوگی۔ کیسے ملک کو ان سے بچایا جا سکے؟"

"ہاں۔ یہ بات تو سوچنے کی ہے کہ کیسے ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے اس ملک کو بچایا جائے جو اسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"خیر۔۔۔!" انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا۔ "تم اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ ضروری تو نہیں تم انہیں بے نقاب کرو، کسی اور طرح ان برائیوں کے خلاف لکھ کر جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اپنا فرض ادا کر سکتے ہو۔"

"پتا نہیں دادا جان! مجھے کیا کرنا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور وہ آفتاب حسین کہتے تھے۔ قلم کی حرمت کو کبھی نہ بیچنا۔ کبھی سچ لکھتے ہوئے ڈرنا مت روشنی پھیلاتے رہنا۔"

"اچھے آدمی تھے آفتاب حسین، بہت محبت کرنے والے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ بہت کم ملاقاتیں ہوئیں لیکن بہت اپنے اپنے سے لگتے تھے۔ گئے تو یوں لگا جیسے اپنا بچہ رخصت ہوتا ہے تو دل درد سے بھر جاتا ہے۔" وہ افسردہ سے ہو گئے تھے۔

"دادا جان! آپ کو کیا پتا۔ وہ اچھے آدمی تھے یا برے۔"

میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"کیوں! کیا وہ تمہیں برے لگتے تھے؟ تمہارے ساتھ کیا برائی کی تھی انہوں نے؟ پھر وہ اگر برے تھے تو تم اتنا روئے کیوں تھے۔ اتنے افسردہ کیوں ہو اب تک؟"

"نہیں میرے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی انہوں نے۔" میں سٹپٹا گیا۔

"لیکن دادا جان! وہ وہ نہیں تھے جو نظر آتے تھے۔"

"اچھا پھر۔۔۔" دادا نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کیا تھے وہ؟"

"دادا جان!" مجھے لگا جیسے میرے دل پر بہت بھاری بوجھ دھرا ہو اور میں بولتا چلا گیا۔ پہلی ملاقات سے لے کر آخری لمحے تک۔ دادا خاموشی سے بیٹھے رہے۔

"میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا شاید میں ان سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن جب وہ بیمار ہوئے اور جب میں ان کے آخری دنوں میں ان کے پاس رہا تو مجھے لگا جیسے میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہے دادا جان! وہ جھوٹ سے، ریا سے، دھوکے سے نفرت کرتے تھے پھر بھی وہ ہی سب کچھ کرتے

رہے کیوں؟“
کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بنے بنائے راستے پر چلتا ہی چلا جاتا ہے وہ اپنے لیے کوئی الگ راستہ تلاشتا نہیں بس جو اس کے بزرگ اس کے لیے راستہ بنادیتے ہیں وہ اسی پر چل پڑتا ہے۔“

”لیکن اس کا اپنا دماغ اپنی سوچ بھی تو ہوتی ہے دادا جان! وہ خود بھی تو فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ غلط ہے یہ صحیح ہے۔“

”ہاں ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ آفتاب حسین کے پاس نہ زندہ رہنے کا کوئی جواز تھا نہ زندگی کا کوئی نصب العین۔ نایاب نہیں رہا تھا۔ فاطمہ بھی نہیں تھی تو.....“

دادا جان ان کی وکالت کررہے تھے۔ یہ آفتاب حسین بھی جادوگر تھے پورے۔ کیسے دادا جان اور سب گھر والوں کو اسیر کرگئے تھے۔ یہ محبت تھی جو دادا جان کے لہجے سے جھلک رہی تھی آفتاب حسین کی محبت لیکن غلط وہ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ اگر سنی بابا ان کے لیے کوئی روشن راستہ بناتے تو پھر وہ اسی ڈگر پر چل پڑتے لیکن وہ تو خود اندھیرے رستوں کے مسافر تھے پھر آفتاب حسین کے لیے کوئی روشن رستہ کیسے چھوڑتے، سو وہ بھی اندھیروں کے ہی مسافر بن گئے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو اپنے بڑوں کی غلطیوں کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ کاش سب والدین اپنے بچوں کے لیے صراطِ مستقیم کا ورثہ چھوڑیں اور اگر ایسا ہوجائے تو سب سنور جائیں پھر بھی اگر کوئی بھٹک جائے تو یہ اس کی تقدیر لیکن ہوتا یوں ہے کہ والدین نہ حرام و حلال کا فرق بتاتے ہیں۔ نہ غلط صحیح کا ادراک دیتے ہیں نہ جھوٹ سچ کی تمیز سکھاتے ہیں۔

اور.....

”تمہیں چاہیے اسید! کہ وہ عہد جس کا وارث تمہیں آفتاب حسین نے بنایا ہے وہ ضرور پورا کرو۔“
انہوں نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔
”لیکن دادا جان! یہ ناممکن ہے میں سمجھتا ہوں۔“

”کچھ بھی ناممکن نہیں میری جان!“ انہوں نے میری بات کاٹی۔ ”تم کوشش تو کرو۔ اگر ناکام ہوگئے تو کم از کم روزِ محشر ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوگے کہ تم نے عہد پورا کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔“

وہ مسکرا رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے [illegible] ہوا اور میں نے سوچا کہ کوشش کرلینے میں حرج کیا ہے۔ آخر یہ میرا خواب بھی تو تھا بڑا رائٹر اور بڑا [illegible] بننا۔ کیا پتا تقدیر نے مجھے اسی لیے آفتاب حسین سے ملایا ہو۔

☆ ☆ ☆

اور پھر جدوجہد کی ایک لمبی طویل داستان ایک اخبار نکالنا۔

اور اخبارات کے ہجوم میں اس کی پہچان اور شناخت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کئی دفعہ مایوس ہوا۔ کئی بار ہمت ہار دی۔ لیکن حوصلہ بڑھانے والے بہت تھے۔

دادا جان میرے سب سے بڑے سپورٹر تھے اور پھر ہولے ہولے اس قافلے میں دوسرے بھی شامل ہوتے گئے۔

صدف، احمر کی کزن اور منگیتر۔

☆ ☆ ☆

اس روز میں احمر کے دادا اور والدہ سے ملنے گیا تھا۔ میری عادت تھی کہ میں مہینے میں ایک دو چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کے دادا جان اور والدہ خوش ہوجاتے۔ احمر ان کا واحد اثاثہ تھا۔ اور اسے کھو کر وہ کتنے تہی داماں ہوگئے تھے۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے احمر بے تحاشا یاد آتا اور میری آنکھیں جلنے لگتیں۔

احمر نوید۔
اس کے خواب۔
اس کے آدرش۔

اس روز میں پورے دو ماہ بعد ان کی طرف گیا تھا۔

انہوں نے گلہ نہیں کیا تھا لیکن میں شرمندہ تھا کہ اپنی مصروفیت میں انہیں بھلا بیٹھا تھا۔
”بہت معروف تھا بابا جان! اخبار نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ کررہا ہوں۔“
”آپ اخبار نکال رہے ہیں؟“
صدف تھی جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ احمر کی وفات کے بعد تین چار بار اس کے گھر میں میری ملاقات اس سے ہوچکی تھی۔
”ہاں کوشش کررہا ہوں۔“
”میری مدد کی ضرورت ہو تو...؟“
اور مجھے یاد آیا احمر نے کہا تھا۔ وہ بہت مخلص کارکن ثابت ہوگی۔
”مثلاً“ آپ کیا مدد کرسکتی ہیں؟“ میں یونہی پوچھا۔
”میں لکھ سکتی ہوں۔ طنز و مزاح، سنجیدہ ہر طرح کا۔ احمر اور میں اکثر خواب دیکھتے تھے کہ ہم اپنا ایک میگزین نکالیں گے اور اس میگزین میں ہم کیا کیا شامل کریں گے، وہ ایک پیور تفریحی میگزین نہیں ہوگا اس میں...؟“
وہ بول رہی تھی اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہی سوچ، وہی خیالات جو احمر کے تھے۔ برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد۔ اتحاد کی کوشش۔ محبتوں کا پرچار وہ یہ سارے کام اپنے قلم سے لینا چاہتی تھی، بالکل احمر کی طرح۔
بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا۔ بابا جان اور ماں جی کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ وہاں موجود ہم سب احمر کی یادوں میں گھر گئے تھے۔
”او کے!“ میں نے سب کو احمر کی یادوں سے باہر لانے کی کوشش کی۔ ”میرے اخبار میں آپ کی نوکری پکی۔ دو چار روز تک ڈیکلریشن مل جائے گا تو میں آپ کو انفارم کردوں گا۔“
اس نے سر ہلا دیا۔ میں نے دیکھا باوجود ضبط کے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔
”کیا خیال ہے Pay وغیرہ بھی طے کرلیں ابھی ویسے آپ کی ڈیمانڈ کیا ہوگی؟“ میں اسے اس فیز سے نکالنا چاہتا تھا۔
ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور وہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔
آمنہ شاہ، فاطمہ کی بیٹی، عروج اس کی دوست، آمنہ اور عاشی کی دوستی ہوچکی تھی اور عاشی اسے سب خبریں دیتی رہتی تھی۔
”اسید بھائی! آمنہ کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے اخبار میں اس کی کہانیاں بھی شائع کریں۔ کریں گے نا!“
”پاگل! اخبار میں کہانیاں نہیں چھپتیں۔“ سعید نے اسے ٹوکا تھا۔
”سنڈے میگزین میں تو چھپتی ہیں نا تو وہ سنڈے میگزین کے لیے بھیج دیا کرے گی۔“
لیکن وہ جو ستر ستر صفحے کی کہانیاں لکھتی ہے نا وہ سنڈے میگزین میں نہیں چھپ سکتیں۔“
”تو وہ مختصر لکھ لے گی۔“
دونوں بحث کرنے لگے تھے لیکن پھر یوں ہوا کہ آمنہ کے پپا کراچی کے حالات سے گھبرا کر لاہور شفٹ ہوگئے جب میرے اخبار کی پہلی کاپی آئی تھی تو وہ لاہور آچکی تھی۔ اور جگمگاتی آنکھوں والی وہ لڑکی بہت ایکسائٹڈ تھی اور میرے اخبار کے آفس میں بیٹھ کر صدف اور عروج کے ساتھ اس نے مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔ عروج اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی۔
پھر حامد تھا، بے حد ذہین اور جینئس۔ خود بخود ہی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ ہم سب ایک جیسی سوچ رکھنے والے تھے۔
”نوید سحر“ اخبار کا یہ نام آمنہ نے تجویز کیا تھا اور پتا نہیں کیا بات تھی کہ جب عاشی نے کہا کہ آمنہ کہہ رہی ہے کہ اخبار کا نام ”نوید سحر“ رکھ لیں۔ تو میں نے اسے او کے کردیا حالانکہ سعید، راحیل اور صدف نے کئی اور نام بھی تجویز کیے تھے۔ جلد ہی ہمارے اخبار کا ایک نام بن گیا تھا۔ ہم سب بہت محنت کرتے تھے۔
آمنہ نے خواتین کا صفحہ سنبھال لیا تھا۔ صدف

حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتی تھی۔ اس کا مشاہدہ گہرا تھا اور حامد کرائم رپورٹر تھا اور اس کے علاوہ بہت اچھے فیچر لکھتا تھا۔ دفتر میں ان کے علاوہ بھی اور بہت سے لوگ تھے جو کسی بھی اخبار کو چلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ سب خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ گو ابھی سرکولیشن زیادہ نہ تھی پھر بھی مختلف حلقوں میں "نویدِ سحر" کا ذکر ہونے لگا تھا۔ خصوصاً "صدف" کا کالم اور حامد کے فیچر کے علاوہ میرا کالم بھی پسند کیا جا رہا تھا۔ اور اخبار کی سرکولیشن چند ماہ کے بعد اتنی ہوگئی تھی کہ نہ صرف اخبار کا خرچ نکل رہا تھا بلکہ سب کی تنخواہیں بھی کچھ نہ کچھ نکل رہی تھیں۔ سب بے حد پُرامید اور پُرجوش تھے۔

ہفتہ وار میگزین ہم سنڈے کے بجائے فرائی ڈے کو شائع کرتے تھے۔ حامد کا خیال تھا کہ سنڈے کو سب ہی اخباروں کے سنڈے میگزین چھپتے ہیں ہمیں فرائی ڈے — کو میگزین نکالنا چاہیے۔ اس سے سرکولیشن پر اثر پڑے گا۔ سو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

اخبار نکلتے سال سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اور ہم نے اس سال بھر میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میں نے ایک روز آفس میں بیٹھے بیٹھے سوچا اور کیا میں نے یہ اخبار اسی لیے نکالا تھا کہ چند خبریں، رپورٹیں اور چند کالم لکھ دوں بس۔ اس طرح تو اور بھی کئی اخبار تھے اور وہ آفتاب حسین اور احمر نوید سے کیا گیا وعدہ کیا ہوا؟ وہ برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد، وہ اپنے ملک کو دنیا کا ایک بہترین ملک بنانے کی کوشش۔

غداروں اور دشمنوں کے خلاف قلمی جہاد۔

"واہ اسید عبدالرحمن! تمہارے سارے دعوے بھی بس دعوے ہی تھے۔"

میں نے خود کو ڈپٹا۔ تب ہی آمنہ کلپ بورڈ اٹھائے آفس میں داخل ہوئی۔ میں نے بے دھیانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے لمحہ بھر کے لیے میری نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔ بلا کی ملاحت اور معصومیت تھی اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں اتنی جگمگاہٹیں تھیں کہ میں نے کسی اور کی آنکھوں میں اتنی چمک نہیں دیکھی تھی۔ میں نے نظریں جھکا لیں لیکن میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئی تھیں۔ پتا نہیں ایسا کیا تھا۔ جب کبھی میں اکیلا خالی الذہن سا لیٹا ہوتا تو آمنہ میرے تصور میں چلی آتی۔ کبھی ہنستی کھلکھلاتی صدف اور عروج سے ہنسی مذاق کرتی۔ کبھی حامد [illegible] اور مجھ سے سنجیدہ باتیں کرتی۔ میں کئی بار [illegible] آخر کیوں؟ کیا ہے اس لڑکی میں کہ میں اسے سوچتا ہوں لیکن کچھ تو تھا کہ میں اس سے متاثر ہو رہا تھا۔

"یہ دیکھو اسید! یہ میں نے مختلف چینلز پر ہونے والے ان پروگراموں کے متعلق لکھا ہے جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم بھارتی ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"

"موضوع اچھا ہے لیکن حسبِ معمول تم نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔" میں نے کاغذات کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بس لکھتے ہوئے پتا نہیں چلتا۔ لاؤ مجھے دو۔ میں اسے مختصر کرتی ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں پہلے۔"

ہم ایک سال سے اکٹھے کام کر رہے تھے اس لیے ہمارے درمیان اب آپ والا تکلف نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔

"آج عاشی نہیں آئی ابھی تک؟"

"وہ سعید کے ساتھ گئی ہے اس کے کالج میں کوئی فنکشن تھا وہاں۔"

"دونوں وہاں بھی لڑتے ہی رہیں گے۔"

وہ ہولے سے ہنسی اور میں اس کی ہنسی میں کھو گیا۔ اس کی ہنسی اس کے صبیح چہرے پر کتنی سج رہی تھی۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے خود کو ڈپٹا۔ تب ہی صدف بھی اندر آگئی۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہم آخر کیا کر رہے ہیں اسید!"

"جھک مار رہے ہیں۔" بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"تو یہاں جھک مارنے سے بہتر نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر جھک ماریں۔ تم جانتے ہو اسید! کہ میں نے تمہارے ساتھ کام کرنے کی خواہش کیوں کی تھی۔ اس لیے کہ مجھے تمہارے قلم کی بے باکی اور سچ پسند تھا لیکن تم نے تو جیسے قلم کو بند کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ جو تم لکھ رہے ہو، ایسا لکھنے کی تم سے امید تو نہیں تھی۔ مجھے وہی گھسے پٹے مردہ سے لفظ۔"

کمزور سا احتجاج

"تم نے کل کے اخبار میں جو اداریہ لکھا، وہ کیا تھا۔ ایک کمزور بچے کا بے کار احتجاج۔ جس سے تمہارے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔"

میں نادم سا ہوگیا۔ وہ صحیح ہی تو کہہ رہی تھی کے اخبار کے اداریے میں میں نے لاپتا افراد کے متعلق لکھا تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ انہیں تلاش کرے اور بس۔ واقعی یہ مردہ سے الفاظ تھے جو کسی دل میں حرارت پیدا نہیں کر سکتے تھے جو کسی زنجیر کو پگھلا نہیں سکتے تھے۔

ان لفظوں سے زیادہ اثر تو اس معصوم بچی کے الفاظ میں تھا جو اپنی ماں کے ساتھ ہمارے اخبار کے آفس میں آئی تھی ان بے جان لفظوں سے زیادہ طاقت ور تو وہ آنسو تھے جو اس بچی کی آنکھوں میں تھے۔

"انکل! مجھے اپنے ابو بہت یاد آتے ہیں۔ وہ تو بہت اچھے تھے، وہ بھلا دہشت گردوں کی مدد کر سکتے ہیں؟"

اس معصوم بچی کے باپ کو القاعدہ کی مالی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ یہاں اخبار کے دفتر میں موجود ہر شخص نے اسے تسلی دی تھی اس کے آنسو پونچھے تھے۔

وہ پوچھ رہی تھی۔

"انکل! آپ اپنے اخبار میں لکھیں گے تو کیا میرے ابو واپس آجائیں گے؟"

اور میرے پاس اس کی بات کا جواب نہ تھا۔ میں نے یونہی اسے تسلی دینے کے لیے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر جیسے رونق سی آگئی تھی۔ اور میں نے یونہی چند بے جان اور مردہ لفظوں سے سجا کر ایک اداریہ لکھ دیا تھا اور بس گویا ایک فرض ادا ہوگیا تھا۔ ہم زیادہ تر صحافی یہی تو کر رہے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس روز جیسے میرا ضمیر مجھے بار بار سرزنش کر رہا تھا۔

تب میں نے دراز سے سال بھر پہلے لکھا جانے والا آرٹیکل نکالا جسے کوئی بھی اخبار چھاپنے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ اس میں چند ایسے نام بھی تھے جو اعلا عہدے دار تھے۔ بڑے بزنس مین تھے اور میں نے آرٹیکل پر ایک نظر ڈالی۔

"آفتاب حسین ایک بڑے اخبار کا مالک بھی ان بڑوں میں شامل ہے۔"

میں نے اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھا۔ اور پھر اس جملے پر لکیر مار دی۔

جو چلے گئے ان کیا ذکر اور پھر اسی دراز سے وہ فائل نکالی جس پر میں نے وہ ٹاپک لکھ رکھے تھے جن پر مجھے لکھنا اور کام کرنا تھا۔ سال بھر میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہی مسائل تھے اور وہی پریشانیاں۔

وطنِ عزیز میں وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو سال بھر پہلے تھا۔ عوام کا استحصال اپنے ہی بندوں کا قتلِ عام وہی مسائل وہی عذاب۔

ابھی تک وانا میں قبائلیوں کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو پہلے تھا۔ وہی بے مقصد جنگ ایک بڑی طاقت کو خوش کرنے کے لیے جو جنگ 2003 میں شروع کی گئی تھی، وہ ابھی تک جاری تھی۔

وہی نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش۔

وہی لینڈ مافیا تھا۔

وہی منشیات کے اسمگلر تھے۔

وہی بچوں کی اسمگلنگ، انسانوں کی فروخت، رشوت، کرپشن۔

سب کچھ ویسا ہی تھا، کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

اور ہمیں ان سب کے خلاف اپنے قلم سے جنگ

کرتا تھی۔
شاید ہم اس نظام کو بدل نہیں سکتے تھے۔ رشتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔
ہم لالچ اور ہوس سے آلودہ دلوں میں قناعت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ایک کوشش تو کر سکتے تھے۔ اور میں نے یہ کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دادا کہتے تھے انسان کو اپنے حصے کا کام کر لینا چاہیے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دوسرا نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں۔ میرے ساتھ مخلص ساتھی تھے۔
محب وطن۔
اور دلوں میں کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے۔ سو میں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ جہاں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں۔
مشکلات تھیں۔ آبلہ پائی تھی لیکن مجھے اسی راستے پر چلنا تھا یہ طے ہو چکا تھا۔
اور اس کانٹوں بھرے راستے پر چلتے چلتے مجھے لگا کہ میرے اندر کہیں ایک تارا سا ٹمٹماتا ہے۔
ایک روشنی سی جگمگ کرتی ہے۔
اور یہ آمنہ کی محبت کی روشنی تھی جو کسی ٹھنڈے میٹھے احساس کی طرح تھکی ماندی زندگی کو حرارت بخشتی تھی۔
آمنہ شاہ۔
جو بہت پیاری اور کومل تھی۔ جس کے دل کا حسن اس کے حسین چہرے پر جھلملاتا تھا۔ اور خوب صورت اور ملیح چہرے پر کسی جھیل کے پانیوں کا عکس سوچوں کی روشن کرنوں سے چکا چوند کرتا۔
"تو میں آمنہ شاہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور یہ محبت ہے۔"
میں نے بے حد حیران ہو کر سوچا تھا اور اس انکشاف نے مجھے ششدر کر دیا۔
نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ اور میں.... میری زندگی تو ہر لمحہ داؤ پر لگی ہے۔ صبح و شام دھمکیاں۔ مار دینے کی۔ ختم کر دینے کی اور نہیں مجھے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے ساتھ اس کومل اور نازک سی لڑکی کو بھی کانٹوں پر گھسیٹوں۔ وہ جو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔
جو اتنی نایاب اور انمول ہے کہ کسی بھی کی Entire desire ہو سکتی ہے۔ اور مجھے بہت جنگ کرنا ہے اور اس جنگ میں کتنے زخم لگیں گے کتنے کانٹے چبھیں گے نہیں جانتا۔ تو یہ مقدر ٹھہری۔
مجھے لگا جیسے محبت کا پودا میرے دل میں اگا ہی تھا اس پر نارسائی کی پت جھڑ اتر آئی تھی۔ ملن کے پھول نہ تھے۔ کیونکہ میرا سفر طویل بھی تھا اور خار دار بھی اور وہ نازک اور کومل تو میں اس محبت کی آگ کو پانی کے چھینٹے مار مار کر بجھانے لگا جو خود بخود ہی میرے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اور میں نے قلم اٹھا لیا تھا۔ اور بے دھڑک لکھ رہا تھا۔ ان کے خلاف جو انسانوں کا خون چوسنے والے اور گوشت کھانے والے دیمپائر تھے۔
جو چند ٹکڑوں کے عوض اپنے ایمان ضمیر اور ملک کا سودا کر رہے تھے۔
جن کے اندر دھڑکتے دلوں میں سیاہیاں پیدا ہو گئی تھیں اور ان سیاہیوں نے ان کے چہرے مسخ کر دیے تھے۔ میں لکھنے میں مگن تھا اور میں نے محبت کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی۔
زندگی کے عجائب خانہ میں اترنا کوئی معمولی بات نہیں۔
کسی انجمن کی ہم رکابی کوئی عام بات نہیں۔ لیکن میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور سوچا تھا محبت میرے دل سے رخصت ہو گئی لیکن وہ تو ایسے ہی میرے دل میں موجود تھی اور آمنہ شاہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
"سنو اسید عبدالرحمٰن! تم محبت سے کتنا بھی نظر چراؤ۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ بولو کیا مجھے بھول جاؤ گے کیا میرے بغیر زندگی گزار پاؤ گے؟؟"
میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے سفر پر چلتے ہوئے اس محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ دل

صراط ہے جس پر مجھے اکیلے چلنا تھا۔ لیکن محبت بضد تھی کہ وہ بھی میرے ہمراہ نہیں رہے گی۔

☼ ☼ ☼

اور میں عروج مصطفیٰ ہوں' آمنہ کی دوست اور ماموں زاد بہن' مجھے آمنہ سے ہمیشہ ہی محبت رہی ہے اور میں نے ہمیشہ اسے آئیڈلائز کیا۔ شاید اس کی وجہ اس کی بے پناہ ذہانت ہے۔

اس کا رائٹر ہونا ہے۔

بہت کم عمری میں ہی اس نے خواتین کے پرچوں میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔

مجھے اس کی تحریر' اس کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ میں سوچتی تھی کاش میں بھی اس کی طرح لکھ سکوں۔ میری کہانیاں بھی خواتین کے پرچوں میں چھپیں اور لڑکیاں ان کے لیے تعریفی خط لکھیں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ شاید میں کبھی آمنہ جیسا نہ لکھ سکوں یا شاید کبھی لکھ ہی نہ سکوں جبکہ فاطمہ پھوپھو کہتی تھیں تم لکھ سکتی ہو۔ تمہارے اندر یہ صلاحیت ہے لیکن تم کوشش نہیں کرتی ہو۔

جب آمنہ لاہور آئی اور اس نے "نوید سحر" کو جوائن کیا تو میں بھی اس کے ساتھ جانے لگی۔ اسید نے میرے ذمہ خواتین کے صفحے کی ترتیب کا کام لگادیا تھا۔ میں بس خواتین کے صفحے کے لیے آنے والے اقتباسات شعر اور اقوال زریں ترتیب دیتی تھی گو میرا اپنا تو لکھنے کا کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں خوش تھی کہ میں ان لوگوں کے لیے کام کر رہی ہوں جو کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ سب مخلص اور محب وطن لوگ تھے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تھا' قلم جو ہاتھ میں ہو تو بولنے لگتا ہے۔ کبھی زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔

کبھی زخموں کو کریدتا ہے اور گہرا کرتا ہے۔

کبھی گیت گاتا اور لوریاں سناتا ہے۔

کبھی سوئے ہوئے کو جگاتا ہے۔

کبھی یوں گرجتا ہے کہ آدمی سہم کر رہ جائے دہل جائے۔

کبھی اتنا نرم و حساس کہ کسی بچے کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر رو پڑے۔

کبھی اتنا سخت اور بے رحم کہ لاشوں کے انبار پر ہنسے۔

نیرو کی طرح بانسری بجائے۔

اور اس ساری فسوں کاری کا محرک وہ ہاتھ جس میں قلم ہے۔

وہ ہاتھ اگر معتبر ہے تو وہ قلم بھی معتبر ہے۔ محترم ہے۔

اصل میں قلم' قلم رکھنے والے کے ظرف کو آزماتا ہے' اسے پرکھتا ہے۔ جانچتا ہے پھر اس کی مرضی پر چلنے لگتا ہے۔

گویا وہ آئینہ ہے ایسا آئینہ جس میں ایک عکس جھلکتا ہے' ایک ہی شبیہہ اترتی ہے۔

قلم عکس ہے قلم رکھنے والے کا۔

کم ظرف ہاتھ میں قلم کم ظرف و بے وقعت ہوجاتا ہے اور باظرف ہاتھ میں معتبر و محترم' سو آدمی کو پہچاننا ہو تو اس کے قلم کو دیکھو اس ہاتھ کو نہ دیکھو جس میں قلم ہے۔ سو قلم کی آبرو' ہاتھ کی آبرو اور ہاتھ والے کا وقار قلم کی آبرو' قلم تو بہت سے رکھتے ہیں پر قلم کی آبرو کا پاس کسی کسی کو ہے۔ قلم کا حق کوئی کوئی ادا کرتا ہے۔

ان بہت سارے ہاتھوں میں میرے ان سب دوستوں کے ہاتھ بھی شامل ہیں جو قلم تھامے ہوئے ہیں۔ تھامے رکھنا چاہتے ہیں جیسے بہت سارے چراغ اندھیری رات میں روشن ہیں اور تاریکی سے نبرد آزما ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ چراغ بجھ جائیں اور کچھ تند ہی باد مخالف میں بھی جلتے رہیں۔

قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے قلم آپ کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن قلم کی آبرو کون برقرار رکھتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ فی الحال تو آپ اس کہانی کو پڑھیے۔ یہ میری پہلی کہانی ہے۔ آمنہ شاہ کی کہانیاں پڑھ کر مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور آج آمنہ شاہ اور اسید عبدالرحمن کی کہانی لکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہانی پڑھ کر مجھے ضرور بتایئے گا۔ میری کہانی کا نام ہے "پل صراط۔"

☼ ☼ ☼

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟
تیرے باپ کا وہ کیا کرتی تھی؟
وہ تو کھیت میں چارہ چرتی تھی
ہاں جی کھیت میں چارہ چرتی تھی
سنو کھیت میں چارہ چرتی تھی

سعید ٹیبل پر پاؤں لٹکائے بیٹھا لہک لہک کر گارہا تھا۔

"تم ڈاکٹر بننے کے بجائے سنگر کیوں نہیں بن جاتے خدا کی قسم بہت کامیاب رہو گے۔"

فیصل نے جو اسید کے ایک آرٹیکل کی پروف ریڈنگ چیک کر رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"دراصل اسے خوف ہے کہ باقی سنگر اس کی سریلی آواز سن کر کہیں بھاگ ہی نہ جائیں۔"

حامد نے جو کچھ فیصلے پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا مڑ کر سعید کی طرف دیکھا۔

"ویسے اس کا ٹیسٹ بھی بہت اعلا ہے۔ نا عاشی!"

آمنہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونہ دانتوں تلے دبائے عاشی کو دیکھ رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے ڈیر سسٹر!" سعید ٹیبل سے نیچے اتر آیا۔

"ہائے وادے تمہیں کیا آج کالج نہیں جانا تھا؟"

حامد نے پھر پوچھا۔

"جانا تو تھا بلکہ جارہا ہوں' اس وقت تو عاشی کو چھوڑنے آیا تھا۔"

"اچھا!" آمنہ نے اچھا کو لمبا کیا اور معنی خیز نظروں سے عاشی کو دیکھا لیکن عاشی اس کے اس طرح دیکھنے سے یک دم سرخ پڑ گئی۔

"یہ عاشی کو ڈراپ کرنے اور پک کرنے کی ذمہ داری تم نے کیوں اٹھا رکھی ہے' یہ اسید کے ساتھ بھی تو آسکتی ہے؟"

"دراصل ...!" وہ دائیں کان کی لو مروڑنے لگا۔

"اسید ہے سحر خیز اور یہ محترمہ اٹھتی ہیں دوپہر کو اور اسید ان کے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔"

"جھوٹ مت بولو میں ساڑھے آٹھ تک اٹھ جاتی ہوں۔"

"اور ناشتا کرتے' تیار ہوتے نو بج جاتے ہیں۔"

سعید نے اس کی بات کاٹی۔ "جبکہ اسید ساڑھے سات گھر سے نکل پڑتا ہے تو ان محترمہ نے مجھ سے دست بستہ عرض کی تھی۔ پلیز سعید! تم تو نو بجے جاتے ہو نا' مجھے بھی ڈراپ کرجایا کرو۔"

اس نے باریک آواز میں عاشی کی نقل اتاری۔

"کوئی بھی نہیں۔" عاشی جھینپ گئی۔

"ویسے یہ سب لوگ تو کوئی کام کرنے آتے ہیں۔ تم کس لیے آتی ہو؟ کیا دل بہلانے۔" وہ شرارت سے عاشی کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں کیا؟" عاشی چڑ گئی۔ "تم بہلاؤ اپنی "فل فلوٹی" کا دل۔"

"میری فل فلوٹی۔" اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"ہائے سوئٹی فل فلوٹی کہاں تھی وہ۔ قریب جاکر جو دیکھا تو کھلی کھلا رہی تھی۔"

فیصل بے اختیار ہنسا۔

"تمہیں بھینسوں سے بہت دلچسپی ہے سعید! تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر گوالے بن جاؤ۔ ایمان سے دودھ تو خالص ملے گا۔ ورنہ دودھ کے نام پر جو محلول آج کل مل رہا ہے نا' وہ ضرور کسی موذی مرض میں مبتلا کردے گا۔"

آمنہ نے قلم ٹیبل پر رکھ کر بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ہائے بہنا! کیا بتاؤں کتنی حسین لگتی ہیں یہ مجھے۔ سیاہ آبنوسی رنگت پہ مڑے ہوئے سینگ' ان کے حسن کا کیا کہنا اور پھر چال کا بانکپن' آپ کو کیا پتا۔ ہائے کچھ کی کتنی ہی بھینسوں میں دل اٹکا ہوا ہے میرا۔ دل چاہتا ہے اغوا کرلوں۔ دودھ تو خالص ملے گا۔"

آخری بات اس نے آہستگی سے کہی تھی۔

سب ہی ہنس رہے تھے اور عاشی سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

"تمہیں تو "بھینسوں" کی سوسائٹی کی طرف سے ایوارڈ ملنا چاہیے۔"

تب ہی دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ پیشانی پر لکیریں ڈالے ایک شخص اندر داخل ہوا۔ سب خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"فرمایئے!" سب سے پہلے حامد کو ہی خیال آیا تھا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو"

"وہ کہاں ہے تمہارا بڑا اسید عبدالرحمٰن۔"

اس نے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اس ہال کمرے کے دائیں طرف والے کمرے پر چیف ایڈیٹر کی تختی دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

"وہ ابھی نہیں آئے آپ کو کیا کام ہے ان سے؟"

سعید بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کام!" وہ عجیب طرح سے ہنسا اور اپنا دایاں ہاتھ تنبیہہ والے انداز میں اوپر اٹھایا دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے پتھر جڑے تھے۔

"اس سے کہہ دینا کہ یہ جو بکواس وہ آج کل لکھ رہا ہے نا اپنے اخبار میں اسے بند کردے ورنہ..."

"ورنہ کیا ہوگا؟"

اب حامد اپنی جگہ کھڑا ہوگیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ورنہ۔" اس نے چٹکی بجائی۔ "یوں ہوگا... یوں لاش بھی نہیں ملے گی اس کی۔"

وہ پھر اسی طرح سے ہنسا تھا۔ عجیب سی سنسنی پیدا کرتی ہوئی ہنسی۔ عروج نے گھبرا کر آمنہ کی طرف دیکھا۔ جو ساکت بیٹھی تھی۔

"تم وہی ہونا ایک وزیر کے کارندے ایک بار اسپتال میں میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور وہ وہاں وی آئی پی روم میں داخل تھے اور تم ان کے پاس تھے۔"

لمحہ بھر کو وہ شخص خاموش ہوگیا اور پھر ایک استہزائیہ سی نظر اس پر ڈالی۔

"ڈاکٹر! تم اپنے کام سے کام رکھو، تمہیں کیا کہ میں کون ہوں اور کس کے ساتھ ہوں اور۔"

وہ حامد کی طرف مڑا۔

"کہہ دینا اس سے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہ پھیلائے ورنہ ہم ہاتھ باندھنا بھی جانتے ہیں اور توڑنا بھی اور تمہارے جیسے احمقوں کا یہ ٹولہ کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

پھر سب کو باری باری دیکھتا ہوا وہ جس طرح آیا تھا، اسی طرح باہر نکل گیا۔

"یہ... یہ کیا تھا سعید؟" عاشی اس کے جاتے ہی اٹھ کر سعید کے پاس آگئی۔ "یہ شخص اس طرح کیوں دھمکیاں دے رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

اس نے ایک تسلی آمیز نظر عاشی پر ڈالی۔

ویسے آج کل اسید کس موضوع پر لکھ رہا تھا۔

"آج کل وہ این جی اوز پر کام کر رہا تھا۔ وہ نام نہاد این جی اوز جو عورت کو حقوق دلانے کے نام پر حکومت اور دوسرے اداروں سے لاکھوں روپے کھا رہی ہیں۔

اور وہ این جی اوز جو دیہی علاقوں کی بھلائی کے نام پر وہاں بے ہودہ لٹریچر تقسیم کرکے گمراہی کو فروغ دے رہی ہیں۔

اور وہ این جی اوز جن کے کرتا دھرتا یہودی اور مسلمان دشمن لوگ ہیں جن کا مقصد اسلام کے متعلق غلط نظریات پھیلانا اور لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنا ہے۔"

صدف نے جواب تک خاموش بیٹھی تھی تفصیل سے بتایا۔

"ویسے اس وقت اسید ہے کہاں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے یہاں موجود ہوتا تھا۔"

آمنہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر بکھری پریشانی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔

"وہ کسی ڈاکٹر فہد علی سے ملنے گیا ہے۔ ناشتہ کرتے ہی نکل گیا تھا۔"

"یہ ڈاکٹر فہد کون ہے؟"

آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"معلوم نہیں۔" سعید نے کندھے اچکائے۔ "صبح وہ دادا جان کو بتا رہا تھا کہ میں ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں تو میں نے سنا۔"

"ڈاکٹر فہد دراصل ایک این جی او میں چار سال تک جاب کرتے رہے ہیں۔ سو درون خانہ کئی رازوں سے واقف ہیں۔ انہوں نے پہلا آرٹیکل چھپنے کے بعد خود ہی فون کیا تھا اسید کو اور بتایا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور لکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق کہ ان این جی اوز کی حقیقت کیا ہے؟"

صدف نے پھر تفصیل بتائی تب ہی ایک کمرے سے کیمرہ کندھے پر لٹکائے دلیر خان نکلا۔ دلیر خان بیس بائیس سال کا ایک بے حد جینئس فوٹو گرافر تھا۔ اس کا تعلق باجوڑ ایجنسی کے ایک گاؤں ڈمہ ڈولا سے تھا۔ سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ اگرچہ اسے یہاں جوائن کیے چند ماہ ہی ہوئے تھے ابھی پچھلے دنوں ایک عمارت میں جو آگ لگی تھی تو وہ تصویریں بنانے کے چکر میں عمارت میں بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ جس پر اسید نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ تصویروں سے زیادہ تمہاری زندگی ہمارے لیے اہم ہے دلیر!"

"فرض کے سامنے زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی سر! فرض کے لیے جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔"

اسے باہر آتے دیکھ کر حامد بھی اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر کھڑا ہوگیا۔

"اوکے تو پھر ہم چلتے ہیں۔"

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو بھئی؟"

"ایک تقریب کی کوریج کرنی ہے۔"

"کوئی سیاسی تقریب...؟" فیصل نے پوچھا۔

"ملی جلی۔"

"اوکے۔ زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے، اللہ حافظ۔"

فیصل نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

اس کی عادت تھی کہ جب کوئی باہر جاتا یا خود اسے کہیں جانا ہوتا تو یہ جملہ ضرور کہتا۔

"گھر سے باہر جانے والا شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس آئے گا یا کسی دھماکے کا شکار ہو جائے گا یا غائب کردیا جائے گا۔"

"اور تم... کیا تمہیں کالج نہیں جانا؟"

صدف نے پوچھا تو سعید نے جو فیصل کے کہے گئے جملے پر غور کر رہا تھا چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں میرا موڈ نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا فائنل ایر ہے سعید! اور تمہیں یوں لاپروائی نہیں کرنا چاہیے۔" صدف نے بڑی بہنوں کی طرح نصیحت کی۔

"تم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں بھی تمہاری فیلڈ میں آجاؤں۔" وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"نہیں، ہمارے ملک کو اچھے صحافیوں کی ہی نہیں اچھے ڈاکٹروں کی بھی ضرورت ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک وزیر کا بھلا این جی اوز سے کیا تعلق اور یہ شخص جو ابھی دھمکی دینے آیا تھا یہ..."

عاشی نے جو ابھی تک کھڑی تھی، کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"بڑی جلدی خیال آگیا ہے صفدر!" سعید تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ "دراصل یہ جو وزیر صاحب ہیں نا، ان کی این جی اوز والوں نے ان کی بھینسیں چرا لی تھی۔"

"خبردار، جواب تم نے بھینس کا نام لیا۔" عاشی نے اس کے بازو پر مکا مارا۔

"ویسے یہ ڈاکٹر فہد رہتا کہاں ہے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" سعید نے کندھے اچکائے۔

"تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا جبکہ اسید کو ایک بار بقول تمہارے ہی گاڑی سے کچلنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔"

"ریلیکس آمنہ! کچھ نہیں ہوتا، آجائے گا ابھی۔"

صدف نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو دیکھیں ذرا 'صفدر صاحب نے "سرخیاں" بنالیں۔ اسید نے کہا تھا نا ایک نظر دیکھ لینا۔"

تب ہی سعید کے سیل کی بیپ ہوئی اس نے پاکٹ سے فون نکال کر دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"اوہ... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج تو نورین نے ہم سب فرینڈز کو ٹریٹ دینا تھی اپنی برتھ ڈے کی اسی کی مس کال ہے۔ اوکے میں چلا۔"

"تحفے میں بھینس دے دینا۔"

عاشی نے پیچھے سے آواز دی تو دروازہ کھولتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تمہارے مشورہ اچھا ہے لیکن میرے جیسا غریب اسٹوڈنٹ بھینس کی تصویر دے سکتا ہے بھینس نہیں اور ہاں۔" اس نے انگلی اٹھائی۔ "اب تم نے بھینس کا ذکر کیا ہے میں نے نہیں۔"

اور عاشی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے باہر نکل گیا اور اس کے جانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ اندر دوسرے ہال میں بھی اخبار سے متعلق لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن آمنہ قلم ہاتھ میں تھامے خالی الذہن سی بیٹھی تھی۔

یہ اسید نے کس خار زار میں قدم رکھ دیا ہے۔

گو ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے اس نے اپنی پہچان کروالی تھی اور ان چند ماہ میں اخبار کی سرکولیشن مزید بڑھی تھی۔ کئی بڑے اخباروں میں تبصرہ کیا گیا تھا کہ "صبح نو" کے بند ہو جانے سے جو خلا ہو گیا تھا۔ "نوید سحر" نے اس کی کمی بہت حد تک پوری کردی ہے۔

پھر بھی یہ ہر لمحہ خوف کی زندگی۔

کتنی دھمکیاں دی جاتی تھیں اسید کو۔

بھلا زندگی کو یوں داؤ پر لگانا عقل مندی تو نہیں ہے نا! اب جو اسید نے منشیات اور بھکاریوں پر لکھا تو کیا یہ سب ختم ہو گیا؟ یا اب یہ این جی اوز ختم ہو جائیں گی یا اس سے پہلے جو کالے جادو کرنے والوں کے خلاف اتنے آرٹیکل اتنے انٹرویو چھپے۔ اتنے لوگوں نے اظہار خیال کیا تو یہ لوگ کام چھوڑ کر چلے گئے کہیں؟ ان کا کاروبار تو پہلے سے بھی زیادہ چمک رہا ہے اور ہر اخبار میں کیبل پر دیواروں پر ان کے اشتہارات کی بھرمار ہے۔ میں کہوں گی اسید سے کہ چھوڑ دے سب۔ کیا ضرورت ہے خوامخواہ مصیبتیں مول لینے کی۔ جب زندگی سیدھے سادے راستے پر چلتے ہوئے سکون سے گزر سکتی ہے تو پھر کیوں آدمی ٹیڑھے راستے اپنائے۔ وہ تو اپنے افسانوں کے کرداروں جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

سبک رو ندی کی طرح۔

دھیرے دھیرے بہتی زندگی۔

جس میں محبت اور خوشی کے رنگوں کی ہلچل ہو اور بس...

اس نے یہ سب سوچا تو تھا لیکن جب اسید آفس آیا تو وہ اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بہت پرجوش تھا۔

"ڈاکٹر فہد نے جو انکشافات کیے ہیں' وہ بہت حیران کن ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں صدف! کہ ان این جی اوز کے پوشیدہ مقاصد کیا ہیں؟ یہ یہاں ہمارے ملک میں کیا انقلاب لانا چاہ رہے ہیں۔"

اس نے مختصراً "فہد سے معلوم ہو جانے والی باتیں بتائی تھیں۔ وہ سب خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے تھے اور جب اس نے بات مکمل کرلی تو فیصل نے اسے آفس میں آنے والے شخص اور اس دھمکی کے متعلق بتایا جو وہ دے گیا تھا۔

"ہوں۔" اسید نے سر ہلایا۔ "ایسی دھمکیاں تو بہت دنوں سے مل رہی ہیں۔ میں نے جب اس خار زار میں قدم رکھا تھا تو میں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں ہے۔ جان بھی جاسکتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کرنا ہے کہ میں نے اس کا عہد کیا ہے۔ اخبر سے اور آفتاب حسین سے کہ میں اپنے آخری سانس تک برائیوں کے خلاف جہاد جاری رکھوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

"ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اسید!" صدف نے ذرا "کہا۔

"تم سب!" اسید نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"فیصل! آمنہ' عاشی' عروج! تم سب چاہو تو کہیں کسی اور اچھے اخبار میں جاب کرسکتے ہو۔ حامد اور دلیر کو بھی میرا پیغام دے دینا۔ حامد کے سیاسی تبصرے اتنے زبردست ہوتے ہیں کہ کوئی بھی اخبار اسے بخوشی قبول کرلے گا۔ فیصل کے فیچر صدف اور آمنہ کے سروے تم سب کا اتنا نام ہو چکا ہے کہ کہیں بھی تمہیں اچھی جاب مل سکتی ہے اور آمنہ کا تو خیر پہلے ہی ایک مقام ہے۔ ایک نام ہے ادب کی دنیا میں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو اسید عبدالرحمٰن! کہ صرف تم ہی ایک سچے اور بے باک صحافی ہو اور ہم سب قلم کی حرمت بیچنے والے۔"

آمنہ کو نہ جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔

"ہم اگر بزدل ہوتے تو اسی روز تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے جب تم نے یہاں اسی کمرے میں ہم سے کہا تھا کہ اب تم وہ لکھو گے جس کے لیے ہم نے یہ اخبار شروع کیا تھا' تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن تم نے بہت اچھی طرح سے ہر بات ہر خطرے اور ہر مشکل کی وضاحت کردی تھی۔"

اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری آمنہ! شاید تم میری باتوں سے ہرٹ ہوئی ہو۔ لیکن میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں وہ سب بتادوں جو تم نہیں جانتے۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا مشکل کام ہوگا اور اس طرح قدم قدم پر مجھے روکا جائے گا اور مجھے دھمکیاں دی جائیں گی۔ کبھی قتل کی دھمکی۔ کبھی اخبار کا ڈیکلریشن ضبط کروانے کی دھمکی اور کبھی پیسے سے خریدنے کی دھمکی۔ میں سچ مچ نہیں چاہتا کہ تم لوگ کسی مشکل میں پڑو۔"

"تو تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسید!" عاشی نے احمقوں کی طرح کہا۔ "کیا صرف ہماری زندگیاں قیمتی ہیں تمہاری زندگی قیمتی نہیں۔"

اوہ عاشی! کیا سعید نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ دادی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بلا رہی تھیں۔"

اسید کو اب یاد آیا تھا کہ عاشی کو تو آج گھر ہونا چاہیے تھا۔

"نہیں تو۔" عاشی نے انکار کیا۔ "وہ ہے ہی بھلکڑ۔ پتا نہیں میڈیکل کی اتنی بڑی بڑی کتابیں کیسے رٹ لیتا ہے۔ خیر میں ابھی چلی جاتی ہوں۔"

"اب کیسے جاؤ گی اکیلی۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔"

"اچھا!" عاشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ موضوع بدل گیا تھا۔

"مجھے آج جلدی جانا ہے۔" آمنہ کھڑی ہو گئی۔

"میں اسے ڈراپ کرتی جاؤں گی۔"

"ناراض ہو کر جا رہی ہو؟" اسید بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"نہیں۔ آج ماما کے ساتھ جانا تھا کہیں۔" آمنہ کی آنکھوں میں یک دم روشنی سی کوندی تھی۔ تو اسے' اسید عبدالرحمٰن کو اس کا احساس ہے۔

"تھینکس۔" اسید اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

اور آمنہ عروج اور عاشی باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"کچھ محبتیں آہستہ آہستہ سرائیت کرجاتی ہیں اور کچھ محبتیں بند دروازے کھول کر زبردستی دل میں گھس کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پلک جھپکتے میں جب احساس ہوتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے تب تک دل اور روح کے تمام خلا پر ہو چکے ہوتے ہیں لیکن خالی خولی محبت دل میں اتر آنے سے بھی کہیں زندگی سہل ہوئی ہے۔"

"یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟" عروج نے آمنہ کے کندھے پر سے جھکتے ہوئے پڑھا۔

"افسانے بھی تو حقیقتوں سے جنم لیتے ہیں نا عروج!" آمنہ نے فائل بند کردی تو عروج اس کی کرسی

کی پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

"بہت دنوں سے تمہارا کوئی نیا افسانہ نہیں آیا۔ کیا یہ کوئی نیا افسانہ لکھ رہی ہو۔"

"نہیں۔" آمنہ مسکرائی۔ بس یونہی قلم چلا رہی تھی۔

"تمہاری قارئین تمہیں مس کر رہی ہیں۔ کب لکھ رہی ہو نیا افسانہ؟"

"پتا نہیں۔" آمنہ نے پیشانی پر آجانے والے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو زندگی میرا افسانہ لکھ رہی ہے پتا نہیں اس کا اینڈ ٹریجک ہو گا یا خوش گوار۔"

"آمنہ! ایک بات پوچھوں!" عروج نے بغور اسے دیکھا۔

"پوچھو؟" آمنہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم...... تم اسید عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہو؟"

ایک لمحہ کو آمنہ چپ سی اسے دیکھتی رہی۔

"ہاں شاید۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اسے شاید محبت ہی کہتے ہیں۔"

وہ ہولے سے ہنسی۔

"اپنے ڈھیروں ڈھیر افسانوں میں محبت کا ذکر کرنے کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں محبت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھ سکتی۔ پتا نہیں یہ محبت ہے 'انسیت ہے' لگاؤ ہے' احترام ہے یا کیا؟ لیکن عروج مصطفیٰ میں اس شخص اسید عبدالرحمٰن کو بہت سوچتی ہوں۔ جب میں نے اسے دیکھا نہیں تھا' تب بھی کئی بار خیالوں میں اس کا پیکر تراشا تھا۔ اس کے کالم اور آرٹیکل پڑھ کر۔"

وہ سانس لینے کو ذرا سا رکی۔

"ایک ناراض' خفا خفا سا شخص۔ اپنے علاوہ تمام لوگوں کے لیے مخلص۔ اپنے وطن سے جنون کی حد تک محبت کرنے والا اور پتا ہے عروج! جب پہلی بار میں نے اسے آفتاب حسین کے گھر نایاب کی تصویر کے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ مجھے ایسا ہی لگا۔ اس وقت اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ پتا نہیں اس سے کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میرے خیالوں نے اسے تراشا تھا۔"

"تم اس سے محبت کرتی ہو آمنہ! اور یہ میں نے پہلے دن ہی جان لیا تھا جب یہاں آفس میں پہلی بار میں تمہارے ساتھ آئی تھی اور تم نے مجھے اس سے متعارف کرایا تھا۔"

عروج نے پورے یقین سے کہا تو آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

"حیرت ہے عروج! وہ بات جسے جاننے میں مجھے اتنا عرصہ لگا بلکہ اب بھی میں کبھی کبھی تذبذب میں پڑ جاتی ہوں کہ کیا یہ محبت ہے۔ یہ جذبہ جو ہولے ہولے دل میں چٹکیاں لیتا ہے اور سارے وجود میں عجیب انوکھی سی سنسنی پیدا کرتی خوشی بن کر بکھر جاتا ہے۔ کیا واقعی محبت ہے۔ تم نے اسے لمحوں میں جان لیا۔ کہیں تمہارا دل تو محبت آشنا نہیں۔"

"نہیں جناب! تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔"

اور دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے اسید عبدالرحمٰن نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ ناب سے اٹھا لیا اور کلپ بورڈ اٹھائے واپس اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نہ جانے آمنہ سے کس بات پر ڈسکس کرنے آیا تھا کہ عروج کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

"تو......؟" اپنے آفس میں آکر کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"تو آمنہ شاہ......!"

کئی بار اسے گمان تو گزرا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی اپنے گمان کو جھٹلایا تھا' نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور اب عروج مصطفیٰ کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور خود آمنہ......!"

اس نے یونہی بے مقصد ٹیبل پر پڑے کاغذات کو ادھر ادھر کیا۔

"اور تم اسید عبدالرحمٰن کیا تم بھی؟؟"

اندر دل میں کہیں چراغاں سا ہوا۔

وہ بھی تو اسے دیکھ کر دل کی ایک دھڑکن مس کر بیٹھا تھا۔ لیکن دل میں یک دم چراغاں نہیں ہوا تھا بلکہ آہستہ آہستہ ایک احساس دل میں سرائیت کرتا گیا تھا جسے شاید محبت کا نام دیا جا سکتا ہو۔ یہ احساس آمنہ کی موجودگی میں اندر کہیں پھول کھلائے رکھتا تھا اور جس روز آمنہ غیر حاضر ہوتی تو جیسے۔۔۔۔

"اوہ نہیں!" سر کو جھٹکا۔ "میں جس راہ پر قدم رکھ چکا ہوں وہاں محبت کو ہم قدم لے کر نہیں چلا جا سکتا اسید عبدالرحمٰن!"

اس نے میز پر پڑی فائل اٹھائی اور آمنہ کے سامنے بیٹھی عروج آمنہ کی آنکھوں میں محبت کے رنگ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"کیا اسید عبدالرحمٰن بھی تم سے محبت کرتا ہے؟"

"پتا نہیں۔" آمنہ نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ ایسا شخص ہے کہ محبت اس کے قریب سے ہو کر چلی جائے تو اسے پتا نہ چلے۔"

وہ ہولے سے ہنسی۔

"اسے اپنے کام کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے۔"

"خیر اتنا مبالغہ تو نہ کرو آمنہ! اگر اس کے سینے میں پتھر ہوتا تو وہ اس اجنبی لڑکی عافیہ سلیمان کے لیے یوں سرگرداں نہ ہوتا۔ یوں انصاف کا ہر دروازہ نہ کھٹکھٹاتا۔"

"پتا نہیں عافیہ سلیمان کہاں کھو گئی زمین نگل گئی اسے یا آسمان۔"

"ہاں لیکن اس کی ماں کو یقین ہے کہ اسے اس این جی او نے غائب کیا ہے' جہاں وہ جاب کرتی تھی۔"

منہ نے کرسی سے اٹھ کر دراز کھولی اور دراز سے کوئی فائل نکال کر واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے عروج کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تمہیں پتا ہے عروج! ڈاکٹر فہد نے اسید کو بتایا تھا کہ اس نے عافیہ سلیمان کو نہ جانے کتنی ہی بار اس این جی او میں دیکھا تھا۔ بلکہ اس کی عافیہ سے بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔

"ڈاکٹر فہد کیا اسی این جی او میں جاب کرتا تھا۔؟" عروج نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس رات اس کی ماں اس کے گھر نہ آنے پر اس کا پتا معلوم کرنے پریشان ہو کر این جی او کے آفس گئی تھی اس روز بھی عافیہ سلیمان آفس آئی تھی لیکن وہ لوگ سرے سے مکر ہی گئے کہ وہ آئی تھی۔"

"پھر وہ کہاں گئی؟" عروج کو حیرت ہو رہی تھی۔

"معلوم نہیں لیکن عروج! یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بے چاری لڑکیاں جو اپنے گھر والوں کو بہتر مستقبل دینے اور ان کی آسائش کے لیے گھروں سے نکلتی ہیں' زیادہ تنخواہوں کے لالچ میں ان این جی اوز کے چکروں میں پھنس جاتی ہیں۔"

آمنہ نے تفصیل بتائی۔

"یہ عافیہ بھی اسی لالچ میں اس این جی او میں آئی تھی۔ اس کی ایجوکیشن صرف ایف اے تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے محلے کے کسی پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ جہاں اسے صرف پندرہ سو ملتے تھے۔ پھر وہاں ہی کسی نے اس سے "مددگار" نام کی اس این جی او کا ذکر کیا تھا اور پتا ہے اس کی ماں نے بتایا ہے کہ یہ لوگ اسے دس ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔"

"اور انہوں نے اسے غائب کیوں کر دیا؟" عروج نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں عروج! ان کا مقصد کیا تھا۔ ڈاکٹر فہد نے بتایا تو ہے کہ وہ لوگ بہت مذموم مقاصد رکھتے تھے۔ گو اس نے ابھی تفصیل نہیں بتائی تاہم وہ سب کچھ لکھ رہا ہے' جلد ہی اسید کو اپنی رپورٹ دے گا۔"

"لیکن آمنہ!" عروج نے جرح کی۔ "اتنے سارے لوگ مختلف این جی اوز میں کام کر رہے ہیں۔ سنا ہے ان کی تنخواہیں بہت اچھی ہیں اور یہ این جی اوز بہت کام کر رہی ہیں تو کیا سب این جی اوز کے پس پردہ اور مقاصد ہیں؟"

"یار! میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" آمنہ ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "کیا خبر کچھ این جی اوز واقعی کوئی بہتر اور رفاہی کام کر رہی ہوں۔ یہ اسید اور حامد اس پر کام تو کر رہے ہیں۔ مضمون چھپیں گے تو پڑھ لیں گے۔"

"تو کیا اسید اب بھی مضمون لکھے گا آمنہ! جبکہ وہ شخص ۔۔ روز اتنی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔" عروج نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اسید ہے عروج!" آمنہ کے لہجے میں خود بخود ہی ایک فخر سا شامل ہو گیا۔ "وہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔"

"ماما کہتی ہیں "آفتاب حسین کہتے تھے اسید عبدالرحمٰن روشنی کا مینار ہے۔"

اور ایک بار پھر دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے رکھے اسید عبدالرحمٰن ٹھٹک کر رہ گیا۔

"اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو اتنی بلندیوں پر بٹھا دیتا ہے کہ پھر خود کو ان بلندیوں کا اہل ثابت کرنے کی کوشش میں آدمی ہانپ ہانپ جاتا ہے۔"

ابھی کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس آرٹیکل کو نہ چھپوائے جسے کل رات اس نے لکھا تھا اور اس میں عافیہ سلیمان کی پوری اسٹوری تھی اور ارباب اقتدار سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بیوہ ماں کی اس بیٹی کو اس نام نہاد این جی او کے پنجے سے رہائی دلوائے۔ اس سے قبل اس سلسلے کے اس کے تین آرٹیکل چھپ چکے تھے اور حامد کا ایک سروے ان این جی اوز کے متعلق چھپ چکا تھا جو صرف یہاں لاہور میں کام کر رہی تھیں۔ ابھی اس سلسلے میں اس کا ارادہ مزید سروے کرنے کا بھی تھا۔ وہ ان کے اصل مقاصد کی کھوج میں بھی تھا لیکن مسلسل دھمکی آمیز فون آ رہے تھے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے آفس میں اس نے ایک بے حد ذمہ دار حکومتی افسر کا فون ریسیو کیا تھا کہ اگر اس نے مضامین چھاپنے کا یہ سلسلہ بند نہ کیا تو اس کے اخبار کا ڈیکلریشن ضبط کر لیا جائے گا۔ تب اس نے سوچا تھا کیا فائدہ اگر یہ مضمون چھپ بھی گئے تو کیا ہو گا۔ کون سا یہ این جی اوز ختم ہو جائیں گی اور کون سا لڑکیاں ان میں جاب کرنا چھوڑ دیں گی یہاں جاب کرنے والی اسی فیصد لڑکیاں اخبار کہاں پڑھتی ہیں تو خوامخواہ ڈیکلریشن ضبط کیوں کرواؤں۔ فرائی ڈے ایڈیشن کے لیے کوئی اور ٹاپک دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن اب ہینڈل پر ہاتھ رکھے رکھے اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر کوئی بھاری سا بوجھ آ پڑا ہو اور اسے کسی کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ وہ تو اندھیروں کا حصہ بننے جا رہا تھا اور آمنہ شاہ کہہ رہی تھی وہ روشنی کا مینار ہے احمر اور آفتاب حسین یکایک ہی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"اسید! ہمت نہ ہارنا۔ جو لوگ ہمت نہیں ہارتے ایک وقت آتا ہے کہ راستے خود بخود ان کے لیے کشادہ ہو جاتے ہیں اور منزلیں بازو وا کیے انہیں اپنی منتظر ملتی ہیں۔"

"تو یہ طے ہوا کہ فرائی ڈے ایڈیشن میں یہ آرٹیکل چھپے گا اب چاہے ڈیکلریشن ضبط ہو یا۔۔۔"

اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اجازت طلب کرتے ہوئے اندر آ گیا آمنہ فائل ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور عروج کرسی پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے گرلز؟" وہ مسکرایا۔

"اسید! میں آپ کی طرف ہی آ رہی تھی۔ یہ میں نے اسپتالوں کی حالت زار پر رپورٹ تیار کی ہے۔ میں اور صدف پچھلے دو ہفتوں سے مختلف اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے۔"

اسید نے فائل لے لی۔

"اوکے میں دیکھ لیتا ہوں۔" اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

"آج صدف نہیں آئی۔"

ہاں۔ پتا نہیں کیوں؟" عروج نے جواب دیا۔

"طبیعت خراب تھی اس کی۔" آمنہ نے جواب

دیا۔

”ٹمپریچر ہو رہا تھا۔“ اسید نے سرہلا دیا۔

”عاشی کیسی ہے؟ آ نہیں رہی؟“ آمنہ نے پوچھا۔ اسید ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے دراصل دادی جان کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ ٹمپریچر کم ہی نہیں ہو رہا اس پر چیسٹ انفیکشن شدید ہے سو عاشی اُدھر ہی ہے۔“

”میں آج چلوں گی دادی جان کو دیکھنے عروج تم چلوگی میرے ساتھ۔“

آمنہ عروج سے پوچھ رہی تھی جبکہ فائل میں موجود پیپر دیکھتے ہوئے اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ اُبھری تھی۔

”یہ غالباً تم نے لکھا ہے آمنہ!“

جب بھی روانی میں وہ آمنہ کو تم کہہ کر بلاتا تھا آمنہ کو بہت اچھا لگتا تھا۔

”ہاں ابکچوئلی صدف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی تو اس نے مجھے لکھنے کو کہہ دیا۔“

”ہاں تمہارا افسانوی رنگ جھلک رہا ہے اس میں اور یہ رپورٹ کے بجائے ایک درد بھرا افسانہ لگ رہا ہے۔“

”سوری۔ یہ فائل مجھے دے دیں میں دوبارہ لکھتی ہوں۔“

”فی الحال رہنے دو۔ میں فالتو جملوں کو انڈر لائن کر دیتا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے لکھنا ہے۔“

آمنہ نے سرہلا دیا۔ اس کا دل کسی انوکھی لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج سے پہلے اسید نے کبھی اس طرح اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ تو کیا محبت کی آنچ نے اس کے دل کو بھی پگھلا دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عروج نے ہی تو کہا تھا۔ کہ محبت کی آنچ تو پتھر سے پتھر دل کو بھی پگھلا دیتی ہے اور اسید اتنا پتھر بھی نہیں کہ اسے آمنہ شاہ کی آنکھوں میں کھلتے محبت کے پھول نظر نہ آئیں نہ ہی وہ اتنا کوتاہ بین ہے کہ تمہارے گالوں پر بکھرتے ان رنگوں کو کوئی مفہوم ہی نہ پہنا سکے جو اسے دیکھ کر یک دم تمہارے رخساروں پر ہولی کھیلنے لگتے ہیں۔ تب اسے عروج کے جملوں پر ہنسی آئی تھی۔

”یار! تم بھی کسی افسانہ نگار سے کم نہیں ہو افسانے لکھنا شروع کر دو۔“

اور عروج نے دل گرفتی سے سوچا تھا۔ بھلا وہ کیسے افسانے لکھ سکتی ہے۔ چند لفظ بول دینے سے بھلا کوئی افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ نگار تو پیدائشی ہوتا ہے آمنہ شاہ کی طرح لیکن اس کے اندر ایک چھپی ہوئی خواہش نے چٹکی ضرور بھری تھی کاش ایسا ہو کہ کبھی وہ بھی لکھ سکے آمنہ شاہ کی طرح۔

تب ہی اسید عبدالرحمٰن کے موبائل کی بیل ہوئی تو عروج اور آمنہ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں سے چونک کر اسید کو دیکھنے لگیں۔ اسید نے ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ کر پاکٹ سے فون نکالا۔

”ارے ڈاکٹر فہد آپ خیریت؟“

”کیا؟ عافیہ سلیمان کا پتا مل گیا؟“

”وہ کہاں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس سے بات ہو سکے؟“

”اوکے۔ میں آرہا ہوں۔“

اس نے سیل آف کر کے دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں ذرا ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر حامد یا فیصل میں سے کوئی آجائے تو انہیں بتا دینا کہ فرائی ڈے اسپیشل میں میرا این جی او والا آرٹیکل بھی لگے گا۔“

اور وہ انہیں خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

”کیا ہوا اسید؟“ حامد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟“

”کیا بتاؤں دوست!“ اسید نے سر اٹھاتے ہوئے گہری سانس لی۔

”تم جب سے آئے ہو یوں آپ سیٹ سے لگ رہے ہو۔“

”ہاں۔ میں رات بھر سو نہیں سکا۔“ اسید نے پیشانی پر آئے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا۔

”عافیہ سلیمان کو کسی نے قتل کر دیا۔“

”کیا؟“ حامد اچھل پڑا۔ ”آمنہ نے بتایا تھا کہ تم اس سے ملنے گئے ہو۔“

”ہاں... لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں پولیس تھی اور۔“

حامد الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں علم تو ہے حامد! ڈاکٹر فہد اس این جی او میں ملازمت کرتا تھا جہاں عافیہ بھی جاب کرتی تھی۔ فہد نے مجھے بتایا تھا کہ عافیہ بہت پریشان تھی۔ وہ لوگ اسے کسی ایسے کام کے لیے مجبور کر رہے تھے جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک روز فہد سے کہا تھا کہ وہ جاب چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ یہ لوگ اسے نقصان پہنچائیں گے۔ ڈاکٹر فہد نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس طرح کا خوف کیوں محسوس کر رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ فون پر ان سے بات کرے گی اور یہ کہ اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فہد نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا اور اس سے اگلے روز کی بات ہے کہ وہ آفس نہیں آئی اور اس این جی او ز کے کرتا دھرتا نعیم ملک نے بتایا کہ وہ جاب چھوڑ گئی ہے۔

اور اسی شام عافیہ سلیمان کی ماں اسے تلاشتی ہوئی آفس آئی تھی جبکہ آفس والوں نے اس کے آفس میں آنے سے انکار کر دیا اور اس کی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت دنوں سے آفس نہیں آرہی۔ جب عافیہ کی ماں کی اپیل ایک اخبار میں چھپی تو فہد نے مجھے فون کر کے بتایا کہ شاید اس نے جاب چھوڑ دی ہوگی۔ یہ اخبار سے پتا چلا تھا کہ وہ گھر نہیں پہنچی یکم دسمبر صبح وہ گھر سے نکلی اور واپس نہیں پہنچی۔“

اسید حامد کو تفصیل بتا رہا تھا اور حامد بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ میں نے فہد سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق عافیہ کے متعلق ساری تفصیل اپنے آرٹیکل میں لکھ دی تھیں کہ دو ماہ سے اس کی ماں بیٹی کی تلاش میں خوار ہو رہی ہے اور میں نے فہد کو اس کے متعلق بتایا تھا کہ کل صبح فہد کا فون آگیا کہ عافیہ نے اسے فون کیا ہے وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ کسی پرائیویٹ ہوسٹل میں تھی۔“

وہ اپنے گھر کیوں نہیں گئی؟“ حامد نے پوچھا تو اسید افسردگی سے مسکرا دیا۔

”کاش یہ بتانے کے لیے وہ زندہ رہتی۔ وہ فہد سے مل کر اسے سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ فہد نے مجھے فون کر دیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہ نہیں رہی تھی۔“

”یہ این جی او کیا کام کرتی ہے؟“ حامد نے پوچھا۔

اس کا کام Rural Development یعنی دیہی علاقوں میں لوگوں کی Learning (تعلیمی پروگرام) کا جائزہ لینا ان کی طبی سہولتوں کا جائزہ ان میں شعور پیدا کرنا انہیں حفظانِ صحت سے آگاہ کرنا جس میں فیملی پلاننگ بھی شامل ہے۔“

اسید نے تفصیل بتائی۔

”اگر مقصد صرف یہی ہو تو یہ بہت اچھے مقاصد ہیں۔“ حامد نے آہستگی سے کہا۔ ”لیکن افسوس میں تم بتاؤ تم جس این جی او کے متعلق تحقیق کر رہے تھے اس کے متعلق کیا جانتے ہو؟“

”یہ دراصل حدود آرڈیننس کے خلاف ویمن ایکشن فورم کے نام سے بنائی جانے والی تنظیم کی طرح کی ایک این جی او ہے۔ دورانِ خانہ مقاصد تو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئے مجھ پر لیکن جلد ہی پتا چل جائے گا۔ بظاہر یہ انسانی حقوق، حقوقِ نسواں خواتین کے خلاف امتیازی سلوک اور balance gender کے نعرے لگا رہے ہیں۔ میں اس کی بانی بیگم نصراللہ سے ملا ہوں ان کا انٹرویو لیا ہے۔“

”فائن!“ اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا فرمایا محترمہ نے؟“

”یہی کہ انہوں نے یہ این جی او مظلوم عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے بنائی ہے۔ عورت جس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔“

"جتنے حقوق عورت کو اسلام نے دیے ہیں' اتنے حقوق تو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیے۔" صدف نے جو کچھ دیر پہلے خاموشی سے آکر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ گفتگو میں مداخلت کی۔ "یہ جن رسموں و رواجوں کا سہارا لے کر مسلمان عورت کی مظلومیت کا رونا ساری دنیا کے میڈیا پر کرتی پھر رہی ہیں۔ وہ رسم و رواج جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ اسلام تو ان کی حمایت نہیں کرتا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو صدف! کاش کوئی ریفارمران کو شعور دے۔ ان میں صحیح اسلام کی تبلیغ کرے۔ یہ نام نہاد فلاحی انجمنیں اور این جی او صدف۔ اپنا مقصد نکالنا چاہتے ہیں۔ تم ایسا کرو مسلمان عورت کے حقوق کے متعلق کچھ آرٹیکل لکھ ڈالو۔"

صدف نے آہستہ سے سرہلا دیا تو اسید کو یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہوں۔"

اور دادا جان اور احمر کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟ بہت دنوں سے جا نہیں پایا ہوں۔" اسید نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں۔ تمہیں یاد کرتے ہیں۔ لیکن تمہاری مصروفیات سے بھی باخبر ہیں۔" صدف نے بتایا تب ہی حامد نے اس کی طرف دیکھا۔

"صدف! اگر تمہیں اپنے آرٹیکل کے لیے کچھ معلومات چاہئیں تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ 1995 میں بیجنگ میں ——————
عورتوں کے حقوق کے متعلق کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے بعد اڑتالیس ممالک کے سفارت خانوں میں ایسے دفاتر کھولے گئے جو ایسے لوگوں کو امداد دیتے تھے جو خواتین کی امداد کے نام پر ادارے یا این جی اوز بناتے تھے۔ انہیں دفاتر' کمپیوٹر کیمرے اور ملٹی میڈیا سے لے کر گاڑی تک فراہم کی جاتی تھی۔"

صدف بے حد دھیان سے سن رہی تھی۔

"دراصل این جی اوز کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے میرے علم میں یہ ساری معلومات آئیں۔

مختصراً" تمہیں بتا رہا ہوں کہ شاید اس میں سے کچھ تمہارے کام آسکے۔ تو میں کیا بتا رہا تھا کہ

ان افراد کو ورکشاپ کروانے' کانفرنس کرنے اور احتجاج کرنے کے لیے پیسہ دیا جاتا تھا۔ دراصل امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ نے جسے RAND کیا جاتا ہے۔ پوری مسلم امت کے خلاف جامع منصوبہ بنایا تھا 2003 میں جس کا نام اس کی دو اہم شقوں کے متعلق میں تمہیں بتاتا ہوں' ایک تو یہ کہ ماڈرن اسکالرز کو سامنے لایا جائے۔ انہیں چینلز پر موقع دیا جائے' ایسے اخبارات اور چینلز کو پیسہ دیا جائے جو اسلام کے خلاف کم علم علماء کو سامنے لائیں۔ اور دوسرا یہ کہ مسلمان عورت کو ہر طرح سے تحفظ دیا جائے' اسے اعلا تعلیم اور جائز مواقع دیے جائیں۔ اسے احساس دلایا جائے کہ وہ بہت گھٹن کی اور پابند زندگی گزار رہی ہے۔ اسے آزادی کے نام پر بے راہ روی کی طرف مائل کرنا۔ اسے آزاد زندگی گزارنے کی ترغیب دینا۔ اسے اتنی سہولتیں مہیا کرنا کہ وہ شادی کرنے کے بجائے خود مختار زندگی گزارنے کی طرف مائل ہوجائے۔ ایسے ایشوز کو سامنے لانا کہ پتا چلے کہ مسلمان عورت دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے۔"

"مختاراں مائی کا ایشو بھی مجھے ایسا ہی ایک ایشو لگتا تھا۔" صدف نے کہا۔ "کیا یورپی ممالک میں مختاراں مائی جیسی عورتیں نہیں ہوتیں؟"

"کیوں نہیں ہوتیں۔" اسید عبدالرحمٰن نے اس کی طرف دیکھا۔ "یورپ کی عورت تو بہت قابل رحم ہے وہاں تو کم عمر بچیاں اور—"

تب ہی دروازہ کھلا اور آمنہ نے اندر جھانکا۔ ہمیشہ کی طرح بہت فریش اور شگفتہ سی۔ لمحہ بھر کے لیے اسید کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر فوراً" ہی اس نے نگاہیں جھکالیں۔

"السلام علیکم۔" وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اندر آگئی۔

"کیسی ہو صدف؟"

"شکر ہے تم آگئیں۔ سچ بہت بور ہو رہی تھی

ان دنوں۔ عاشی اور عروج بھی نہیں آرہیں اور وہ سعید بھی آج کل بہت بری طرح سے اپنی اسٹڈی میں مصروف ہے۔" تیز تیز بولتی ہوئی وہ صدف کی کرسی کے ہتھے پر ہی ٹک گئی اور پھر اسید کی طرف دیکھا۔

"اسید! تمہاری ملاقات ہوئی عافیہ سے' کیا کہا اس نے؟"

"عافیہ کو کسی نے قتل کردیا ہے۔"

"اوہ نو!" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"اور فہد۔ ڈاکٹر فہد تو ٹھیک ہے نا' وہ ..."

"ہاں فہد تو ٹھیک ہے' تمہارا مطلب۔ اوہ نو۔" اسید عبدالرحمٰن یکدم پریشان نظر آنے لگا۔

"تم صحیح سوچ رہی ہو۔ مائی گاڈ! مجھے پہلے اس کا خیال ہی نہیں آیا جو لوگ عافیہ کو قتل کرسکتے ہیں' وہ ڈاکٹر فہد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

بات کرتے کرتے اس نے فون اپنی طرف کھسیٹا اور فہد کے نمبر ملانے لگا۔

اسے چند ہی ملاقاتوں میں یہ نوجوان ڈاکٹر بے حد عزیز ہوگیا تھا۔ اس کی باتوں سے وطن کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ بہت سچا' کھرا اور بولڈ لڑکا تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو ڈاکٹر فہد سے بات کرنا ہے۔" شاید نمبر مل گیا تھا' تینوں اسید کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں ڈاکٹر فہد بول رہا ہوں' اسید خیریت ہے۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر فہد پوچھ رہے تھے۔

"اوہ ہاں...!" اسید نے اطمینان بھر سانس لیا۔ "میں نے پریشانی میں تمہیں پہچانا نہیں۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ یار! وہ لوگ... تمہارے لیے بھی خطرہ ہوسکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ میرے متعلق نہیں سوچ سکتے۔ میرا تعلق تو طبی شعبے سے تھا۔ یہ جو کچھ میرے علم میں آیا اتفاقیہ تھا۔ اور عافیہ سے نہ تو وہاں بات چیت اکثر ہوتی تھی' نہ ایسی کوئی خاص ملاقات تھی۔ وہ تو صرف دو تین بار میرے کلینک میں آئی تھی اپنی آنکھیں چیک کروانے کے لیے۔ الرجی ہوتی تھی تو اتفاق سے میں اکیلا تھا تو اس نے بات کی۔ میں چونکہ ان دنوں ان کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ مشکوک سوچ چکا تھا تو میں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔"

فہد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"بہرحال اپنا خیال رکھنا بہت۔"

"اوکے تھینک یو۔"

فون بند کرکے اس نے فہد کی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

"تو میرے لیے اب کیا حکم ہے سر؟"

حامد نے قدرے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں' تم اپنا آرٹیکل مکمل کرلو۔ میں چاہتا ہوں دونوں آرٹیکل ایک ہی ایڈیشن میں آجائیں۔ اسی فرائی ڈے کو۔"

"اوکے۔" حامد اٹھ کھڑا ہوا تو اسید ٹیبل پر بکھرے کاغذات کو اکٹھا کرکے فائل میں رکھنے لگا۔

"اسید! جو لوگ عافیہ کو قتل کرسکتے ہیں وہ ان آرٹیکل کے چھپنے کے بعد تمہارے بھی تو دشمن ہوسکتے ہیں۔" آمنہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پھر؟" اسید نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں

"کیا ان آرٹیکل کے چھپنے کا کوئی فائدہ ہوگا اسید؟"

آمنہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

"معلوم نہیں آمنہ! اگر نہ بھی ہو تو ایک کوشش تو کی ہے نا! ہم نے عوام کو' حکومت کو لوگوں کو آگاہ کرنے کی کہ یہ ہے ان کا اصل چہرہ۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں بے روزگاری' لامحدود خواہشات' آسائشوں کی طلب ہمیں اندھا دھند بھگا رہی ہے۔ ہمیں جہاں پیسہ زیادہ ملتا ہے۔ ہم ادھر ہی لپکتے ہیں۔ ان آرٹیکل کو پڑھ کر چند افراد نے بھی ان کے جال میں آنے سے خود کو بچا لیا تو یہ میرے نزدیک کامیابی ہے۔ بڑی نہ سہی چھوٹی کامیابی۔ کہیں نہ کہیں سے تو کام کی ابتدا کرنا ہے نا آمنہ!"

اس نے بے حد ٹھہرے ٹھہرے انداز میں سمجھایا تو آمنہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

وہ صحیح کہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے نا! تو پھر

یہاں سے ہی سہی۔ لیکن کیا اس شخص کے دل میں کبھی میرا خیال بھی آتا ہوگا۔ میں آمنہ شاہ جو اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ تمہیں سوچتی ہوں اور ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا کبھی آمنہ شاہ کو اسید عبدالرحمن کی رفاقت مل سکتی ہے۔

"آمنہ!" صدف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔ "چلیں اپنے کمرے میں۔"

"ہاں۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو مجھے ابھی فرائی ڈے ایڈیشن کے لیے اپنی رپورٹ مکمل کر کے دینا ہے حامد کو۔" اسید بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو اسید؟" صدف نے پوچھا۔

"ہاں مجھے ذرا حسن پرنٹنگ پریس تک جانا ہے اخبار کے سلسلے میں کچھ بات کرنا ہے۔"

نوید سحر حسن پرنٹنگ پریس سے ہی چھپتا تھا۔

"خیریت۔ کہیں انہوں نے تو بصیر پرنٹنگ والوں کی طرح ہمارا اخبار چھاپنے سے انکار تو نہیں کر دیا؟" صدف نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ اور مسئلے ہیں۔"

اسید اپنا موبائل اٹھا کر باہر نکل گیا تو آمنہ اور صدف بھی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ ہال میں فیصل اور حامد کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے اور سعید ٹیبل پر پڑی تصویروں کو چھانٹ رہا تھا جبکہ دلیر اس کے پاس خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

"صدف! تمہیں — آرٹیکل کے سلسلے میں اگر کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتانا' میرے پاس "اسلام میں عورت کے حقوق پر" ایک کتاب بھی ہے۔ وہ میں تمہیں لا دوں گا۔"

حامد نے بات کرتے کرتے مڑ کر صدف سے کہا اور صدف سر ہلاتی ہوئی آمنہ کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ تینوں بیٹھتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سیونی اسی نیناں دے آکھے لگے۔"

کتاب گود میں دھرے آنکھیں بند کیے آگے پیچھے جھولتے ہوئے سعید گنگنا رہا تھا جب عاشی' آمنہ' صدف اور عروج آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہ پڑھائی ہو رہی ہے یا ریاض؟" عاشی نے آگے بڑھ کر کتاب اس کی گود سے اٹھائی۔

"ہائے نی سیو اسی نیناں دے آکھے لگے۔"

نیم وا آنکھوں سے عاشی کو دیکھتے ہوئے وہ پھر گنگنایا۔

"آنکھیں کھولو' دیکھو کون آیا ہے؟"

"ارے ہاں ہاں۔" اس نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "بڑی بڑی ہستیاں تشریف لائی ہیں آج غریب خانے پر آیئے آیئے حضور!" وہ تھوڑا سا جھکا۔

"زہے نصیب اتنی بڑی افسانہ نگار اور کالمسٹ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں پھول بچھاؤں۔"

"بکو مت۔" عاشی نے بیٹھتے ہوئے تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "نانو کہاں ہیں' یہ سب نانو کی مزاج پرسی کے لیے آئی ہیں۔"

"تمہاری نانو اور ہماری دادو اس وقت دادا جان کے ساتھ گھومنے کے بعد آرام کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ نانو ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں ناناجان کے ساتھ۔ تم نہیں جا سکتے تھے ساتھ۔"

"ہاں جا سکتا تھا۔" سعید نے سر کھجایا اور کمرے میں پڑی اکلوتی میز پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ "لیکن افسوس وہ میرے کالج سے واپس آنے سے پہلے ہی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک چہل قدمی کر کے واپس آ گئے تھے۔"

"توبہ ہے سعید! تم کس قدر فضول بولتے ہو۔" عاشی نے عاجز آ کر کہا۔ "نانو کہاں ہیں؟"

"ظاہر ہے عاشی بی بی! اپنے کمرے میں ہوں گی۔ یہ کمرہ جس میں آپ تشریف فرما ہیں' میرا اور راحیل کا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم نانو کے کمرے میں جا رہے ہیں۔"

عاشی نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً بول اٹھا۔

"ارے نہیں اب اگر اس کمرے کی قسمت جاگ اٹھی ہے کہ اتنی اہم ہستیاں یہاں تشریف لائی ہیں تو آپ یہاں سے جا کر اس کی قسمت کو سلانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ یوں بھی دادی جان محترمہ اس وقت خواب استراحت کے مزے لے رہی ہیں اور دادا جان کرسی پر نیم دراز "عمرو عیار" کے کارنامے پڑھ رہے ہیں اور گاہے گاہے دادی جان پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔"

عاشی نے اس کی اس اتنی لمبی چوڑی گفتگو پر برا سا منہ بنایا۔

"اسید بھائی اور ماموں بھی نظر نہیں آ رہے۔"

"اسید بھائی اور تمہارے ماموں کچھ دیر پہلے ہی گھر سے باہر نکلے ہیں لیکن چونکہ اس وقت میں یہ غور کر رہا تھا کہ ہم آخر تینوں کے "آکھے" ہی کیوں لگتے ہیں اور یہ دو نیناں کب ہمیں مشورے دینے لگتے ہیں اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان بے چاری کونگی آنکھوں پر الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ خوامخواہ میں اور میرا دل ان کی مظلومیت پر اتنا رقیق ہو رہا تھا کہ میں پوچھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔" تب ہی راحیل ٹرے میں پیپسی کے گلاس رکھے اندر داخل ہوا۔

"اٹھیے سعید بھائی! میز خالی کریں۔"

"اوہ ہاں۔ میز کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔"

"ماشاءاللہ بہت سگھڑ ہے میرا بھائی۔"

راحیل نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور گلاس اٹھا کر سب کو دیے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" عروج نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم عاشی کے گھر سے پی کر آئے ہیں۔"

"اوہ اچھا!" سعید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا صدف نے پوچھا۔

"سعید! دادی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اسید بہت پریشان تھا کل۔ ٹمپریچر کیوں نہیں اتر رہا۔"

"بس کچھ بگڑا ملیریا بگڑ گیا تھا۔ اب کافی بہتر ہیں۔ پہلے ڈاکٹر یوں ہی دوا دیتا رہا۔ دو دن پہلے ہی تو بلڈ ٹیسٹ کروایا تو پتا چلا کہ ملیریا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر بس ایویں ہی ہوتے ہیں صدف! یوں ہی بس تکے سے دوائیاں دے دے کر مریض کو مار ڈالتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ڈاکٹر بننے کی ضرورت ہی کیا ہے' جب مریض کو مارنا ہی ہے تو اس بے چارے کو بغیر علاج کے ہی مرنے دیں' اچھا خاصا دوائیوں کا خرچ بچ جائے گا۔"

عاشی کو اب موقع ملا تھا سعید کو تنگ کرنے کا۔

"ہاں واقعی میں بھی اکثر سوچتا ہوں بالکل ایسا ہی۔ یہ ہم دونوں کی سوچ کتنی ملتی ہے نا!"

صدف اور آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ تب ہی ایک طرف کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑے راحیل نے کہا۔

"بھائی! میں تو جا رہا ہوں ٹیوشن پر۔ چائے آپ خود بنا لیجیے گا۔"

"ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔" اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔ "یہ ہے نا عاشی! اپنا ہی گھر ہے اس کا۔ کل کو بھی تو اس نے ہی میزبانی کرنا ہے۔ تو آج...."

"جی نہیں۔" عاشی نے اس کی بات کاٹی۔ "آج تو میں مہمان ہوں۔ چائے تم پلاؤ گے۔"

آمنہ نے ایک نظر عاشی پر ڈالی۔

"تو یہ تو اسید کے ساتھ عاشی۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں اور اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے۔ ابھی تو دل نے اسید کے نام پر دھڑکنا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں میں خواب اترے تھے اور...."

"بڑی گھنی ہو تم!" عروج نے عاشی کی پیٹھ پر مکہ مارا۔ تو وہ چونک کر عاشی کو دیکھنے لگی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" عاشی منمنا رہی تھی۔ "اس سے پوچھو۔"

"میں کیا بتاؤں؟" سعید دانتوں تلے انگلی دبائے شرمانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ "جوں ہی میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو بس ہماری پھوپھو صاحبہ نے جھٹ پٹ اپنی بیٹی کا نام ہمارے ساتھ لگا دیا کہ اتنا سوہنا منڈا ہے۔ کہیں کوئی اغوا ہی نہ کرلے بڑا ہونے پر۔۔۔۔"

"پڑوس میں بالا گجر بھی تو رہتا ہے نا!" عاشی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو۔۔۔ تو۔۔۔ تم۔۔۔ اور سعید۔۔۔" آمنہ نے رک رک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔ "یعنی تم دونوں کی انگیج منٹ ہو چکی ہے۔"

اندر جیسے ایک بار پھر سے چراغاں ہو گیا تھا۔

"پتا نہیں یہ انگیج منٹ ہے یا کیا ہے۔ بس دادی نے اسی وقت ایک لڈو پھوپھو کے منہ میں ڈالا اور کہا۔ لو منہ میٹھا کرو، آج سے منڈا تمہارا ہے۔"

"بکو مت۔۔۔ اماں کی تب شادی بھی نہیں ہوئی تھی، جب تم پیدا ہوئے تھے۔"

عاشی جھینپ رہی تھی۔

"یہ تو بعد میں جب ماں بیمار تھیں تو انہوں نے اماں سے مجھے مانگ لیا تھا۔"

"چلو بعد میں ہی سہی لیکن تمہاری اماں تو مجھ پر فدا تھیں نا! نہیں تو اسید بھی تھا اور فیصل بھی۔"

"تم خود ہی ہر وقت اماں کی گود میں گھسے رہتے تھے تو قدرتی بات ہے، اماں کو تم سے محبت تھی اور جب ماں نے کہا تو انہوں نے تمہارا نام دے دیا۔"

"ویسے ..." وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ "یہ اماں نے اپنی محبت کچھ تمہاری طرف بھی منتقل کی ہے یا۔۔۔۔"

عاشی کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ تینوں ان کی باتوں کو انجوائے کر رہی تھیں جب سعید نے ٹرے اٹھا کر راحیل کو پکڑائی۔

"یہ تم کھڑے کھڑے کیا دانت نکال رہے ہو، ٹیوشن پر نہیں جانا۔"

"تم پڑھایا کرو نا اسے۔" عروج نے مشورہ دیا۔ "پتا نہیں ٹیوشن سینٹر میں کیسا پڑھاتے ہیں۔ پیسہ کمانے کا ذریعہ ہیں سب۔"

"مشورہ اچھا ہے عروج بی بی!" سعید اچھل کر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ ٹیوشن لینے نہیں دیتے۔ کم اور یہ حضرت خود اس قدر تیز ہیں کہ میرے جیسے بندوں کو پڑھا دیں۔ مجھ سے کیا پڑھنا ہے اسے۔"

"یعنی ایں ہمہ خانہ آفتاب است۔" عاشی نے اپنی فارسی کی لیاقت جھاڑی۔

"تمہیں فارسی پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟" سعید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"فارسی میں نمبر زیادہ آتے ہیں۔ ہماری کلاس کی سب لڑکیوں نے آپشنل فارسی ہی رکھا تھا۔"

"ہائے کاش، مجھے بھی کوئی مشورہ دے دیتا تب فارسی رکھنے کا۔ خیر مستقبل میں تم سے پڑھ لوں گا۔ بہت آتی ہے فارسی۔ ویسے اب تم کیوں نہیں فارسی میں ماسٹرز کر لیتیں۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"جی نہیں میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ نانو نے منع کیا تھا مجھے ایڈمیشن لینے سے۔"

"اوہ ہاں۔ ہاں لیکن میں نے تو ابھی ہاؤس جاب بھی کرنا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ عاشی نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

"آمنہ! کیا انگلش میں ماسٹرز کرنا بہت مشکل ہے۔"

"نہیں خیر، ایسا مشکل بھی نہیں، شوق ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اب کے ایڈمیشن کھلیں تو تم لے لینا ایڈمیشن۔"

"بی۔ اے میں میرے پاس اسلامیات ہسٹری اردو تھی کیا پھر بھی میں۔۔۔۔"

"چھوڑ یار! انگلش میں کیا رکھا ہے، مجھے بالکل پسند نہیں ہے انگلش۔ اب دیکھو نا انگریزی ادب کا ہمارے احساسات سے کیا تعلق، ہمارے ہاں آہ ہوتا ہے ان کے ہاں آوچ ہے اور پھر انگریزی میں عشق نہیں محبت ہوتی ہے یعنی Love لیکن محبت بھی کبھی عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے آمنہ جی! عشق کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟"

آمنہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"دیکھا۔" اس نے چٹکی بجائی۔ "انگریزی میں عاشق نہیں ہوتا، وہ والا عشق جس میں کہتے ہیں۔ عشق ہو یا گھر دو سریا در د سریا"

"تم اتنا کیوں بولتے ہو سعید؟" عاشی زچ ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم مجھے یاد رکھو ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ ہے غالباً" خلیل جبران نے کہا تھا اور مجھے اس وقت بالکل بھول گیا ہے کہ خلیل جبران نے کیا کہا تھا۔"

آمنہ کو پتا نہیں کیوں لگا جیسے اس کی آواز کی شوخی اچانک ختم ہو گئی ہو لیکن جب اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں یوں ہی چمک رہی تھیں۔

"ویسے آمنہ جی!" اس نے آمنہ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر پھر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ "آپ لوگوں نے ادب کو شیکسپیئر کے عامیانہ ڈراموں تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے، حیرت ہے کسی نے خلیل جبران، حافظ اور شیرازی کی گہرائی کو محسوس نہیں کیا۔ آمنہ جی کبھی جبران اور حافظ کو پڑھ کر دیکھیں۔"

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں آمنہ! صرف آپ ادھر ہی دادی جان کے کمرے میں آجائیے گا۔ میں دیکھتی ہوں اگر وہ جاگ رہی ہیں تو۔"

"لو جی۔ اسید بھائی بھی آگئے۔"

وہ جہاں ٹیبل پر بیٹھا تھا وہاں قریب ہی کھڑکی سے باہر گلی کا منظر نظر آ رہا تھا۔ آمنہ کی آنکھیں یکدم جگمگا اٹھیں۔ وہ دل میں نہ جانے کتنی بار اسید کو دیکھتی تھی اور ہر بار اسے لگتا تھا جیسے نہ جانے کب سے وہ اسید سے نہیں ملی اور ہر بار ہی اس کی پرشوق نظروں میں یوں ہی جگمگاہٹیں اتر آتی تھیں۔ غیر ارادی طور پر وہ کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سعید ہولے سے کھنکارا۔ اس کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں، آمنہ جی! آپ بڑے شوق سے باہر کا نظارا کریں۔ میں تو یوں ہی کھانسا تھا۔ گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔" آمنہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی تھی۔ جبکہ صدف کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔ تب ہی اسید صحن میں نظر آیا اور پھر وہ دادا جان کے کمرے کی طرف جاتے جاتے سعید کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ شاید عاشی نے کچن سے آواز دے کر اسے بتایا تھا۔

"السلام علیکم!" کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے سب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور لمحہ بھر کے لیے اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر ٹھہری تھیں پھر اس نے سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ سعید کچھ بتاتا کہ عاشی نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی۔

"دادی جان جاگ چکی ہیں۔"

"اوہ اچھا!" آمنہ سب سے پہلے کھڑی ہوئی تھی۔

"ہم سب دادی جان کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔" آمنہ نے اس کے الجھے الجھے سے انداز کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

"او۔۔۔ تھینکس۔۔۔" وہ چونک کر ایک طرف ہٹا۔

"دادی جان اب تو کافی بہتر ہیں لیکن پچھلے دنوں بہت طبیعت خراب ہو گئی تھی ان کی۔"

وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تفصیل بتانے لگا۔ دادی جان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"خوش رہو۔ سکھی رہو۔" انہوں نے سب کو دعا دی۔

آمنہ جگہ نہ ہونے پر ان کے پاس ہی ان کی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ عاشی نے میز درمیان میں رکھ کر چائے کی ٹرے رکھی تھی، ساتھ میں نمکو، بسکٹ اور سموسے بھی تھے۔

"ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" صدف نے عاشی کی طرف دیکھا لیکن جواب اسید نے دیا۔

"تکلف کہاں یہاں یہی کچھ میسر ہوتا ہے۔ گھر میں

کوئی خاتون تو ہے نہیں کہ کچھ بنا کر محفوظ کر دے۔"
"یعنی کچھ کیا؟" عروج کے لہجے میں شرارت تھی۔
"یہی کباب ٹکٹس وغیرہ۔" سعید نے سموسہ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"تو کب سے کہہ رہا ہوں تمہاری دادی جان سے کہ اب اسید کی شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن ہماری بات تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی جاتی ہے۔"
"ارے مانے بھی تو تب نا!"
"نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اسید سٹپٹایا۔
"تو مطلب نہیں تھا' تب بھی اب مینٹل ہو گئے ہو۔ اخبار بھی چل نکلا ہے تو۔۔۔"
"نہیں دادا جان!" اسید نے ان کی بات کاٹی۔
"ابھی نہیں۔ آپ پہلے سعید کی کر دیں۔"
"اور وہ کہے گا مجھے ابھی امتحان دینا ہے۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر پارٹ ون کرنا ہے پارٹ۔۔"
"ارے نہیں دادا جان! آپ اپنی خوشی پوری کریں۔ باقی سب تو چلتا رہے گا۔"
حاضر ہوں جان و دل سے
کیڑا ہوں گرچہ میں ذرا سا اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر خم کیا۔
"میں تو چاہتی ہوں' دونوں کی اکٹھی ہی کر دوں۔"
دادی جان نے محبت بھری نظر دونوں پر ڈالی۔
"رہے راحیل اور وحید تو دونوں ابھی چھوٹے ہیں۔ جب سے بیمار ہوئی ہوں' دونوں کچن کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے ہیں اور پڑھائی بھی۔"
"ہاں یاد آیا' یہ وحید کدھر ہے۔ صبح سے نظر نہیں آیا مجھے۔" اسید نے پوچھا۔
"ہاں' میں نے بھی نہیں دیکھا۔"
"راحیل بتا رہا تھا کہ وہ صبح کہہ رہا تھا کہ دیر سے آئے گا۔ اسکول میں فٹ بال کا میچ ہے۔"
دادا جان نے بتایا تو اسید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔
"لیکن اب تو چھ بجنے والے ہیں۔"
آمنہ نے یک دم نظر اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا۔ وہ
بے حد پریشان اور مضطرب سا لگ رہا تھا۔
"اسید! خیریت ہے نا آپ یکایک پریشان ہو گئے ہیں۔" آمنہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
"ہاں بس یونہی۔" وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔
"میں پتا کرتا ہوں اس کے اسکول سے۔"
"بیٹھ جاؤ اسید بیٹا! وہ اب اتنا چھوٹا بچہ بھی نہیں ہے' میٹرک کا طالب علم ہے۔ ماشاء اللہ قد تو اسید سے بھی بڑا ہو گیا ہے اس کا۔"
دادا جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ یونہی مضطرب اور بے چین سا بار بار گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتا رہا۔ آمنہ نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہم اب چلتے ہیں دادی جان! پھر کسی روز آئیں گے۔"
صدف اور عروج بھی کھڑی ہو گئیں۔
"خوش رہو بیٹا! جیتی رہو' کیسی رونق سی ہو گئی تھی تمہارے آنے سے۔ کبھی کبھی آتی رہا کرو۔"
"جی ضرور۔"
آمنہ اور صدف نے ایک ساتھ کہا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلیں۔
"اسید!" آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔
"وحید کا اسکول کہاں ہے؟ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اسکول سے پتا کر لینا تمہاری تسلی ہو جائے گی۔"
"ہاں۔" اسید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بڑبڑایا۔ "ساڑھے چھ ہونے والے ہیں اور وہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہا۔ آج کل حالات بھی ایسے ہی ہیں۔"
وہ دادا جان کو بتا کر ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
"کدھر جانا ہے اسید؟"
آمنہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔
"یہ ادھر سامنے ہی سیدھی روڈ ہے پھر چوک سے رائیٹ سائیڈ پر ہو جانا۔"
آمنہ نے سر ہلا دیا۔
"پریشان نہ ہو اسید! ان شاء اللہ وحید اسکول میں

ہی ہوگا۔"

وہ سامنے روڈ پر دیکھ رہی تھی۔

اسید کی نظریں اسٹیئرنگ پر دھرے اس کے ہاتھوں پر ٹک سی گئیں۔ بہت خوب صورت ہاتھ تھے آمنہ کے یا اسے ہی لگے تھے۔

اس نے نظریں ہٹالیں۔ وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ وحید کو اغوا کرلیں؟"

اس کے ذہن میں بس ذرا سی دیر کو خیال آیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں کتنے ہی دھمکی بھرے فون آچکے تھے لیکن وہ ان کی پروا کیے بغیر لکھ رہا تھا' وہ سب جو اس کے علم میں آرہا تھا۔ بیگم زبیدہ حسن کی این جی اوز اور ان کے کچے چٹھے۔

ایک سابق فلمی اداکارہ عذرا سبحان کا پارلر اور وہاں ہونے والی سرگرمیاں' نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کا اغوا' اور ان میں ملوث یہ پارلر اور این جی اوز۔

"تو کیا..." اس نے سر جھٹک کر دائیں طرف دیکھا۔ گاڑی وحید کے اسکول کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔

"اسید! مجھے تو اسکول ویران ہی نظر آرہا ہے' بہرحال تم اتر کر چوکیدار سے پتا کرو۔ وہ یہاں کہیں ہی ہوگا۔"

"ہاں تھینک یو آمنہ! تم لوگ جاؤ اب میں پتا کرکے پھر گھر چلا جاؤں گا۔"

اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آمنہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں اسید! تم پتا کرکے آؤ۔ میں انتظار کررہی ہوں۔ اسکول کے اندر اتنی خاموشی ہے کہ مجھے پریشانی ہوگئی ہے اور پھر گیٹ بھی بند ہے اگر میچ کھیلنے والے بچے ابھی تک یہاں ہوتے تو اتنی ویرانی نہ ہوتی۔"

اسید کچھ جواب دیے بغیر گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی پلٹ آیا۔

"چوکیدار کہہ رہا ہے کہ میچ تو چار بجے ختم ہوگیا تھا اور سب لڑکے ساڑھے چار تک چلے گئے تھے۔"

"تو پھر...؟" آمنہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے میں گھر جاکر راحیل سے اس کے دوستوں کے متعلق پتا کرتا ہوں۔"

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشہ کو ہاتھ دے کر روکا۔

"میں تمہیں گھر ڈراپ کردیتی ہوں اسید!"

"نہیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے تم [illegible] گھر جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"اسید! کیا کوئی پریشانی کی بات ہوسکتی ہے۔ تم [illegible] سوچ رہے ہو؟"

صدف نے کھڑکی کا شیشہ سرکا کر پوچھا۔

"میں سمجھتا نہیں ہوں۔ خدا کرے ایسا کچھ نہ ہو۔ لیکن کچھ لوگ دھمکیاں دے رہے تھے کئی دنوں سے۔ گو کچھ واضح نہیں تھا کہ وہ کیا کریں گے لیکن..."

"وہ ضرور کسی دوست کی طرف ہی چلا گیا ہوگا۔"

صدف نے گویا تسلی دی لیکن اسید کا دل پتا نہیں کیوں مطمئن نہیں تھا۔

ابھی کل شام ہی کو تو وہ فون آیا تھا۔

"صبح اخبار میں کل والے اداریے کے سلسلے میں معذرت اور تردید چھپنی چاہیے ورنہ انجام کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔"

اداریے میں اس نے ان نام نہاد این جی اوز اور ان پارلرز کے متعلق لکھا تھا جو بے حیائی پھیلا رہے تھے اور جن کے رابطے خلیج کی ریاستوں تک تھے۔

اس نے کسی بھی طرح کی کوئی تردید نہیں کی تھی اور...

وحید کہیں بھی کسی دوست کے گھر نہیں تھا۔

"پولیس میں رپورٹ کرواتے ہیں۔"

ابا جان نے مشورہ دیا۔

لیکن اسید جانتا تھا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے کا مطلب ہے ذلیل و خوار ہونا۔ وحید خود سے نہیں جاسکتا تھا' یہ اسے یقین تھا۔ سڑک تک وہ اپنے دوست کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس کے دوست نے

وہ پھر وہ اپنی گلی کی طرف مڑ گیا تھا تو گیا۔ گلی سے گھر تک کے فاصلے میں اس کے ساتھ کچھ ہوگیا تھا۔

"آخر کہاں چلا گیا وہ؟" دادی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسید کی طرف دیکھا۔

"کہیں کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو۔"

"میں نے مختلف اسپتالوں سے پتا کروالیا ہے۔ آج اتنی عمر کا بچہ زخمی ہوکر ایمرجنسی میں نہیں آیا۔"

سعید دادی کو بتا رہا تھا جب اسید کا سیل بج اٹھا۔ اسید نے نمبر دیکھا۔ آمنہ کا فون تھا۔

"کچھ پتا چلا وحید کا؟"

"نہیں آمنہ!"

"تمہیں جس نمبر سے دھمکیاں مل رہی ہیں اس نمبر پر چیک کرو فون کرکے۔"

"وہ نمبر کسی پی سی او کا تھا۔ میں نے اسی وقت چیک کرلیا تھا۔"

اسید نے مختصر بات کرکے فون آف کردیا تب ہی پھر بیل ہونے لگی تو اسید نے اسکرین پر نظر ڈالی کوئی اجنبی نمبر تھا۔

وہ آف کرتے کرتے ٹھٹکا اور پھر کمرے سے باہر آگیا۔

"ہیلو مسٹر اسید!" آواز اجنبی تھی۔

"آپ کون؟"

"اس سوال کو رہنے دو۔ یہ بتاؤ ہمارا سرپرائز کیسا رہا؟"

"کیا مطلب صاف بات کرو۔"

"ارے..." لہجے میں حیرانی تھی۔ "کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا کہ تمہارا بھائی آج گھر نہیں پہنچ سکا۔"

"تم..." اسید کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔

"ہاں میری جان! ہم نے کہا تھا نا تم سے کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ مت ڈالو لیکن..."

"شٹ اپ!" اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "اگر وحید کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم بلیک میلر' ڈاکو' بردہ فروش..."

"ہا ہا..." دوسری طرف وہ شخص عجیب طرح سے ہنسا تھا۔ "کیا کرلوگے تم۔ کیا حقیقت ہے تمہاری ہمارے سامنے۔ تم محض ایک معمولی قلم کار چند لفظوں پر اترا رہے ہو۔"

"دیکھو۔" اس نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھنے کی کوشش کی۔ "تمہیں جو بھی کچھ شکایت ہے یا جھگڑا ہے وہ میرے ساتھ ہے۔ میری فیملی کے افراد کو اس میں ملوث نہ کرو۔ جو کچھ کرنا ہے کہنا ہے میرے ساتھ کرو۔"

"تمہارے ساتھ ہی تو کررہے ہیں بچو!" وہ پھر ہنسا تھا۔ "ابھی تو تمہارا بھائی ہے پھر باپ پھر دادا پھر..."

"بکومت..." اس نے کہتے کہتے خود کو روکا۔

"ہاں کہو کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو' تم وحید کو چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دیں گے لیکن آئندہ تمہارے اخبار میں میڈم عذرا کے پارلر کے متعلق کچھ غلط چھپا تو یاد رکھنا پھر زندہ بھائی کے بجائے بھائیوں کی لاشیں وصول کرنا۔"

اسید ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا تھا۔

"اسید! کس کا فون تھا؟"

سعید نے جو نہ جانے کب باہر آگیا تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اسید نے ایک گہری سانس لی اور سعید کو برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اس نے تفصیل بتادی۔

"تو اب...؟" سعید اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا سعید! کہیں وہ وحید کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کرسکوں گا کہ محض میری وجہ سے۔"

اس کی آواز میں نمی تھی۔ سعید ہولے سے اس

کے کندھے تھپتھپا کر فون کی طرف بڑھ گیا۔

"آخر کیا ضرورت تھی مجھے سچائی کھوجنے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی۔ اتنے سارے سالوں سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس سے پہلے تو کسی نے آواز نہیں اٹھائی اور اگر کوئی میرے جیسا بے وقوف سچائی کا علم بردار بن کے اٹھا بھی تو کیا کر لیا اس نے۔ کوئی تبدیلی کوئی چینج... وہی سب کچھ ہے جو پہلے تھا۔ وہی رشوت' وہی کرپشن' وہی فریب' وہی دغا۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"اور میں چلا ہوں معاشرے کو سنوارنے۔ بھلا کیا کر لوں گا میں.... آج وحید کو کھو دوں گا تو کل..."

"نہیں۔" اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ "وحید کو کچھ نہیں ہوگا۔" اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔

"یار! کبھی نہ ہارنا۔" احمر نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"یہ بہت مشکل راہ ہے کانٹوں سے بھری لیکن مجھے یقین ہے تم سچائی کا علم اٹھائے چلتے رہو گے۔"

اور آفتاب حسین نے کہا تھا۔

"دیکھو اسید! کئی مقام تمہاری زندگی میں ایسے آئیں گے جب تم سوچو گے کہ شاید تم نے غلط کہا ہے۔ لوگ تو بھر بھر جھولیاں فیض یاب ہو رہے ہیں اور تم لہولہان ہو رہے ہو۔ شاید تمہیں پچھتاوا ہو کہ تم نے ایسے راستے پر قدم کیوں رکھا جس پر چلتے ہوئے تمہاری ذات سے تمہارے پیاروں کو دکھ پہنچ رہا ہے اور یہی لمحے آزمائش کے ہوں گے۔ یہیں تمہیں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہے اور اگر یہاں تم لڑکھڑا گئے تو پھر کبھی پورے قد سے کھڑے نہیں ہو پاؤ گے۔"

اسید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور ایک ندامت کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اسے وہی سب جدوجہد اور تگ ودو بے معنی لگ رہی تھی۔ اہم صدف' وحید اور اس کی زندگی تھی۔

چارپائی پر پڑا اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ شاید رنگ کی آواز پر ہی وہ چونکا تھا لیکن سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر فہد تھا۔

"یار! ابھی آمنہ نے وحید کے متعلق بتایا ہے۔ کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔"

"یہ وہ این جی او والے نہ ہوں۔" ڈاکٹر فہد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہی جنہوں نے عافیہ کو قتل کروایا ہے۔"

"نہیں۔" اسید نے اسے ساری بات بتائی۔

"پریشان مت ہونا۔ میں آرہا ہوں۔"

"نہیں۔ اس وقت مت آنا اور پھر آ کر کیا کرو گے۔"

"جو کچھ تم کر رہے ہو۔"

ڈاکٹر فہد نے فون بند کر دیا تھا اسید کو اس پر پیار آیا۔ یہ نوجوان ڈاکٹر بے حد مخلص اور محب وطن تھا اور ایسے ہی نوجوانوں کی وجہ سے یہ ملک اب تک قائم ہے۔ ورنہ جس قدر لوگ اس ملک کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں اس کا قائم رہنا کمال ہی نہیں معجزہ ہے۔

رات بہت طویل اور کٹھن تھی حالانکہ گرمیوں کی راتیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ ابھی سوئے تھے اور ابھی صبح ہو گئی لیکن آج تو رات جیسے گزر ہی نہیں رہی تھی۔ دادی اور دادا جان کو سعید نے بمشکل سلیپنگ پلز دے کر سلا دیا تھا۔ ابا جان جاگ رہے تھے۔ انہیں کسی پل چین نہیں تھا کبھی جائے نماز بچھا کر نفل پڑھنے لگتے کبھی برآمدے اور صحن میں ٹہلنے لگتے۔ سعید نے ان سے بھی سونے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں انہوں نے ایسی نظروں سے سعید کو دیکھا تھا کہ وہ اصرار نہ کر سکا۔ جانتا تھا کہ اپنے سارے بچوں میں سے انہیں وحید سب سے پیارا ہے۔ شاید سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور خود وحید بھی والدہ کی وفات کے بعد باپ سے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر فہد' سعید' راحیل میں سے بھی کوئی نہیں سویا تھا۔ عاشی اور پھوپھو بھی ادھر ہی تھیں۔ عاشی نے کتنی ہی بار چائے بنا کر دی تھی۔ اسید اور سعید' فہد کے ساتھ یوں ہی بے مقصد کتنی ہی دیر تک مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھرے تھے۔

"انتظار۔" ڈاکٹر فہد نے اسید سے کہا۔ "انہوں نے کہا تھا نا تم سے کہ وہ وحید کو چھوڑ دیں گے تو سعید کے دوست کے بھائی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ صبح تک انتظار کریں۔ اگر کوئی کال آئے تو ریکارڈ کر لیں۔"

اور صبح فجر کی نماز کے لیے عبدالرحمٰن صاحب مسجد گئے ہوئے تھے اور اسید وضو کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ سعید بے اختیار ہو کر دروازے کی طرف بھاگا۔

"یہ۔ یہ دستک دینے کا انداز وحید کا ہے۔"

اسید بھی ایک دم کھڑا ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل بے تحاشا تیزی سے دھڑک رہا تھا اور پھر سعید نے دروازہ کھول کر وحید کو جیسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا تھا۔

"وحید۔ وحید...!" وہ اسے گلے سے لگائے کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ وہ ان سب کو کتنا عزیز اور پیارا تھا اس کا اندازہ دور کھڑا ڈاکٹر فہد کر سکتا تھا۔ سعید کے بعد اسید نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"دادی' عاشی!" سعید وہیں کھڑے کھڑے چیخا۔ "وحید آگیا ہے۔" اور پھر عاشی کے پیچھے پیچھے سب ہی باہر نکل آئے۔

"ڈیرو!" اسید اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کبھی بھی خود کو معاف نہ کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔"

اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنی آنکھوں میں آجانے والی نمی کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا تو فہد نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہولے سے دبایا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

مدھم سی مسکراہٹ نے اسید کے لبوں کو چھوا اور وہ

فہد کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

"تم کچھ دیر سو جاؤ۔ یہاں میرے بیڈ پر۔ رات سے جاگ رہے ہو۔"

"ڈونٹ وری یار نائٹس بھگتا بھگتا کر عادی ہو گئے ہیں راتوں کو جاگنے کے۔ تم کچھ دیر آرام کر لیتے۔"

"ہاں کرلوں گا آرام لیکن تم بھی کچھ دیر لیٹ جاؤ۔ اسپتال بھی جانا ہو گا تمہیں تو۔ اوکے ایزیو یووش۔"

فہد مسکراتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔ جبکہ اسید جلد آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک سب وحید کو گھیرے بیٹھے تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ "جوں ہی اس نے گلی میں قدم رکھا۔ ایک شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ دوسرے نے ماؤزر کمر سے لگا دیا اور وہ چیخ بھی نہ سکا۔ اتفاق سے گلی بھی سنسان تھی۔ وہ اسے گلی کے ساتھ ہی باہر روڈ پر کھڑی گاڑی تک لے آئے۔"

"لیکن تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔ ہم کوئی امیر آدمی نہیں ہیں۔ مجھے اغوا کر کے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

اس نے احتجاج کیا لیکن وہ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔

"توبہ!" دادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کیسا زمانہ آگیا ہے کہ دن دھاڑے اتنے بڑے لڑکے کو اغوا کر لیا۔"

"انہوں نے تمہیں مارا تو نہیں۔" راحیل نے جو اس کے ساتھ لگا بیٹھا تھا پوچھا تھا۔

"نہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ بس لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ رات کو کھانے کے لیے بھی دیا اور پھر صبح یہاں گلی کے نکڑ پر اتار کر چلے گئے۔ شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں کوئی دولت مند لڑکا نہیں ہوں۔"

"ضرور یہی بات ہو گی۔" دادی نے بھی سر ہلایا۔ "بے چاروں کی محنت اکارت گئی۔"

وحید ہنسا تو اسید نے دل میں ایک اطمینان سا پھیلتے محسوس کیا۔

"سعید! کسی نے ابا کو بھی بتایا؟" اس نے پوچھا۔

"اوہ ہاں۔ میں جاتا ہوں مسجد میں۔" سعید تیزی سے صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"وحید! کیا دوبارہ وہ لوگ تمہیں نظر آئیں تو پہچان لو گے؟" اسید نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔"

"اے چھوڑو، ہمیں کیا پہچان کر کرنا۔ ہمارا بچہ واپس آگیا۔ بس اللہ کا شکر ہے کسی سے دشمنی مول لینے کی ضرورت نہیں۔ چلو سب کمرے میں کچھ دیر کمر سیدھی کر لو۔"

دادی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور عاشی! تم نماز پڑھ چکی ہو تو چائے کا پانی رکھ دو۔"

"اسید!" دادا جان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئے۔

"جی دادا جان!"

"کچھ نہیں تم جاؤ اور ہاں کہیں ڈاکٹر فہد یوں ہی بغیر ناشتے کے نہ چل دے۔ دھیان رکھنا۔ ساری رات ہمارے ساتھ پریشان رہا۔ اللہ اسے زندگی دے۔ بہت اچھا بچہ ہے۔"

اسید سر ہلا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ فہد جو جاگ رہا تھا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"میں اب چلتا ہوں۔"

"کہاں؟" اسید نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے پھر بٹھا دیا۔

"گھر۔" اس کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "گھر ہی سمجھ لو۔"

"کیا مطلب؟" اسید اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"گھر تو گھر میں رہنے والے افراد سے بنتا ہے، وہ تو ایک اپارٹمنٹ ہے بس۔ جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"تم نے کبھی اپنے متعلق بتایا نہیں فہد! تمہاری فیملی۔"

"پھر کبھی سہی۔" فہد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ابھی تو میں چلتا ہوں۔ نو بجے اسپتال بھی جانا ہے۔"

"کمال کرتے ہو یار! عاشی ناشتہ بنانے لگی ہے۔ ناشتہ کر کے جانا۔ ابھی تو بہت ٹائم ہے۔"

تب ہی سعید اندر داخل ہوا۔

"ابا آگئے!" اسید نے پوچھا۔

"ہاں۔" سعید سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے کیا تردید چھاپو گے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھے تو سب۔ نہیں سعید! شاید میرا سفر یہاں تک ہی تھا۔ شاید میں کسی بڑے امتحان کے قابل نہیں ہوں۔"

"تم اپنے راستے پر چلتے رہو اسید! پروا مت کرو کسی کی۔"

"کیسے پروا نہ کروں؟" اسید کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ "کیسے سعید! جانتے ہو گزری رات کا ایک ایک پل میں نے کتنی اذیت میں کاٹا ہے۔ کتنا کرب سہا ہے میں نے۔ اگر خدانخواستہ وحید کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں ابا کو، دادا کو، دادی کو کسی کو عمر بھر منہ دکھا سکتا تھا۔"

"ریلیکس اسید!" فہد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبراؤ مت۔ آئندہ چند دنوں تک تم ان کے متعلق کچھ بھی مت چھاپو۔ کیا صبح کے اخبار میں پارلر کے متعلق بھی کوئی آرٹیکل ہے۔"

"نہیں۔" اسید نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "یہ لوگ کچھ ایسے اونچے لوگ نہیں ہیں۔ جانتا ہوں میں ماضی کی ایک ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے والی یہ اداکارہ کوئی اتنی پاور فل بھی نہیں ہے۔ چند ایک کرائے کے غنڈے پال رکھے ہیں اس نے اور۔"

"نہیں فہد! بھلے وہ ایکسٹرا ہی سہی لیکن اس وقت اس کی رسائی عرب ریاستوں تک ہے۔"

"او کے۔ دیکھیں گے اسے بھی۔"

اس نے اندر آتی عاشی کی طرف دیکھا جو ٹرے اٹھائے آرہی تھی اور اس کے ساتھ راحیل تھا۔ راحیل کے ہاتھ میں بھی ٹرے تھی۔ سعید نے ٹیبل بیڈ کے قریب کی۔ عاشی نے ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا۔

"پراٹھے، آملیٹ، اچار۔"

فہد مسکرایا۔

"آج تو مزا آگیا۔ مدتیں ہو گئیں پراٹھے اور آملیٹ کا ناشتہ کیے۔"

"تھینکس سسٹر!" راحیل نے بھی ٹرے ٹیبل پر رکھ دیا تھا جس میں پیالا اور ٹی پاٹ وغیرہ رکھے تھے۔

"آجاؤ سعید!" اسید نے پلیٹ فہد کو پکڑائی۔

"چائے آپ خود بنا لو گے یا میں آکر بناؤں۔" عاشی نے سعید کی طرف دیکھا۔

"بنا لیں گے تم جاؤ۔ ویسے یہ پراٹھے تمہارے ہاتھ کے پکے تو نہیں لگتے۔ تم تو ساری دنیا کے نقشے بنا دیتی ہو۔"

"امی بنا رہی ہیں۔" عاشی نے برا نہیں مانا تھا۔

اسید نے اچار کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

سعید مسکراتے ہوئے پلیٹ میں آملیٹ ڈالنے لگا اور فہد کھو سا گیا۔

کہیں کسی منظر نے یادداشت کے کینوس پر ابھر کر جیسے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور وہ ارد گرد سے بے خبر سا ہو گیا تھا۔

"فہد! یہ لو نا آملیٹ، سب ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم کیا سوچنے لگے؟"

"ہاں؟" وہ چونکا۔

"کچھ نہیں۔ یوں ہی میڈم عذرا اور ان کے حواریوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا تھا لیکن اندر کہیں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

ثمرہ بخاری

ہم سے ہے زمانہ

ناولٹ

سویرے سے ہی گھر میں چہل پہل کا عالم تھا' نیلما نے سب کے کپڑے پریس کرنے کے بعد بڑی احتیاط سے کرسیوں کی بیک پر ڈالے تھے اور اب کرسیوں پر بیٹھنے پر مکمل پابندی تھی' دادی نے اپنی چادر دھلوائی تھی۔

"یہ مئی کی تیز دھوپ ہے' کپڑا زیادہ دیر دھوپ میں ڈالو تو رنگ خراب ہو جاتا ہے۔"

سرمئی کلر کی چادر میں ابھی ہلکی نمی باقی تھی کہ لا کر لاؤنج میں صوفے پر پھیلا دی گئی تھی تو اب صوفے پر بھی کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا' تمام اہل خانہ جس میں شبلی کی امی' نانا' ماموں اور خود شبلی بھی شامل تھا' نیچے کارپٹ پر ہی بیٹھے تھے۔

دادی نے کل شام کو ہی نیلو سے سر میں مہندی بھی لگوائی تھی' عام طور پر دادی سفید بال ہی پسند کرتی تھیں' لیکن آج تو بات دوسری تھی' ان سب کو دادی کے دور پار کے عزیز ٹھیکے دار نذیر احمد کے گھر جانا ہے۔ انہوں نے کافی عرصہ بے ایمانیوں کی بدولت خاصی دولت جمع کرلی تھی اور محل نما گھر بنایا تھا آج اس گھر کی نمائش کی جا رہی تھی۔ یعنی تمام رشتہ دار دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے۔

جس وقت یہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا' شبلی کافی خوش تھا کہ زیبا بھی تو مدعو ہوگی اور اچھی خاصی ملاقات ہو جائے گی' لیکن صبح ہی فون کرنے پر پتا چلا ہے' زیبا کو کالج اور اپنی اسٹوڈنٹس کا مستقبل زیادہ عزیز ہے' بہ نسبت نذیر انکل کے ہاں پکنے والے قورمے اور پلاؤ کے' اس لیے وہ تشریف نہیں لے جا رہیں' سنتے ہی شبلی کے ارمانوں پر بھی اوس پڑ گئی' جوادی تو پہلے ہی ٹھیکے دار کی شوباز طبیعت اور ان کی بیگم کی پھرتی مرچیلی طبیعت سے عاجز تھا۔ صرف شبلی کی وجہ سے شرکت مجبوری تھی' اب جو شبلی نہیں جا رہا اس نے بھی گھر پر رہنے کا فیصلہ کیا۔

"میں تو کہتی ہوں' اب بھی اٹھ کر کپڑے بدل دو' چلو ہمارے ساتھ' اے شبلی! تو ابراہیم کا سفید کرتا پاسجامہ پہن لے' ذرا معتبر لگے گا اور جواد تو بھی ڈھنگ

کے کپڑے پہن لے‘ میں بتا تو سکوں‘ اب میرے پوتے بھی ذمہ دار انسان بن گئے ہیں۔“

دادی کی بات پر نیم دراز شبلی اٹھ بیٹھا اور بولا۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے‘ سفید کرتا پاجامہ پہن لینے سے انسان ذمہ دار ہو جاتا ہے۔“

”تو اور کیا‘ سفید کپڑوں کو داغ دھبوں سے بچانا ہر کسی کے بس کی بات تھوڑی ہے۔“ جوادی نے سر ہلا کر بات کو آگے بڑھایا۔

”وے نئیں دے‘ میرا مطلب تھا‘ سب کو بتاؤں گی‘ اپنا اسکول چلا رہے ہیں‘ اب تمہارے جو حلیے ہوتے ہیں‘ لوگ تو مخول ہی سمجھیں گے‘ تا میری بات کو اسی لیے کہا ہے ڈھنگ کے کپڑے پہن لو۔“

”ہاں شبلی! پہن لے ’تانا‘ ماموں کا پاجامہ ویسے بھی آج کل نیکر نما پاجامے لڑکیوں میں تو اِن ہیں ہی تو پہنے گا تو لڑکوں میں بھی ہو جائیں گے اور ساتھ میں سفید کرتا‘ پاؤں میں ملتانی کھسہ‘ واہ واہ۔“

جوادی نے تصور کی آنکھ سے شبلی کو ٹخنوں سے اونچے پاجامے اور کرتے کھسے میں ملبوس دیکھ لیا تھا اور مسلسل داد دے رہا تھا۔

”وے ہاں! ابراہیم کا قد تو تیرے سے چھوٹا ہے۔“ اب جا کے دادی کو بھی خیال آیا‘ پروگرام بدلا‘ بولیں۔

”چل رہن دے‘ تو اپنا ہی کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہن لے۔“

”ہمارے لیے تو کسی نے محلے کے پچھواڑے والے بازار سے بھی شاپنگ کرنا گوارا نہیں کیا‘ ڈھنگ کے کپڑے آخر کہاں سے آئیں گے؟“

”جتنے بھی کپڑے بنوا دو‘ تم لوگ دو ہفتے میں ناس مار لیتے ہو۔“ تائی امی کی نظروں میں پرانے منظر فلم کی مانند چلنے لگے۔

دونوں نے جواب نہیں دیا‘ آدھے گھنٹے کے بعد سب لوگ‘ اباجی کی پرانی گاڑی میں پیک ہو کر روانہ ہو گئے۔ اب گھر پر یہی دونوں تھے‘ دن کے بارہ بجنے کو تھے‘ گرمی کی شدت پچھلے دنوں کے مقابلے میں آج زیادہ تھی‘ لائٹ چلی گئی تو دونوں اٹھ کر صحن میں لگے جامن کے درخت کے نیچے آ بیٹھے‘ بمشکل [illegible] ہی بیٹھے ہوں گے‘ جوادی نے آہ بھر کے [illegible] بھرے جامن کی جانب دیکھا‘ پھر شبلی کی طرف دیکھا جو بار بار پسینہ پونچھ رہا تھا۔

”دادی اپنا نیا لان کا سوٹ چھت پر پھیلا کر [illegible] تھیں‘ کہہ رہی تھیں بس پانچ منٹ ہی اوپر ڈال [illegible] نیچے لا کر چھاؤں میں رکھ دینا‘ میرے تو پیر میں تکلیف ہے۔ تم ذرا چھت پر جا کر لے آؤ۔“

”کیا کرتا ہے یار! اتنی گرمی میں میں تو پگھل [illegible] گا۔“ جوادی نے انکار کے ساتھ نہ جانے کی وجہ [illegible] بتادی۔

”تم آئس کریم نہیں ہو‘ جاؤ جلدی لے آؤ [illegible] سوٹ ہے‘ ان کا بڑے شوق سے بنوایا ہے‘ میرے [illegible] میں اس قدر درد نہ ہوتا تو میں خود جا کر لے آتا۔“ [illegible] کی شدت سے گھبرا کر جوادی کو اٹھنا پڑا‘ چھت پر [illegible] وہاں سے جھانک کر اطلاع دی۔

”سوٹ غائب ہے‘ دو ہی وجوہات قابلِ غور ہیں [illegible] کسی پڑوسن کا دل آگیا ہے اور وہ لے اڑی ہے یا [illegible] گستاخی ہوا کی ہے۔“

”پہلی وجہ قابلِ غور ہے‘ آس پاس کی چھتوں [illegible] تلاش کرو اگر کسی عورت کا سایہ بھی کسی چھت [illegible] دکھائی دے رہا ہے تو لپک کر دبوچ لو۔“

”پیارے! اس وقت مارے گرمی کے میری [illegible] آنکھوں کے آگے ویسے ہی کئی کئی شکلیں بن اور [illegible] رہی ہیں۔“

”اچھا پھر آجاؤ۔“ جھٹ اجازت دی گئی‘ جوادی جیسے تیسے نیچے اترا اور آ کر جامن تلے بچھی چارپائی پر گر کر ہانپنے سا لگا۔

شبلی نے غور سے صورتِ حال کو دیکھا‘ پھر [illegible] انداز میں سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔

”چل کچن میں چلتے ہیں‘ فریج میں جو بھی پڑا [illegible] گرم کر کے کھاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔“

”تمہیں میری اماں کا تو پتا ہے فریج کے تو ویسے [illegible] بڑی خلاف ہیں اور باسی سالن جمع کرنا ان کے نزدیک [illegible] کی علامت ہے۔“

[illegible] مطلب؟ یعنی کہ کچھ نہیں پڑا۔“

[illegible] اپنے گھر سے لے آؤ۔“ جوادی نے مشورہ دیا۔

”ہمارے ہاں تو صبح ہی امی نے فریج کی صفائی کی ہے [illegible] صفائی کی ہے اور اب وہ ظالم خالی بالکل نواں نکور [illegible] ہے۔“

[illegible] ”نہیں ہمارے گھر والوں کا۔“ جوادی [illegible] شبلی نے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔

”یار جوادی! یہ جو خوشبو آ رہی ہے‘ قیاس ہے کہ [illegible] زیادہ دور نہیں۔“

”ہو یار! بلکہ لگتا ہے۔ بانو پکا رہی ہے۔“

”بس پھر تو مزے ہو گئے‘ دیکھنا۔ ابھی دروازے پر دستک ہو گی۔“ جوادی پر جوش ہوا۔

”لگتا ہے قورمہ بن رہا ہے اور کبھی کبھی ساتھ میں بریانی کی خوشبو بھی شامل ہو جاتی ہے۔“ شبلی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ماہرانہ تبصرہ نشر کر رہا تھا‘ لیکن جوادی اب بالکل خاموش اور کسی گہری سوچ میں گم [illegible]

”کیا ہوا‘ کیا آج آلو ٹنڈے کھانے کا موڈ ہو رہا تھا؟“ شبلی نے اس کی بے توجہی کو نوٹ کر کے قیاس لگایا۔

”ہاں‘ کاش آج ادھر آلو ٹنڈے ہی پک رہے ہوتے۔“

”بہت برا قورمہ بناتی ہے کیا؟“

”او نہیں یار! قورمے‘ بریانیاں کتنے بڑے خطرے کی علامت ہیں‘ تم نہیں سمجھ سکتے‘ یہ تو غریب لوگ [illegible] دال سبزی سے آگے کچھ سوچتا ہے تو بانو کا چھوٹا [illegible] ہمارے ہاں پوچھنے آجاتا ہے کہ تھوڑا سالن ہو گا تو [illegible] آج یہ منحوس خوشبوئیں بتا رہی ہیں [illegible] طوفان کی آمد آمد ہے۔“

شبلی نے کچھ نہ سمجھ کر آنکھیں مٹکائیں‘ لیکن پھر [illegible] کھٹک گیا۔

”لگتا ہے مئی کی چلچلاتی دھوپ تمہارے دماغ کو [illegible] لگ گئی ہے۔“

”او نئیں او نئے‘ میرے تو دل کو لگ گئی ہے دھوپ۔“ شبلی حیران ہوا۔ ”تم مسلسل میرا سر کھا رہے ہو‘ اندر جاؤ اور ایک گلاس پانی لے کر آؤ میرے لیے۔“

اس وقت گلی میں چھن چی رکنے کی آواز آئی‘ جوادی چوکنا ہوا‘ اٹھا اور ذرا سا گیٹ کھول کر جھانکا‘ شبلی کو بھی تجسس ہوا اور پیچھے جا کھڑا ہوا۔

”جس کا ڈر تھا آخر ہو گیا نا وہی کام۔“ اب کے جوادی صرف سنجیدہ تھا۔

”اگر اب بھی تم نے مجھے کچھ نہ بتایا تو میں دھوپ میں جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔“ شبلی نے دھمکی دی۔

”او یار! بتایا تو تھا‘ بانو کی خالہ اپنے لفنگے بیٹوں کے ساتھ آ رہی ہے۔“

”خالہ لفنگے بیٹے‘ یار رات ہی سلطان راہی مرحوم کی ایک پنجابی فلم دیکھنے کا حسن اتفاق ہوا ہے‘ بالکل ایسے ہی سچویشن بار بار دکھائی جا رہی تھی‘ دشمنوں کی طرف سے خرانٹ خواتین اور لفنگے نوجوان تانگے بھر بھر کر آتے ہیں۔ ادھر ہیرو صاحب اکیلے ڈانگ لے کر استقبال کو کھڑے ہیں اور استقبال بھی ایسا کہ میں تو دیکھ کر دیر تلک سر دھنتا اور عش عش کرتا رہا‘ غریب چیختے چلاتے معافی پر معافی مانگتے‘ واپس بھاگتے ہیں۔“

سن کر جوادی کی نگاہوں کی چمک واپس آئی‘ بولا۔

”باس! آج سے مجھے بھی سلطان راہی مرحوم کا دوسرا روپ سمجھ لو اور ان آنے والوں کو تانگے میں بیٹھے دشمن۔“

”کمال ہے‘ بیٹھے بٹھائے اچھی بھلی صورت سے کیوں خار کھانے لگے ہو‘ جو سلطان راہی کا روپ اپنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔“

”تمہیں کیا پتا‘ تم کیسے سمجھ سکتے ہو‘ تمہارے پیار کی راہ میں کوئی ظالم سماج ہے ہی نہیں۔“

”تو اس میں طنز والی کون سی بات ہے‘ میں نے نہیں کہا تھا‘ ادھر دل لگاؤ۔“

”خیر! میں بھی ان دیواروں کو گرا کر دم لوں گا۔“

"کیوں مسلسل خطرناک باتیں کر رہے ہو جوادی! دیواروں تلے کیا سونا دفن ہے' جو گرانے پر تل گئے ہو' جاؤ۔ اندر سے کوئی اخبار ہی لے آؤ' اس کو ہاتھ کا پنکھا بنا کر ہوا لوں تو شاید کچھ چین پڑے۔"

"اخبار میں گرما گرم خبریں ہوتی ہیں' ہوا بھی گرم ہی آئے گی' جوادی یار! اٹھو اور ہمت سے کام لے' چل پڑوس میں چلتے ہیں' وہی بہانہ بہت ہے کہ والدہ صاحبہ ہمارے لیے کھانے کا انتظام کیے بغیر ہی تشریف لے گئی ہیں۔ ہم پڑوس پر حق جتانے اور یاد دلانے آئے ہیں۔"

"آں ہاں' ہاں کہتا تو ٹھیک ہے۔" جوادی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

پڑوسی کے دروازے کے ساتھ ہی ان کی بیٹھک بھی تھی' جس کی کھلی کھڑکی پر پردہ لہرا رہا تھا' یوں نگاہ اندر جانے سے قاصر تھی' البتہ کان قہقہوں اور باتوں کی آوازیں مسلسل سن رہے تھے۔

"دیکھ لو' خالہ جی کو کیسے چہچہا رہی ہیں۔" جوادی کو پھر غصہ آیا۔

"ظاہر ہے ان کی بیٹی کا ڈولا اٹھنے کی امید بندھی ہے' چہچہائیں گی نہیں۔" شبلی نے لاپروائی دکھائی۔

"میں اس ڈولے کو آگ لگا دوں گا۔"

"فی الحال منہ بند رکھو' ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر سنہرے خیالات کا اظہار فرماؤ گے تو کھانا نہیں ملے گا۔"

دو بار دستک دینے کے بعد دروازہ بانو کے دس سالہ بھائی صاحب نے کھولا' دروازہ کھلنے سے پہلے ہی وہ بتیسی نکالے ہوئے تھے' سو جو دروازہ کھلا تو وہی تصویر ان کے سامنے آئی۔

"تمہیں پتا تھا' ہم آئے ہیں جو اتنے خوش ہو رہے ہو۔"

"نہیں جی۔ آپ کو نہیں پتا' ہمارے گھر مہمان آئے ہیں' بڑی دور سے اور بڑی سوغاتیں لائے ہیں' آئیں آیئے نا! اندر آجایئے۔"

وہ کمرے جیسے بانو کے ہاں بیٹھک کہا جاتا تھا' اسی میں چلے آئے۔

بیٹھک آج واقعی بیٹھک تھی کہ یہاں وہاں [illegible] بیٹھے تھے۔ انہوں نے سلام کیا تو انہیں بھی بیٹھنے [illegible] گیا۔

"یہ پڑوسی ہیں' بڑا پیار ہے ہمارے گھروں میں۔" بانو کی والدہ یعنی خالہ محترمہ نے کچھ زیادہ ہی چہک کر تعارف کروایا۔

مہمانوں نے بھی بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ادھر دیکھا' جہاں مکمل بے گانگی ہی بے گانگی تھی۔

"یہ جواد ہے ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا اور یہ تو پورا گھر ہی پڑھا لکھا ہے' دونوں لڑکے بھی اسکول چلا رہے ہیں۔"

اتنی تعریفیں' تو لڑکی دیتے ہوئے ادھر نظر کیوں نہیں پڑی' جوادی نے جل کر سوچا اور چہرے پر بے زاری کا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔

"آہو! یہ تو میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی پڑھے لکھے لوگ ہیں' جب ہی تو اوپر (بیگانے) سے ہیں' ہمارے جیسے ہوتے تو کھلی بانہوں سے نہ ملتے بھلا۔"

خاتون خیالات کا اظہار کرنے میں کھلی ڈلی تھیں' ویسے بھی ان لڑکوں کی طرف سے یوں نظر انداز کیا جانا معزز مہمانوں کو یقیناً توہین ہی محسوس ہوئی تھی۔

"ہمارے شہر میں تو ایک گھر کا مہمان پورے محلے کا مہمان ہوتا ہے۔" ایک جگر گوشے نے بھی انہیں نظروں میں رکھ کر طنز کیا اور آئندہ کے لیے ان کی لسٹ میں اپنا نام لکھوا لیا۔

"تمہارے شہر کی تو کیا ہی بات ہے' ہم تو بڑا ہی پیار کرنے والے لوگ ہیں' بڑے شہر والے محبت کے اس سواد کو کیا سمجھیں۔"

جوادی کو لگا یہ خاتون صرف اسے سنانے کے لیے ہی پیار محبت جیسے الفاظ استعمال کر رہی ہیں' "کوڑا [illegible] ہیں کرنا ہے' جو کر لو ہم تو لڑکی لے کر ہی جائیں گے۔"

"تو آپ لوگ اپنے شہر سے اسی وجہ سے نکلے گئے ہوں گے کہ وہاں سارے پیار محبت کرنے والے بستے تھے۔" شبلی کی معصومیت سوال کرتے وقت [illegible]

دیدنی تھی۔

"آئے ہائے۔ ہم کیوں نکالے جاتے بھلا' ہم تو چند دنوں کے لیے ادھر آئے ہیں۔" پھر واپس اپنے شہر چلے ہی جائیں گے۔"

برابر بیٹھے اندر والی سائیڈ پر کھلنے والی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کرتے صاحبزادے کو ٹھوکا دیا تو وہ گرتے گرتے بچے۔

"دیکھ کے خالہ جی' ایک تو بیٹے آپ کے سارے کے سارے الیشوریا بچن کی طرح اسمارٹ ہیں۔" شبلی نے لپک کر بڑے زور سے لڑکے کو تھام لیا۔

"او چھوڑو اوئے یہ کس سے مذاق کر رہے ہو زنانیوں سے' ہم نہیں ملتے وِلتے' حوالہ دینا ہے تو کسی مرد کا دو' ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں اماں؟"

"کچھ نہیں پتا نہیں۔ دھیان کدھر ہے' ماں کی کبھی سنی ہے جو اب سنو گے' یہ تو میں لکھ کے دینے کو تیار ہوں' کرتوت آگے آئے ہیں۔"

"او چھڈ دی اماں! میں ذرا پانی پی آؤں' پیاس لگی ہے۔"

"بیٹھیے منگوا دیتا ہوں۔" شبلی تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں' میں لے آتا ہوں۔" "ارے یہ مہمان نوازی بھائی نہیں۔"

جوادی نے یہیں سے بانو کے چھوٹے بھائی کو پکارا اور پانی کا جگ لانے کو کہا۔

ذرا دیر بعد پانی حاضر تھا۔

"لو جی پورا جگ منگوا دیا ہے' اب کسی کو اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" شبلی گلاس بھر بھر کر سب کو پلانے لگا۔

جوادی نے موقع دیکھ کر اندر کی راہ لی' اس گھر میں کوئی پردہ تو نہیں تھا' بچپن سے اس گھر میں آنا جانا تھا' لیکن جوان ہونے پر اک پابندی خود بخود ہی عائد کر لی تھی' اب وہ کبھی بے تکلفی سے ان کے ہاں نہیں آتا تھا' لیکن آج تو بات ہی دوسری تھی' اٹھا اور سیدھا کچن میں چلا آیا' جہاں بانو تندہی سے کھانے بنانے میں لگی

ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں پکاؤ' پکاؤ' کھلاؤ انہیں' راستہ بناؤ ان کے دلوں تک' میں تو سمجھ رہا تھا تم آٹھ آٹھ آنسو بہانے کھیر میں مرچیں اور کوفتوں میں چینی ڈال رہی ہو گی' پر یہاں تو....."

"میں نے کسٹرڈ بنایا ہے اور قورمہ' کھیر اور کوفتے تو بنائے ہی نہیں۔" (واہ رے اے معصومیت)

"تو اب بنا لو۔ کس نے روکا ہے۔" انداز کاٹ کھانے والا تھا۔

بانو سمجھی نہیں' کچھ دیر اس کا بگڑا موڈ دیکھتی رہی' پھر دھیرے سے بولی۔

"مجھے کیا پتا تھا آپ کا دل کھیر اور کوفتوں کے لیے چاہ رہا ہے' کل بنا دوں گی۔"

"ہاں' ہاں جیسے تم یہ سب میرے لیے ہی تو اہتمام کر رہی ہو نا!" انداز مزید طنزیہ ہوا۔

"وہ مہمان آئے ہیں' پھر نہ کچھ تو بنانا ہی تھا۔"

"جوادی!" آہستگی سے شبلی نے پکارا' اسے پلٹنا پڑا۔

"یار! پاگل تو نہیں ہو گیا' کچن میں پہنچ گیا' لڑکی کے پاس۔" وہ بیرونی دروازے کے قریب کھڑا تھا' جوں ہی جوادی قریب پہنچا' دھیمی آواز سے ڈانٹنے لگا۔ جوادی کچھ سوچ کر چونکا۔

"یار! خوامخواہ تم نے بلا لیا۔ اچھا ہے نا' سب دیکھیں' سب کو پتا چلے' لڑکی کا تو پڑوسیوں کے لڑکے کے ساتھ افیئر چل رہا ہے۔"

"کیوں بانو کے ابا کو ہارٹ اٹیک کروانے کا ارادہ ہے' تمہیں پتا تو ہے' وہ بڑا غیرت مند ہے' مجھے یقین ہے ہارٹ اٹیک سے پہلے وہ بانو پر اٹیک کرے گا' اسے مار کر ہی وفات پائے گا۔"

"ہاں! چچا ہے تو کچھ ایسے ہی مزاج کا اور یہ بانو کی والدہ یعنی خالہ جی' یہ کون سا کم ہے' میرا خیال ہے یہ خود ہی لڑکی کا گلا گھونٹ دیں گی۔" جوادی نے بھی اتفاق کرنے کے ساتھ مزید خدشے کا بھی اظہار کیا۔

"تو کیا' پھر تم بانو کی زندگی نہیں چاہتے؟؟"

"آؤ' چلو گھر چلتے ہیں۔" جوادی بے حد اداس تھا۔

"وے پتر جوادی! شبلی! بیٹھو نا' اب روٹی ہمارے ساتھ کھا کر ہی گھر جانا۔" خالہ کی محبتیں بے مثال تھیں' ہاتھ تنگ' لیکن دل کھلا تھا۔

جوادی تو شاید انکار کر دیتا' لیکن شبلی جھٹ راضی ہو گیا' دونوں پھر بیٹھک میں آ بیٹھے۔

"خیر سے کتنا کما لیتے ہو دونوں؟" خاتون نے اب کے انداز بدلا۔

"چالیس' پچاس تو کہیں نہیں گئے۔"

"ہائیں اچھا!" آنکھیں پھیلیں' پھر باچھیں۔ (خود سے ہزار کا اضافہ جو کیا تھا۔)

"کتنے سادہ مزاج اور نیک شریف ہو' آج کل کے لڑکے تو بڑے ہی اوچھے ہوتے ہیں' میں بندے کی بڑی پہچان رکھتی ہوں۔ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی' ہو خاندانی نا! ویسے ان کے گھر کیا کرنے آتے ہو' ادھر تو تمہارے جوڑ کا ایک بھی نہیں۔"

محترمہ کس طرح ہیر پھیر کر' اپنے مطلب پر لا رہی ہیں' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ہاں جی! مطلب کا تو ایک بھی نہیں' بلکہ سچ کہوں تو آپ کے مطلب کا بھی کوئی نہیں ہے۔ آپ تو مجھے اپنی سگی پھوپھی کی طرح لگ رہی ہیں۔"

جوادی جگہ سے اٹھا اور ان کے پہلو میں جا بیٹھا کہ موقع غنیمت تھا' خالہ جی اس وقت بانو کو کچھ ہدایتیں دینے کچن کی طرف گئی تھیں۔

"نہیں۔ میں تو اس طرح کہہ رہی تھی کہ ادھر کوئی نہ کوئی اتنا پیسے والا ہے نہ پڑھا لکھا' باقی یہ تو میں جانتی ہوں' یہ گھر محبتوں میں کنجوس نہیں ہے۔" (چلو جی بات ہی ختم' خاتون کے خیالات تو بہترین تھے۔)

"آہاں' دور کے ڈھول سہانے۔" شبلی [illegible] کے انداز میں ہنسا۔

"ہاں جی! یہ تو ٹھیک کہا ہے بھائی جان آپ نے' قسمیں! ادھر ہمارے پڑوس میں شادی بھی [illegible] رات کے بارہ ایک بجے تک ڈھولک بجا کر [illegible] کس کس سے انتقام لیتی تھیں' نیندیں حرام ہو گئی

تھیں ہماری تو' برابر میں جو گھر تھا اور میں یہی سوچتا تھا' کاش ہمارا گھر یہاں سے دور ہوتا یا یہ پڑوس دوسرے محلے میں بستے۔"

بڑے صاحبزادے نے شبلی سے پورا اتفاق کیا' مگر [illegible] ہوا کہ شبلی کو اس اتفاق سے ذرا خوشی نہیں ہوئی۔

"تو جی سب نیچے دری پر آ جاؤ۔ میں دسترخوان بچھا رہی ہوں۔" خالہ جی نے آ کر اعلان کیا اور مسرت کی لہر دوڑا دی' ذرا سی دیر میں سب دری پر تھے۔

"اے میں نے کہا نسرین! لڑکیوں سے کہو نا تم کیوں لگی ہوئی ہو۔"

"وہ کھانا لا رہی ہیں آپا!"

"ویسے بڑے ہی اچھی لڑکیاں ہیں تمہاری' میری بانو کی طرح ہی کام میں پھرتیلی۔"

"ہاں بانو کی تعریف تو ضرور کریں گی ان کے سامنے۔" جوادی نے کلس کر پہلو بدلا۔

"اے پھڑو جی پھڑو' گرم ہے ذرا' احتیاط کے ساتھ۔" آواز اور لہجہ بانو کا نہیں تھا۔ نگاہ اٹھائی' سامنے دو اجنبی لڑکیاں کھڑی تھیں' خوب کڑھائی والے کپڑے پہنیں تھیں یقیناً "یہیں ہیں وہ' جن کی تعریف ابھی خالہ کر رہی تھیں۔

"آ جاؤ نی اب تسی ساریاں بھی' بانو کو بھی بلا لو۔"

"اچھا ای جی! پہلے کھانا رکھ تو لیں' پھر بار بار اٹھنا پڑے گا۔" لڑکیاں واپس ہو لیں۔

"میرا خیال ہے میں لڑکیوں کے لیے دوسرے کمرے میں دسترخوان بچھا دیتی ہوں۔"

نسرین کو بانو کے یہاں آ کر کھانے پر اعتراض تھا کہ یہاں ان کے گھر کی روایت نہیں تھی۔ ساتھ میں مہمان لڑکیوں کا کھانا بھی اندر والے کمرے میں ہی لگا دیا گیا۔

"پکایا تو بڑا کچھ ہے' پر ذرا بھی سواد کا نہیں ہے۔"

جونہی خالہ پانی لینے باہر نکلیں' کھانے سے انصاف کرتی خاتون میزبان بچوں سے ذرا پرے ہو کر دھیرے سے شبلی کے کان میں بولیں اور شبلی کے ساتھ ساتھ جوادی نے بھی پرزور انداز میں اثبات میں گردن ہلائی۔

"آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی' پھوپھی جی! اصل میں ان کے ہاں کہاں ایسے کھانے بنتے ہیں' بے چاری نے ادھر ادھر سے ترکیبیں پڑھ کر کھانا بنایا ہو گا۔"

"ہائے ہائے!" افسوس کا اظہار کیا' پھر بولیں "کسی دن کہوں گی' جمیلہ سے تمہیں قورمہ بنا کر کھلائے' میری جمیلہ' انیلا بڑا ہی اچھا کھانا بناتی ہیں' ہم بھی تمہاری طرح کھاتے پیتے لوگ ہیں' یہ قورمے' بریانیاں ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں' روز ہی کھاتے رہتے ہیں۔"

"پھر میں خالہ سے کہے دیتا ہوں' دالیں پکائیں' آپ کے لیے وہ تو نئی ہوں گی نا' سواد آ جائے گا۔" شبلی نے جھٹ سے کہا تو گھبرا گئیں۔

"نا' دال ہم کہاں کھا سکتے ہیں' بس تو اس بات کو یہیں چھوڑ دے' کچھ نہ کہنا وچاری سے' دل ٹوٹ جائے گا اس کا۔"

"کیسی مکار عورت ہے خالہ اس کی بانو کی ساس بنانا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں کس بات کا بدلہ لے رہی ہیں' معصوم سے۔" جوادی نے جذباتی ہو کر ہاتھ میں تھاما گلاس زور سے پٹخا۔

"کیا ہوا؟" سب ہی نے ان کی جانب دیکھا "زیادہ مرچیں کھا لے تو جذباتی ہو جاتا ہے' چل شاباشے یہ دہی کھا لے' اس میں مرچیں نہیں ہیں۔" شبلی نے سب کی تشفی کرا کے اسے مشورہ دیا۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔" جوادی نے اٹھنا چاہا۔

"بیٹھو نا انیلا سے کہتی ہوں' چائے بنا لے پی کر جانا' بڑی سوادی چائے بناتی ہے۔"

"اس گرمی میں چائے پی لے گا تو اور بھی جذباتی ہو جائے گا' جانے دیں اسے۔" شبلی نے سلاد کی پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔

"اچھا گرمی زیادہ لگتی ہے۔" اتنا کہہ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا' پھر فرمایا۔

"بالکل میری انیلا کی طرح۔"

"اماں!" جوان بیٹا بہن کی عادت پرائے لڑکے سے

جوڑنے پر جذباتی ہو کر چلایا۔

"کیا ہے وٹے نہ ہر ویلے کا کابن کے مجھے بلاتا رہا کر۔ یہ دونوں تیرے بھائی آئے بیٹھے ہیں' مل کر پروگرام بنالو۔ کل ہی شہر کی سیر کو چلیں گے۔ ویسے بھی ہم یہاں اس چھوٹے سے گھر میں سڑنے کے لیے تھوڑی آئے ہیں' ابھی راستے میں رکشہ جس سڑک سے گزرا تھا۔ ساتھ ساتھ نہر بہتی تھی' کنارے کنارے گھنے درخت' ہری ہری گھاس' ہائے ربا جی تو کرتا تھا بس یہی اتر جاؤں' نہر میں پاؤں ڈال کر بیٹھوں اور تربوز کھاؤں۔"

"تو پھوپھی جی! یہ کون سا مشکل ہے' آپ تربوز خرید لیجیے گا' ہم کل ہی آپ کو نہر پر لے جائیں گے۔" شبلی نے خوش خبری سنا کر سب کو خوش کر دیا۔

"یہ بچہ بڑا گم صم ہو رہا ہے۔" پھوپھی جی کو جوادی کی چپ سے تشویش ہوئی۔

"کھانا کھا کر یہ ایسے ہی سست ہو جایا کرتا ہے' فکر نہ کریں' تھوڑی دیر بعد پھر بولنے لگے گا۔"

"تم لوگ تو محلے دار ہو' جانتے ہو گے ان کے گھر کے حالات کیسے جا رہے ہیں' بھائی جی کتنا کما لیتے ہیں' ان کے منڈے تو ابھی چھوٹے ہیں اور پھر پڑھنے پر بھی لگا دیے ہیں' پتا نہیں یہ مشورہ کس عقل کے اندھے نے دیا ہے انہیں' بھئی جب گھر میں دانے نہیں تو ایسے بکھیڑوں کی کیا ضرورت ہے۔"

اور چونکہ یہ مشورہ جوادی کے ابا کا تھا' تو یقیناً" پہلو بدلنا تو حق بنتا تھا۔

"بھئی۔ ہم تو اپنے بڑوں سے یہی سنتے آئے ہیں' یہ پڑھائیاں' لکھائیاں' دماغ میں خشکی پیدا کر دیتی ہیں' پھر بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔ اسی لیے کبھی کسی بچے پر پڑھنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا' ہاں پر میری کڑیوں کو شونق (شوق) تھا۔ دونوں پوری آٹھ' آٹھ جماعتیں پڑھ گئی ہیں' ان کا ابا تو جب لاڈ کے موڈ میں ہوتا ہے' انہیں پروفیسر پتر ہی کہہ کر بلاتا ہے۔"

"سبحان اللہ۔ ابا اور ابا کا لاڈ زندہ باد' بس کوئی پروفیسر یہ لاڈ یہ فقرہ نہ سن لے۔" جوادی بڑبڑایا۔

"یہاں اس شہر میں سیر کرنے والی کون کون سی جگہیں ہیں؟"

بڑے صاحبزادے نے سوال کیا اور چونکہ بڑا صاحبزادہ ہی جوادی کو سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا' اس لیے جواب دینے کے بجائے تپائی پر پڑی کتاب اٹھا لی۔ عنوان تھا "ٹارزن اور چھن چھنگلو" "یقیناً" یہ ٹارزن کے کسی برادر عزیز کی ہو گی' اس وقت تو جوادی کی ساری دلچسپیاں اسی کتاب میں سمٹ آئی تھیں۔

"بتایا نہیں جی' آپ نے؟" اب وہ شبلی سے پوچھ رہا تھا۔

"مقامات تو بہت سے ہیں' اب یہ تو اپنے اپنے مزاج پر ہے نا!"

"میں نے سنا ہے' ادھر مزار بھی بہت ہیں' میلے لگتے رہتے ہیں' وہاں پر اور جلیبیاں' قتلمے' کچوریاں بڑی سوادی بکتی ہیں' ان مزاروں پر۔" پھوپھی جی کی معلومات پر شبلی جھوم اٹھا اور بولا۔

"کوئی ایسے ویسے میلے سمجھیں' یہ تو شہر ہی میلوں ٹھیلوں کا ہے۔"

"ہمیں بھی دکھائیں نا' میلہ۔ وہاں پر موت کا کنواں بھی ضرور ہو گا۔" لڑکے بڑے خوش اور پرجوش تھے۔

"موت کے لیے کنویں پر جانے کی کیا ضرورت ہے' گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹکا جا سکتا ہے۔" جوادی نے کتاب بند کر کے سمجھایا تھا۔

"او نہیں جی نہیں۔ آپ سمجھے نہیں ہو۔"

"ہاں۔ تم پڑھو اپنی کتاب' جو مزہ کنویں میں ڈوب کے مرنے میں ہے وہ بھلا پنکھے کے ساتھ لٹکنے میں کہاں۔" شبلی نے کتاب کھول کر دوبارہ جوادی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"نی کڑیو! نی جمیلہ! انیلا کدھر جا کر بیٹھ گئی ہو۔ ادھر آؤ' سیروں کے پروگرام بن رہے ہیں۔" پھوپھی نے صحن کی کھڑکی کھول کر آواز لگائی۔

جمیلہ' انیلا کے ساتھ ساتھ خالہ نسرین بھی یقیناً اعلان سن کر ہی چلی آئی تھیں' لڑکیاں جتنی خوش

دکھائی دے رہی تھیں' خالہ کے چہرے پر اتنی ہی پریشانی تھی' آتے ہی بولیں۔

"بڑی گرمی پڑ رہی ہے' اس گرم موسم میں سیر' سر کو لو لگ جائے گی' پھر دن تو بخار ہو جائے گا۔"

"نی چپ دی کرو۔ کیوں منحوس الفاظ زبان سے نکالتی ہو۔ کچھ خیال کرو۔ مہمان ہیں تمہارے گھر میں" پھوپھی' خالہ نسرین سے خفا ہو گئیں۔

"ہم اس فینسی شہر کے رہنے والے نہیں ہیں کہ چلتی ہوا بھی برداشت نہ ہو۔ ہمارے گھر میں آٹھ آٹھ گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے بغیر پکھے (پنکھے) کے بھی ہم ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔"

خالہ نسرین تھک ہار کر خاموش ہو گئیں' لیکن پریشانی چہرے سے ہویدا تھی' جس کی وجہ اس وقت لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"کہاں جائیں گے اماں! اور کس وقت جانا ہے' پہلے سے ٹائم بتا دو' پھر جو تیار ہونے لگتے ہیں تو تم بولنے لگتی ہو۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں کہوں گی' یہ بڑا شہر ہے' ہم آج شام کو نہر پر جائیں گے' رات کا کھانا نہر کے کنارے ہی کھائیں گے۔" پروگرام کا اعلان ہوتے ہی دونوں لڑکوں نے نفی میں سر ہلایا اور چلائے۔

"یہ غضب نہ کرنا پھوپھی! رات کو وہاں سانپ بچھو حکومت کرتے ہیں۔ ایویں ایک آدھ بھی آپ لوگوں میں سے فوت ہو گیا تو نام ہمارے بے چارے شہر کا بدنام ہو جائے گا۔"

"چلو' پھر جلدی آ جائیں گے اور کل کا پروگرام پکا رکھو' ہم کسی عرس میں ضرور شرکت کریں گے۔"

"ٹھیک ہے' جی پتا کرتے ہیں' کون کون عرس آج کل روز میں ہے' پھر لے چلیں گے اسی مزار پر۔"

"اور جی ہم نے سنا ہے لاہور میں کھانے' پینے کا بڑا بازار ہے' ہر طرف طرح طرح کے کھانے بکتے ہیں' ادھر تو ضرور جانا ہے۔" کچھ گپ لو گپ لا دی انیلا نے ٹھنک کر براہِ راست جوادی سے فرمائش کی تھی۔

"اے چھوڑو بھی' بڑا رش ہوتا ہے وہاں' آوارہ لڑکے ساری شام ادھر ہی گزارتے ہیں اور لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں' ادھر کا تو نام نہ لو۔" خالہ نسرین نے نجانے کیوں ایسا بیان دیا' حالانکہ وہ تو آج تک ادھر گئی ہی نہیں تھیں۔

"تو ہم کس لیے ہیں' چھیڑنے والے کا منہ توڑ کر ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔" بھائی غیرت میں آ گئے۔

خالہ نسرین آہ بھر کر باہر نکلیں' تو دونوں اس فیملی کو پروگرام بنانے میں مصروف چھوڑ کر باہر آ گئے۔

"کیا ہے خالہ! اب بے چارے اتنی دور سے آئے ہیں' تھوڑی بہت تفریح تو حق بنتا ہے' واپس گھر ہی آئیں گے۔"

"تمہیں کیا پتا' کیسے بتاؤں' اصل میں اتنا پیسہ کہاں ہے ہمارے پاس' یہ سیر میں' ہمیں بھی ساتھ گھسیٹیں گے' پھر میزبان ہونے کی وجہ سے خرچہ بھی ہم سے ہی چاہیں گے' ہائے ربا! میں کہاں سے یہ سب پورا کروں گی۔"

"آپ مت جانا' بس کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دینا۔"

"وہی تو مصیبت ہے بہانے بنانے کہاں آتے ہیں مجھے' یہ تو بانو کو بھی ساتھ لے جانے کی بات کریں گے اور بانو کے ابا کو تو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی' رشتہ داری اپنی....."

"خالہ! بانو کو کاموں میں مصروف کر دیا کرنا۔ ادھر یہ لوگ نکلنے کے لیے تیار ہوں' ادھر اسے کپڑے دھونے پر لگا دیں یا پھر مرغیوں کے دڑبے کی صفائی بھی مفید اور طویل کام ہے۔"

"ہاں۔ کچھ تو کرنا پڑے گا' بچی تم تو سب جانتے ہو' کیا حال ہے ہمارے گھر کا' مہمان داری تو چلو ٹھیک ہے' پر یہ سیر سپاٹے۔"

"فکر نہ کریں۔ اپنے شہر کی لاج رکھیں گے اور آپ پر حرف نہیں آنے دیں گے۔"

"اے خالہ جی! باتھ روم کدھر ہے؟" بڑے والا صاحبزادہ چلا آیا تھا۔

"باتھ روم کا تو نلکا خراب ہے' پانی نہیں آ رہا۔

ہمارے گھر چل کر نہالو۔"

"اچھا!" کچھ سوچا' پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں اپنے ہاں لے آئے۔

"باتھ روم کدھر ہے بھئی؟ کیا سوچنے لگے تم دونوں؟"

"آں کچھ نہیں' ادھر گیسٹ روم ہے' ساتھ میں اٹیچ باتھ' ادھر ہی گھس جاؤ۔" جوادی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا' اور محترم غڑاپ سے گھس گئے۔

پانچ منٹ جوادی نے انتظار کیا' اس کے بعد پانی کے پائپ پر لگا ہینڈل بند کر دیا۔

"اوئے بھائی' پانی بند ہو گیا ہے' میں صابن لگا کر بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا' اوئے پانی کا کچھ بندوبست کرو' وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔

دس منٹ بعد جب جسم پر لگا صابن کا جھاگ تولیے میں منتقل کرنے کے بعد' نہانے کی خواہش دل میں دبا کر بادل نخواستہ باتھ روم کو خیر آباد کہہ کر لاؤنج میں قدم رکھا تو ان دونوں کو سلطان راہی مرحوم کی فلم ذوق و شوق سے دیکھتے پایا۔

"بڑا سیاپا ہے بھئی اس شہر میں۔"

"کیوں بھئی' اب کیا ہو گیا؟" نیم دراز شبلی توجہ ٹی وی کی جانب رکھتے ہوئے پوچھا' جوادی نے تو کچھ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں فرمائی۔

"پانی نہیں آ رہا۔ تولیے سے صابن صاف کر کے کپڑے پہنے ہیں' سر میں شیمپو اسی طرح لگا ہوا ہے' یار! کچھ انتظام کرو۔" حضرت تو رو دینے کو تھے۔

"خالہ نسرین نے اطلاع دی ہے ان کے ہاں ٹھیک ٹھاک پانی آ رہا ہے جایئے جا کر ڈوب جایئے۔"

آخری جملے پر غور کیے بغیر وہ تو لپک کر خالہ نسرین کے گھر کو چل دیے۔ شبلی نے جذبات میں آ کر جوادی کا ہاتھ چوما' پھر گلوگیر آواز میں فرمایا۔

"سو عاشق مرے ہوں گے تو آپ کی پیدائش کا منحوس واقعہ پیش آیا ہوگا' مان گئے آپ کو۔ سچ مچ مان گئے' تسی گریٹ او۔"

☼ ☼ ☼

شام کو بانو کا بھائی بلانے آ گیا' اس اطلاع کے ساتھ کہ مہمان تو بالکل تیار ہے۔

ادھر جو آئے تو واقعی مہمان تیار اور پُرجوش تھے۔

"تربوز تو مل جائیں گے نا؟" پھوپھی نے کچھ فکر مندی کے عالم میں دریافت کیا۔

"فکر نہ کریں تربوز نہ ملے تو فالسے لے لیں گے۔" جوادی نے اپنے انداز میں تسلی دی۔

"مخول نہ کرو۔ میرا مطلب تھا کہ نہر کے کنارے تربوز نہ کھائے جائیں تو کیا فائدہ' نہر تک جانے کا۔"

"بس رہن دو اماں! تربوز تو ہم اپنے شہر میں بھی کھاتے رہتے ہیں۔ آج تو برگر کھائیں گے۔" جمیلہ چہکی تھی۔

"دفع دور' انگریزی بچی' مجھے نہیں اچھے لگتے یہ برگر شرگر' میرے سامنے نام بھی نہ لیا کر۔"

"اماں ہماری پرانے خیالات کی ہیں' آپ مائنڈ نہ کرنا۔" شرما کر انیلا بیگم نے جوادی کو اطلاع دی اور پھر درخواست کی۔

"نہیں۔ میرے پرکھوں میں تو کوئی برگر کی صنعت سے وابستہ نہیں تھا' میں نے کیوں برا ماننا ہے۔"

"اے نسرین! اب آ بھی چکو اور یہ تمہاری بانو کدھر رہ گئی ہے؟"

"آپا! بانو کو تو میں نے چھت کی صفائی پر لگایا ہے' گرمی کا موسم ہے اور صحن چھوٹا ہے' کچھ بستر رات میں چھت پر بھی لگیں گے نا' آپ لوگ جاؤ۔ ہم تو اسی شہر کے رہنے والے ہیں' یہ سب کئی بار کا دیکھ رکھا ہے۔"

نسرین اتنا کہنے کے بعد پھر چولہے کے پاس جا بیٹھیں اور یہ سب نہر کی جانب روانہ ہوئے۔

"دیکھ لو جی ذرا بھی لحاظ ہو' گھر آئے مہمانوں کے ساتھ چلنا بھی گوارا نہیں ہے انہیں اور ایک تم لوگ' کوئی رشتہ داری بھی نہیں' لیکن بات ہے ساری خلوص اور مروت کی۔"

"ہاں! پھپھو جی ٹھیک کہتی ہیں آپ' ان کے گھر میں خلوص اور مروت کی بڑی کمی ہے۔ ان کی لڑکی کی

محلے کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ سمجھتی جو نہیں۔" لگے ہاتھوں جوادی نے بانو کی برائی بھی کر دی۔

"اچھا۔ ہمارے خاندان میں بڑی تعریفیں ہوتی ہیں اس لڑکی کی۔ جو بھی ادھر سے ہو کر جاتا ہے بانو کی بڑی ہی تعریف کرتا ہے۔"

"تم بڑی بھولی ہو پھوپھی! ان کی سیاست نہیں سمجھیں' وہ تو چاہتے ہی یہی ہوں گے' لڑکی کہیں ٹھکانے لگے' تاکہ ان کے گھر اور سپوت تو محفوظ ہو جائیں۔"

"ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو' یہ برادری والے ہیں' بڑے میسنے ہیں۔ خیر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ نبٹ لوں گی ایک ایک سے' ویسے نسرین کے گھر سے تو مجھے خود بڑی ہمدردی ہے۔ پیسے کے لحاظ سے بڑے کمزور ہیں بے چارے اور پھر بانو نے دوپہر کو بڑی محنت سے کھانا بنایا تھا۔"

"لو جی پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔" جوادی سخت بدمزہ ہوا۔

☼ ☼ ☼

نہر کے کنارے خوب رونق تھی۔ لڑکے اور بچے چھپا چھپ نہر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔

"اماں! میں بھی نہاؤں گا۔" چھوٹا مچلا تھا۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں۔ سب ہی نہائیں گے۔" بڑے کی آواز مارے جذبات کے پھٹ سی گئی تھی۔

"سب یعنی کہ سب۔ کیوں مرنے کا ارادہ ہے؟" جوادی نے گھبرا کر لڑکیوں اور اماں حضور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب سب لڑکوں سے ہے۔" سٹپٹا کر جواب دیا۔

"ہائے! میں بھی کہوں کہ اپنے بائی جان شہر آ کر کتنے ماڈرن ہو گئے ہیں۔" انیلا نے قہقہہ لگایا' پھر اس کے بعد بھی تسلی نہیں ہوئی' دیر تک ہنستی اور مزہ لیتی رہی۔

"نی بس کر۔ اندر کر لے یہ دندیاں' وہ دیکھ' وہ خبیث کے بچے تجھے ہی گھور رہے ہیں۔" پھوپھی نے چھپاکا لگانے کے بعد خبردار کیا۔

"ہم سے زیادہ سوہنی یہاں کوئی لگ بھی تو نہیں رہی' ہم نے تو سنا تھا بڑے شہر کی لڑکیاں بڑی فیشنی اور سوہنی ہیں' پر کھے تے سوا باندریاں سی لگتی ہیں ساری کی ساری۔"

"ویسے منڈے سوہنے ہیں۔" جمیلہ نے جوادی اور شبلی کی جانب اشارہ کر کے انیلا نے کان میں کہا۔ انیلا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا' پھر دونوں شرما گئیں۔

"اس بے جوادی کو کیا ہو گیا ہے' جا کر پلیٹیں تیار کروا رہا ہے۔" شبلی' انیلا کو چھوڑ چھاڑ ادھر کو لپکا۔

"ہاں' ہاں باقی پلیٹوں میں مرچیں نارمل رکھو۔ یہ ایک پلیٹ بس' سمجھو' یہ گول گپے مرچوں سے ہی تیار کرنے ہیں۔" آگے اب شبلی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

واقعی وہی ہوا جیسا سوچا تھا' مرچوں بھرے مگر لذیذ گول گپے اور پھوپھی کے لالچی بڑے صاحبزادے ناک بھی پونچھ رہے ہیں۔ آنسو بھی صاف کر رہے ہیں' مگر پلیٹ نہیں چھوڑ رہے تھے۔

"مرچیں اتنی تو نہیں ہیں۔" سب ان کی حالت پر حیران ہونے لگے۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ نازک مزاج ہو۔" جوادی کے طنز نے مزید غیرت بھڑکائی۔ پلیٹ خالی کر کے ہی چھوڑی اور اس کے بعد جیسے چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی' پانی بھی پیا' پاپڑ بھی چبائے' مگر مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔

"چلو گھر چلو۔ جا کر چینی کھلاتی ہوں اسے۔" ساری تفریح غارت ہو چکی تھی۔ پھوپھی کے واپسی کے اعلان نے ان کے باقی بچوں کو بدمزہ کر دیا۔

"ویسے یار جوادی! اس حسن مذاق کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔"

"یہ ایک ہیرو کا ولن سے انتقام ہے۔ دل والوں کی

باتیں ہیں، بس اور کچھ نہیں۔ میرا بس چلے تو اس مرچوں کی بوری میں بند کر کے کسی کریانے والے کے ہاتھ فروخت کر دوں۔"

"چلو دونوں، تم دونوں ادھر کیوں رک گئے؟" پھوپھو حضور نے پکارا، دونوں باتوں کا سلسلہ موقوف کر کے چل پڑے۔

گھر قریب آنے پر ان دونوں نے خدا حافظ کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

☆ ☆ ☆

"وے کدھر تھے تم دونوں، ذرا گھر میں نہیں بیٹھا جاتا، ہمارے ساتھ نہیں گئے اور گرمی میں پتا نہیں کدھر کدھر مارے پھرتے رہے ہو۔"

جوادی کی اماں دیکھتے ہی شروع ہو گئیں، دادی بڑے کمرے میں تشریف فرما تھیں، آواز سن کر وہ بھی باہر آ گئیں۔

"آپ گرمی میں کیوں نکل آئیں، اے سی کی ٹھنڈک میں بیٹھیے، ہم ڈانٹ کھانے ادھر ہی آجاتے ہیں۔" شبلی نے ادب سے کہا۔

"وے بے ہدایتو! فون بھی بند کر رکھے تھے۔ ادھر گاڑی خراب ہو گئی، تم لوگوں کو کتنے فون کیے، آ کر لے جاؤ، باپ تمہارا گاڑی ٹھیک کرانے گیا ہے، ابراہیم کو تو دوپہر میں ہی کسی دوست کا فون آ گیا تھا، وہ ادھر نکل گیا، ہم عورتیں بڑی مشکل سے ٹیکسی کر کے آئی ہیں۔"

"کیوں، کیا ٹیکسی بھی خراب تھی، دھکا لگانا پڑ گیا تھا یا بغیر ڈرائیور کے تھی اور یہ سیٹ آپ کو سنبھالنا پڑ گئی تھی۔"

"بکواس نہ کر جوادی! اندر آ کر میرے پیر دبا، بڑا درد ہو رہا ہے اور تو شبلی! ذرا چائے تو بنا ہمارے لیے، بڑا ہی تھک گئے ہیں۔"

"چائے پی لیں گی تو پھر ساری رات چھت کو تکتے گزرے گی، نیند نہیں آئے گی۔"

"میں تو کہتا ہوں دادی! تھوڑی بھنگ منوا کر رکھیں۔ سچی کل ہی میں نے اس کی افادیت پر ایک کتاب پڑھی ہے، واہ واہ سبحان اللہ۔"

"ہائے کیسی باتیں کر رہا ہے، کچھ پتا بھی ہے کس کی نسل سے ہے تو۔ خبردار! جو اب یہ نام بھی لیا تو۔" دادی کو جوادی کی بات پر صدمہ بھی ہوا، غصہ بھی آیا۔

"وہ نیلما کی بچی کہاں رہ گئی پیچھے؟"

"نیلما، زیبا کے گھر گئی ہے، زیبا کی امی اور چھوٹی بہن آئی ہوئی تھیں، ادھر بڑا اصرار کر رہی تھیں، اس لیے نیلما کو بھیج دیا میں نے ان کے ساتھ۔"

"واپسی کا کیا پروگرام ہے۔ مجھے بتا دیجیے گا، میں لیتا آؤں گا۔" بات زیبا کے گھر تک پہنچنے کی ہو اور شبلی یہ موقع گنوا دے۔

"آجائے گی کل شام تک، وہ غریب بھی کہاں کہیں آتی جاتی ہے۔ بڑی خوش تھی زیبا کے ہاں جانے سے وہاں پر بھی ساری لڑکیاں ہی ہیں نا، دل لگ جاتا ہے اس لیے نیلو کا۔"

"جی ہاں، کافی شریف گھرانہ ہے۔" شبلی نے تعریف کی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شبلی کی امی نے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن جوادی کی امی نے آج رات کے لیے انہیں اور دادی کو ادھر ہی روک لیا۔ خواتین دیر تک محفل جمائے آج ملنے والے رشتہ داروں پر ہر طرح کا تبصرہ فرماتی اور انہیں بور کرتی رہیں، جب بھی اٹھنے کا ارادہ کیا ڈپٹ کر یہی کہا گیا، وے بے ہدایتو! کبھی گھر والوں کے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو اور انہیں بٹھانے کے بعد پھر بھول ہی جاتیں، مجال ہے جو ان پورے تین گھنٹوں میں ان سے کچھ پوچھا ہو یا انہیں کچھ بتایا ہو، آخر دونوں وہیں کارپٹ پر لیٹے اور سو گئے۔

آنکھ صبح دادی کے جگانے پر کھلی۔ وہ نماز کے لیے جگا رہی تھیں۔

"اٹھ جاتے ہیں دادی! آپ بھی نا پہلی اذان کے ساتھ ہی جگانا شروع کر دیتی ہیں۔"

"ہاں، وہ اس لیے کہ اٹھتے تم تب ہو، جب آخری چند منٹ باقی رہ جاتے ہیں۔"

بات سچ تھی سو خاموش ہونا پڑا۔

"اٹھ جا شبلی! یہ تیرا نہیں تیرے تایا کا گھر ہے' یہاں میری آواز پر نہ جاگا تو صبح صبح جوتے پڑنے شروع ہو جائیں گے۔"

"شکریہ دادی! آپ کی اطلاع نے مجھے بروقت خوابِ غفلت سے جگا دیا۔" شبلی ایکدم سے اٹھ بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر دستک دیتے ہی پو کا ہنستا مسکراتا چہرہ برآمد ہوا تھا۔

"تمہیں پتا تھا' ہم آئے ہیں۔" جوادی نے جوابی مسکراہٹ اچھال کر پوچھا۔

"نہیں۔" مختصر جواب آیا۔

"اچھا' پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ کیوں؟"

"تو آپ کا خیال ہے میں صرف آپ کو دیکھ کر مسکراتا ہوں۔"

"واقعی یہی خیال تھا۔ اچھا ہوا جو یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔" جوادی اداس ہو گیا۔

"یہ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی تمہیں اداسی کے دورے کیوں پڑنے لگتے ہیں؟ میری مانو تو چھوڑ دو اس گھر کا خیال۔ یہ تمہارے لیے بہتر نہیں ہے۔"

"بکومت۔"

"اتنی مرچیں کھلا کر بھی تسلی نہیں ہوئی؟"

"مرچیں کھا کر وہ کون سا واپس بھاگ گئے ہیں' یہیں جمے ہوئے ہیں۔"

"خیر تو ہے' آج اتنی سویرے سویرے۔" خالہ نسرین کسی کام سے صحن میں نکلیں' انہیں دیکھا تو نا صرف ٹھٹکیں' بلکہ تیور بتاتے تھے آج اتنے برسوں میں پہلی بار انہیں ان کا آنا کچھ اچھا بھی نہیں لگا۔

"وہ خالہ ادھر سے گزر رہے تھے' سوچا آپ کے مہمانوں کی خیریت ہی معلوم کرتے چلیں۔"

"تا میرے مہمانوں کو کیا ہوا ہے؟ جو خیریت معلوم کرنے چلے آئے ہو' میں تو کل سے تم لوگوں کو چیک ہی کر رہی ہوں اور پریشان ہو رہی ہوں۔"

"اوئے ادھر تو دھیان ہی نہیں گیا' آخر یہ خالہ کے خاص مہمان ہیں' ان کی راہوں میں تو ہر دم آنکھیں بچھائیں گی' اور ہم کون سا کرائے کے قاتل ہیں' جو مہمانوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"جاؤ شاباشے گھر جاؤ اپنے۔"

اس سے پہلے کہ وہ پلٹ جاتے' پھوپھی بھی کمرے سے برآمد ہو گئیں' انہیں دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔

"تم دونوں آئے ہو' بچی ساری رات تمہیں ہی یاد کرتی رہی ہوں۔ آؤ آؤ کھڑے کیوں ہو۔"

"وہ جی ہم ادھر بیٹھک تک ہی آیا کرتے ہیں۔" وہ کمرے میں کھینچ رہی تھیں' بتانا پڑا۔

"چلو پھر ادھر ہی بیٹھو' اینلا بڑے مزے دار پراٹھے بنا رہی ہے' کھا کر جانا۔"

"ہم تو ناشتہ کر کے آئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' دو چار نوالے ہمارے ساتھ بھی لے لینا' ویسے کل نہر پر بڑا مزہ آیا' لڑکیاں آج چڑیا گھر جانے کی ضد کر رہی ہیں' ورنہ میرا پروگرام تو آج پھر نہر پر جانے کا تھا۔"

اب خالہ نسرین کی موجودگی میں وہ کیا جواب دیتے کہ وہ تو نظر ان ہی پر جمائے جیسے ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

مئی کا مہینہ' دن کے ساڑھے بارہ' یہ جذبۂ شوق ہی تھا جو گھر سے نکال لایا تھا' ورنہ اور تو کوئی بات ہو نہیں سکتی تھی۔ بندروں کے پنجروں سے ذرا آگے ہی بڑھے تھے کہ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے ترمرے لہرانے لگے' تب یہ دونوں تو چھاؤں میں آ بیٹھے' پو بے چارے کو بھی دبوچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ باقی سب آگے بڑھ گئے۔

"میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا۔" پو بولا۔

"بے وقوف بیمار پڑ جاؤ گے' نیا خرچہ' نئی مصیبت' کیا کبھی کتے' بلیاں' کوے' چڑیاں نہیں دیکھے جو اس گرمی میں ان کے دیدار کو مرے جا رہے ہو' خبردار جانے کی کوشش نہ کرنا' ورنہ بندر کے پنجرے میں تمہیں بھی بند کروا دوں گا۔" دھمکی کارآمد رہی' پو کی ضد

چلی رہی۔ وہ ان سب کے پیچھے جانے کے بجائے ادھر ہی لگے جھولے جھولنے لگا۔

کھانے کا آغاز ہوا' جوادی نے جمیلہ کے بنائے پلاؤ کی خوب تعریفیں کیں' شبلی اس دوران اللہ تعالیٰ سے اس فراخ دلانہ جھوٹ بولنے پر معاف کر دینے کی درخواست کرتا رہا۔

"ایسا کھانا اور ادھر کبھی نہیں بنا۔"

"ادھر چڑیا گھر میں بنے گا بھی کیوں' شیر' گینڈے پلاؤ تھوڑا ہی کھاتے ہیں۔" پو نے بول کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو شبلی اسے سارس دکھانے لے گیا' بھلا تک۔ بچہ جا رہا تھا اسے سارس دیکھنے سے زیادہ کھانا کھانے میں دلچسپی ہے۔

اس کے جاتے ہی جوادی نے بانو کی سستیوں' نالائقیوں کے کئی قصے گھڑ گھڑ کر سنا ڈالے۔

"اچھا۔ خالہ تو کہتی ہیں میری بیٹی بڑی سگھڑ ہے۔" اینلا نے منہ بنا کر نقل اتاری۔

"کون سی ماں ہے جو بیٹی کی تعریف نہیں کرے گی' وہ بھی کرتی ہیں تو برائی کیا ہے' لیکن ہم تو پڑوس میں رہتے ہیں۔ پکوان کا لین دین عام بات ہے۔ لیکن ان کے ہاں سے آج تک کوئی سواد کی چیز نہیں آئی۔"

"اور صبح کہہ رہی تھی' پلاؤ میں بنا دیتی ہوں' شکر ہے میں نے بنوا نہیں لیا۔"

"اے بس چپ کر خوامخواہ میں کیوں برائیاں کر رہی ہے' اچھی بچی ہے' بڑا احترام کرتی ہے میرا تو۔"

پھوپھی کا دل نامراد تو لگتا تھا' بانو پر اٹک کر ہی رہ گیا' قدم قدم پر کوئی نہ کوئی خوبی یاد آ جاتی تھی جب کہ پو سارس دیکھ کر واپس آیا' جوادی' بانو کو پھوہڑ پن پر اتنا بول چکا کہ لکھا جاتا تو ایک چار سو بیس صفحات کی کتاب وجود میں آ سکتی تھی۔

پھوپھی کافی بااخلاق تو تھیں' دونوں لڑکوں کو کھانا بھی خود نکال کر دیا اور بار بار دیا' آئس کریم' بوتلیں' چپس' جوس بار بار صرف ان ہی دونوں کو پیش کیے گئے' بچے پیچھے کرلاتے رہے پروا نہیں کی۔

کھانے کے بعد بقیہ جانوروں سے ملاقات کی گئی' اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سو یہ دونوں بھی ساتھ ساتھ تھے اور لڑکیوں کو ستا رہے تھے۔

"بڑے شہر کی لڑکیاں ہاتھی کے دانت کی طرح ہوتی ہیں' آپ کی امی تو بڑی بھولی ہیں' آپ انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔"

"ہائے اللہ! ہم آپ کی یہ رائے اپنی امی تک پہنچائیں' توبہ توبہ آپ بھی نا بڑے شریر ہیں۔" پتا نہیں کیوں وہ خوامخواہ شرما گئی تھیں۔

جب واپسی ہوئی مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں اور خالہ نسرین انہیں گھور رہی تھیں۔

گلی میں آتے ہی جوادی شبلی سے بولا۔ "دیکھا تم نے کتنا بدل گئی ہیں خالہ۔ اب انہیں ہمارا آنا جانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ اس امجد کے بچے کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دوں۔"

"جی ہاں! وہ بھی عین نکاح کے ٹائم۔ سب کچھ تیار ہے تقریب اپنے جوبن پر ہے اور روح رواں غائب ڈھنڈیا پڑ چکی ہے۔ آئے ہائے کوئی لڑکے کو تو لاؤ مگر یہ کوئی نہیں دیکھ رہا کہ ایک مکھی بلکہ مکھا شیروانی پہنے دیوار سے چپکا آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہے۔ اپنے نصیبوں کو کوس کوس کے اس کا گلا بیٹھ چکا ہے' بس ادھر تو فیصلہ ہی ہوا ہے عزت بچانے کے لیے جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے کوئی دوسرا لڑکا ڈھونڈو اور یہ دوسرا لڑکا جناب جوادی سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ سو جھٹ سے جوادی صاحب کو پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا کر نئے کپڑے پہنا کر مولوی صاحب کے روبرو بٹھا دیا ہے اور یوں ڈرامائی طور پر مس شہربانو مسز شہربانو جواد بن گئی ہیں۔"

"بکواس بند کرو' میں بڑا پریشان ہوں۔ کوئی حل سوچو۔ بھلا یہ امجد' بانو کے قابل ہے۔"

"امجد ہی کیا جواد کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی لڑکا بانو کے قابل نہیں ہے۔"

"میں خالہ نسرین کو اتنی ظالم ماں نہیں سمجھتا تھا۔"

"اچھا گھر کا گیٹ آ گیا ہے تم والدین کی عدالت میں

پیش ہونے کی تیاری کرو۔ میں گھر چلتا ہوں۔"

"نہیں نہیں شبلی تم بھی ادھر ہی رک جاؤ۔ پتا ہے راتوں کو نیند ہی نہیں آتی۔ اگر نیند آجائے تو پھر خواب ایسے خوف ناک آتے ہیں کہ نیند آنے پر ہی پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں رک جاتا ہوں اور یہ بھی بتا دیتا ہوں امجد کے خوابوں کو نہ کبھی پورا ہوتا ہے نہ ہوں گے۔"

"ارے! میں تو عین نکاح کے وقت اس کی ایک عدد بیوی اور ساتھ ساتھ دو بچے بھی پیش کر دوں گا۔"

"ارے ہاں اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" مارے جوش کے جوادی اس کے گلے لگ گیا۔

"مگر مجھے تو کب سے یہ خیال آیا ہوا ہے اسی لیے تو مطمئن ہوں۔ مجھے کہہ لینے دو۔"

"تسی گریٹ ہو۔"

"وہ فقیرنی جو اکثر ہمارے اسکول کے گیٹ کے قریب مانگنے بیٹھی ہوتی ہے' ارے وہی جس سے ایک بار ہم نے سو روپیہ ادھار بھی لیا تھا۔"

"سیدھی طرح بول نہ تو چھینو کی بات کر رہا ہے۔"

"اس کے سامنے اب چھینو نہ کہنا یاد نہیں بتایا تو تھا اس نے نام بدل لیا ہے' اب وہ قطرینہ کیف کہلاتی ہے تو میں سوچ رہا ہوں امجد کی فرضی بیوی بنانے کے لیے وہ بہترین ہے۔"

"ارے ہاں یار! وہ ہمیں انکار نہیں کرے گی۔" جوادی کا دکھ اب کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔

گھر آئے تو نیلما کچن میں کھڑی کچھ بنا رہی تھی دادی اور شبلی کی امی کے بارے میں پتا چلا اپنے گھر جا چکی ہیں ویسے دادی شاید صبح کو دوبارہ چکر لگائیں۔

"امی کدھر ہیں؟" جوادی نے دھیرے سے پوچھا۔

"ان کی دوست سلمٰی آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ رات کا کھانا کھا کر جائیں گی۔ کچھ سودا منگوانا تھا کدھر تھے آپ۔"

"یا اللہ شکر۔ سلمٰی آنٹی اچھے وقت پہ آئی ہیں۔ لاؤ لسٹ بنا کر دو۔ کیا کیا منگوانا ہے؟"

"نیلو! میں نے سنا تھا۔ تم زیبا کے ہاں گئی تھیں۔" شبلی' جوادی کے ساتھ قدم نہیں بڑھا سکا تو جوادی کو بھی رکنا پڑا۔

"جی بالکل گئی تھی بڑا مزہ آیا۔ بڑا اچھا ٹائم گزرا۔"

"اوں بھلا وہ کس طرح؟" دلچسپی عروج پر تھی۔

"بھئی تین تین لڑکیاں ہیں اس گھر میں۔ ہم نے مزے مزے کی ڈشز ٹرائی کیں۔ ہنسی مذاق بھی خوب رہا۔ سچی پتا بھی نہیں چلا ٹائم گزر گیا۔ وہ تو نانا ماموں مجھے لینے آگئے تھے' ورنہ میں تو مزید ایک دو روز بعد آتی۔"

"کچھ کہتی بھی زیبا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ کہہ رہی تھیں پھر دوبارہ بھی آکر ٹھہرنا۔" نیلما نے اپنی سادگی میں جو بتایا' جوادی شبلی کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

"اور ہاں شبلی بھائی ایک کام آپ کے لیے بھی بتایا ہے۔"

"وہ کیا؟" شبلی پورے کا پورا کان بن گیا۔

"کہہ رہی تھیں دادی کے انگوری دوپٹے پر جو کروشیے کی بیل ہے۔ وہ انہیں بے حد پسند ہے۔ وہ لا کر نیلما کو دے دیں جب دوبارہ نیلما ہماری طرف آئے گی تو میں اس سے لے لوں گی۔"

"یہ نہیں کہا کہ دوپٹہ میرے گھر آکر مجھے دے جائیں؟"

"نہیں۔ یہ تو نہیں کہا۔" نیلما نے سوچ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

"اس کا فون آئے تو کہہ دینا دوپٹہ پرانا اور بد رنگ ہو چکا تھا۔ دادی نے قطرینہ کیف کو دے دیا ہے۔" وہ یہ کہہ کر جوادی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

"کیا کہا بھائی! قطرینہ کیف کو بتائیں' کیا واقعی؟" نیلما کی حیرت میں ڈوبی آواز آرہی تھی لیکن وہ رکے نہیں۔

☼ ☼ ☼

ابھی سویرے کے صرف دس ہی بجے تھے' دونوں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ انیلا اور

جمیلہ کا ان کے ہاں نزول ہوا۔ نیلما اور امی سے بڑے تپاک سے ملیں' اور وہ حلوہ پیش کیا جو بقول ان کے اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی تھیں۔

"اچھا۔ پیٹھے کا حلوہ ہے۔" امی جی نے خوشی کا اظہار کیا' پھر خود فوراً" ہی فرمایا۔ "اگر اس میں سوجی بھون کر شامل کر دی جائے تو اور بھی اچھا بنتا ہے' مجھے لگتا ہے تم نے سوجی نہیں ڈالی۔"

دونوں ہاں یا نا میں جواب نہیں دے سکیں کہ انہیں واقعی علم نہیں تھا۔ خالہ نسرین نے سوجی ڈالی ہے یا نہیں۔

"وہ جی آپ کے گھر میں شاید دو لڑکے رہتے ہیں' نام تو ہمیں معلوم نہیں۔ وہ خالہ بلا رہی تھیں انہیں۔"

"اچھا۔ نسرین نے بلایا ہے' نیلما! جا کر دیکھو سو رہے ہیں یا دنیا پر احسان کرنے اٹھ گئے ہیں۔" پھر لڑکیوں سے بولیں۔ "نسرین نے تمہیں کیوں بھیج دیا' اپنی چھوٹی کو بھیج دیتی یا دیوار سے ہی کہہ دیتی۔"

"وہ اصل میں پپو بڑی تعریف کر رہا تھا آپ لوگوں کی' اسی لیے بھی ہم چلے آئے۔"

"چلو اچھا کیا۔ امی محترمہ کو لڑکیاں کچھ بھاتی نہیں ہیں۔"

"وہ دونوں تو ابھی سو رہے ہیں' جب اٹھیں گے' میں انہیں خالہ کی طرف بھیج دوں گی اور یہ بانو کہاں ہے' آج کل لگتا ہے زیادہ مصروف ہو گئی ہے۔"

"نہیں نہیں مصروفیت کیسی؟ سارا گھر تو آتے ہی ہم بہنوں نے سنبھال لیا تھا' بس وہ ویسے کمرے سے کم نکلتی ہے۔ ہمیں تو حیرت ہوئی کہ آپ سے دوستی ہے۔ آپ اسے یاد کر رہی ہیں' ہم تو سمجھے تھے' بڑی مغرور ہے' کسی سے بھی بات نہیں کرتی شاید۔"

"ہائے بانو اور مغرور' وہ تو بڑی ہی سوئٹ لڑکی ہے۔" نیلما اس کی برائی برداشت نہیں کر سکی۔

"ہوا جہاں مطلب دکھائی دیتا ہو وہاں تو شہد ٹپکتا ہوتا ہے۔" بڑے معنی خیز انداز میں کہا گیا تھا۔ نیلما تو نوٹ نہیں کر سکی' لیکن جوادی کی والدہ محترمہ خاصی ہیڈ ماسٹرنی صاحبہ تھیں۔ دال میں کالا ہے' کیسے

نہ پہچانتیں' لیکن بولیں کچھ نہیں' بظاہر اخبار کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

"وہ میری امی بھی آنا چاہتی تھیں آپ کے گھر۔" انیلا نے متوجہ کیا۔

"جم جم آؤ۔ ہمارے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔"

"اچھا پھر ہم چلتے ہیں' آپ کے بیٹے جب ناشتا وغیرہ کر لیں تو میری امی کا پیغام دے دیجیے گا۔"

"نیلما! کان کھول کے سن لے' کوئی پیغام دینے کی ضرورت نہیں۔ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں' یہ اپنا ہی پیغام لے کر آئی تھیں' آئے ہائے یہ بے غیرت نام ڈبوئیں گے باپ' دادا کا۔ پتا نہیں کیا کیا بکواس ماری ہے لڑکیوں کے سامنے۔ دیوانی سی ہوئی جا رہی ہیں۔"

گیارہ بجے جب دونوں ناشتا کر رہے تھے دادی اور نانا ماموں چلے آئے۔

"دے شبلی! تیری ماں گھر میں اکیلی ہے۔ ناشتا ختم ہو جائے تو گھر چلے جانا۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے دادی! کہ انہیں آخر بھری پری دنیا میں اکیلا چھوڑا کیوں گیا ہے۔ اچھے بھلے آپ دونوں گھر میں موجود تھے' ادھر کیوں چلے آئے۔"

"آج میرا مسالے والے ٹینڈے کھانے کو جی چاہ رہا ہے' اور اٹھ کیاری میں ٹینڈوں کی بیل کیسی ہری بھری ہے' بس وہی لینے آئی ہوں۔"

"توبہ کیا شوق ہے' اب اس آگ برساتی گرمی میں بیٹھ کر ٹینڈے توڑیں گی۔"

"تو کیا میں کیوں توڑوں گی۔ تم دونوں کو شرم نہ آئے گی' جوان جہان ہو کر خود تو ادھر بیٹھے ہو اور بوڑھی دادی دھوپ میں جل رہی ہے۔"

"چلو جی بات ہی ختم۔ آج ہمیں یہ کہنے دیں' دادی! تسی گریٹ ہو۔"

دونوں نے مل کر کہا تھا' نیلما نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور ہنسنے لگی۔

"السلام علیکم۔" کھلے گیٹ سے بارہ' تیرہ سال کا ایک اجنبی لڑکا داخل ہوا۔ وہ اجنبی گھر والوں کے لیے تھا۔ یہ دونوں تو انیلا' جمیلہ کے بھائی کو اچھی طرح

پہچانتے تھے۔

"وہ میری امی کو کچھ کام تھا' جی آپ دونوں سے یاد کررہی ہیں آپ کو۔"

"ادھر آؤ۔ پہلے یہ بتا' کس کا پتر ہے تو؟" دادی نے کڑک کر بلایا تھا۔

"انسان کا ہی بچہ ہے' دادی!" جوادی نے اطلاع دی' جو سنی نہیں گئی۔

"میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں جی!" بچہ بھی گھبرایا۔

"اچھا' واقعی!" شبلی کی پرمسرت آواز گونجی' جیسے نانا ماموں نے مزید گل افشانی سے روک دیا۔

"تیری ماں انہیں کیوں یاد کررہی ہے۔ یہ کیا گلی میں دوپٹے رنگتے ہیں یا نالے پراندے بیچتے ہیں۔"

"دادی!" دونوں نے اعتراض کیا۔

"چپ وے یہ ساری زنانیاں تمہیں ہی کیوں یاد کرتی رہتی ہیں؟"

"ہمیں کیا پتا؟ یہ تو آپ یاد کرنے والیوں سے پوچھیں۔"

شبلی نے شانے اچکائے' جبکہ جوادی نے مزید اضافہ کیا۔

"قسم کھا کرتا ہیں' کبھی ہم نے بھی کسی زنانی کو یاد کیا ہے۔"

"یہ ہے کون محلے میں نیا آیا ہے کیا؟" دادی کی نظریں بچے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اماں کہتی ہیں۔ اب شادی کروا کر ہی اس شہر سے واپسی ہوگی۔"

"ہائیں۔ آئے ہائے درفٹے منہ!" دادی تو اچھل پڑیں' جبکہ یہ سمجھ رہے تھے کس کی شادی کا ارادہ ہے' اسی لیے جوادی کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہوگیا تھا' شبلی بچے کو واپس دوڑا نہ دیتا تو عین ممکن تھا' جوادی ایک ہاتھ ہی جڑ دیتا۔

"دیکھو بھئی۔ دنیا کے تماشے' بچہ بتا رہا ہے ماں اس شہر میں شادی کرنے آئی ہے اور شادی کروا کر ہی واپس جائے گی۔ بلایا جارہا ہے' ہمارے ہونہار پوتوں کو' یعنی نظر ان پر ہے اور یہ عقل کے اندھے جس پر وہ انگلی رکھے گی وہی نکاح پڑھوانے پر تیار ہوجائے گا۔ میں کہے دیتی ہوں۔ لحاظ نہیں کروں گی' سو جوتے لگاؤں گی' تم میں سے جو اس سے شادی کرے گا' اسے بھی اور ساتھ اس مبینی کو بھی۔"

"ظاہر ہے جی' جب پوتے کی بیوی بن جائے گی' پھر تو آپ کی جوتیوں کی مار اس کے لیے عین سعادت' بلکہ باعث افتخار ہی ہوگی۔" شبلی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"مجھے تو تیری ہی نیت خراب لگ رہی ہے۔" نانا ماموں کی گہری جانچتی نگاہ اس پر تھی۔

"اللہ کو مانیے! ماموں کیوں بہتان لگا رہے ہیں۔"

"پھر کیا جوادی۔" انہوں نے انگلی اٹھائی۔

"جوادی نے تو نن بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ اب ساری عمر شادی نہیں کرے گا۔"

"ایں' نن؟"

"بات تو سنو۔ اب کہاں چل پڑے ہو' ٹنڈے تو اتار دو مجھے۔"

☆ ☆ ☆

جہانگیر کا مقبرہ تھا اور پھوپھی جی کی پوری فیملی کے ساتھ یہ دونوں تھے۔ چاٹ کھانے کے بعد سب بہت خوش تھے' اسی لیے فیصلہ ہوا تھا کہ ایک ایک پلیٹ مزید خریدی جائے۔

"میں تو آئس کریم بھی لوں گا' میرے لیے نان کباب پکڑ۔ میں تو تھک گئی ہوں۔"

مجال ہے جو کسی نے اس عمارت میں کوئی دلچسپی لی ہو۔ وہ متوجہ تھے تو صرف کھانے پینے کی دکانوں کی طرف' ہاں کچھ دیر بعد کچھ گوریاں بھی انہیں متاثر کرنے لگی تھیں' جو بے چاری عمارت کی ایک ایک اینٹ سے تاریخ کھنگالتے نہیں تھک رہی تھیں۔

"میں کیا جی' سنا ہے ان گوریوں کو پاکستانی لڑکے بڑے اچھے لگتے ہیں۔" امجد قریب آکر سنی سنائی کی تصدیق کروانا چاہ رہا تھا۔

"پاکستانی لڑکے' ارے ہاں ہاں بالکل' بس ایک بات انہیں ناپسند ہے پاکستانیوں کی' کہتی ہیں بزدل ہوتے ہیں' دور دور سے ہی دیکھتے ہیں' چھونے کی کوشش نہیں کرتے۔"

"اچھا جی' او یہ تو بڑی بے عزتی کروادی پاکستانی لڑکوں نے۔" امجد صاحب جوش کے عالم میں آگے بڑھے' آگے اور آگے۔ اور جب یہ وہاں پہنچے فرائض ادا کرنے کی آرزو میں چور ایک پولیس والا جناب امجد صاحب کی ٹھکائی میں مصروف تھا۔ گوریاں شاید کچھ دیر پہلے خفا ہوئی ہوں گی' اب تو پھر ایک بار ان کی دلچسپی ایک ایک اینٹ میں تھی۔ مار کھانے کے بعد امجد صاحب نے اس مار کا معاوضہ پولیس والے صاحب کو پیش کیا اور بظاہر بے نیاز بنے دوسرے رخ پر چل دیے۔

"چل دیکھیں تو کتنے ڈینٹ پڑے ہیں۔" شبلی نے کہا اور دونوں اس کے پیچھے لپکے۔

☆ ☆ ☆

واپسی شام کو ہوئی' سارا دن خوب کھایا پیا گیا۔ انہوں نے دھیان نہیں دیا' آج پھوپھی بار بار ہم تو کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں کی تکرار کرتی رہی تھیں' انہیں بانو کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر دونوں اپنے گھر کی جانب بڑھے تھے۔ ویسے آج امجد کی خاطر اچھی ہوئی ہے۔ جوادی کے دل کو ٹھنڈ پڑی تھی۔

"ہاں' پولیس والے کے ہاتھ کا پورا نشان پڑ گیا ہے چہرے پر۔"

گھر میں داخل ہوئے تھے برآمدے میں دادی' امی اور نانا ماموں کے ساتھ ساتھ خالہ نسرین کو بھی کھڑا پایا اور سب سے پہلے انہیں مخاطب بھی خالہ نسرین نے ہی کیا' الفاظ کچھ یوں تھے' "ہاں جی گھما پھرا لائے ہو اپنے سسرالیوں کو۔"

"ہمارے کہاں سے سسرالیے ہوگئے' کیوں مذاق کرتی ہیں خالہ!" دونوں کھسیانے ہوگئے۔

"نہیں۔ پریشان کیوں ہوتے ہو' ادھر تو تیاریاں مکمل ہیں۔"

"کیسی تیاریاں؟"

"کیسی ہوتی ہیں تیاریاں۔ ہائے آپا کتنا سمجھایا میں نے ان دونوں کو' نہ اتنی محبتیں بڑھاؤ کہ میری تو برادری کے لوگ ہیں۔ خوب جانتی ہوں انہیں' کہاں وہ کہاں آپ کا گھرانہ' مگر ان لڑکوں کی مت ماری گئی ہے۔ ایک نہیں سنی میری۔" خالہ کی شکایتیں جاری تھیں۔

"ہم تو آپ کے مہمان سمجھ کر عزت کررہے ہیں۔"

"میں نے کہا تو تھا اپنے مہمانوں کی میں خود ہی عزت کرلوں گی' پر نا جی! یہ آج کل کے بڑے' پتا نہیں مکھیوں والی خاصیت کیوں رکھتے ہیں' نا وہ لڑکیاں بھلا کسی طرح بھی تمہارے قابل ہیں۔"

دونوں نے پرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"دیکھا' اب کیسے مکر رہے ہیں اور ادھر وہ آپا صبح مجھے کہہ کر گئی تھیں' جس مقصد کے لیے لاہور آئی تھی' پورا ہوگیا ہے' میری لڑکیوں کو بڑے شہر میں شادی کرنے کا شوق تھا۔ دیکھو آتے ہی دو کیسے عمدہ لڑکے ملے ہیں' بس بات پکی ہی سمجھو اور تم ہو کہ چھپا رہے ہو ہم سے۔"

"لک' کیا وہ لڑکیوں کی شادی کے لیے آئی تھیں' لڑکے امجد کے لیے نہیں؟"

جوادی نے مری مری آواز میں پوچھا تھا کہ امجد پر ڈھائے ظلم یاد آکر قیامت ڈھا گئے تھے۔

"تا' امجد بھلا اس جوگا ہے وچارا۔ آپا کہتی ہے پہلے لڑکیاں بیاہوں گی اور مل گئے تم جیسے کاٹھ کے الو۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ بالکل ٹھیک فرماتی ہیں۔ آپ ہمیں ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔"

جوادی نے کرسی پر بیٹھے پیچ و تاب کھاتے نانا ماموں کے پیر سے جوتی اتاری اور دادی کے حضور پیش کرنے کے بعد فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا' کچھ ایسا ہی شبلی نے بھی کیا کہ خود ان کے خیال میں آج وہ جوتیاں کھانا ان کا حق بنتا تھا۔ خالہ نے جو کچھ بیان کیا تھا اس کے بعد دنیا میں بھلا ان سے بڑا چغد کون ہوسکتا تھا۔

جمیلہ' انیلا کی والدہ جب کسی ضروری بات کے بہانے ادھر چلی آئیں تو وہ دادی سے تاڑ تاڑ جوتیاں کھانے میں مصروف تھے۔ بس وہ وہیں سے واپس پلٹ گئیں' صبح اپنے شہر گئیں اور مڑ کر نہیں آئیں۔

☆

نعیمہ ناز

میڈیا میں ایک طوفان برپا تھا۔ ہر چینل پر وہی ایک تصویر، وہی ایک خبر حقوق انسانی کے چیمپئن سیاست و صحافت اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد تو اپنی اپنی آراء کا اظہار کر ہی رہے تھے مگر کچھ چینلز کے کچھ نیوز کاسٹر بھی اپنے فرائض منصبی ایک طرف رکھ کر ایسے ایسے تبصرے کر رہے تھے کہ ایک انتہائی مشہور و معروف چینل پر ان ہی کے ایک صحافی کو آن لائن کہنا پڑا کہ۔

"مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ ہم غیر جانبدار ہو کر خبر سنانے کے بجائے بالکل اسی انداز میں اور انہی الفاظ میں ری ایکٹ کر رہے ہیں جو مغرب ہم سے چاہتا ہے' اور ہمارے دشمن سننا چاہتے ہیں۔ بے شک جو کچھ ہم اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔ وہ قابل مذمت ہے مگر اس کی آڑ لے کر اسلام اور شریعت میں نافذ سزاؤں کے لیے خوف ناک اور باربیرک جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے خدا سے ڈریں' سزاؤں کا یہ قانون اللہ نے دیا ہے۔ انہیں طنز' ملامت اور تضحیک کا نشانہ بنانا خدا کے غضب کو آواز دینا ہے۔ ہاں اگر اسلامی قانون اور سزاؤں کا سہارا لے کر کوئی فرد یا گروہ ان کا غلط اور ناجائز استعمال کرتا ہے تو وہ خود قابل مذمت ہے۔ قابل ملامت بلکہ قابل گردن زنی ہے۔ مگر خدا کے واسطے اس بات کا فیصلہ ابھی فوراً" آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟"

"بند کر دو لی وی۔ مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے۔" فاضلہ نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

سوات میں سترہ سالہ لڑکی کو کوڑوں کی سزا کی خبر دل و دماغ پر کوڑا بن کر برس رہی تھی۔

تینوں کی تینوں گنگ بیٹھی تھیں۔ ملک کی حالت اور غیر ملکی مداخلت پہلے ہی ہر پاکستانی کو تشویش اور بے چینی میں مبتلا کر رہے تھے' اوپر سے اس طرح کی خبریں! اور پھر انہیں پھیلانے اور بتانے کا انداز؟ پھر تبصرے تجزیے' مباحثے اس وقت کچھ پاکستانی چینلز کے نیوز کاسٹر بی بی سی یا سی این این کے نیوز کاسٹرز کی طرح غیض و غضب اور غصے کا شکار نظر آ رہے تھے۔ اسلام' اسلامی قوانین اور شرعی سزائیں سب ہی ہدف ملامت تھے۔

"کیا یہ رئیل ویڈیو ہو سکتی ہے یا پھر Fake (جعلی)؟" عاقلہ نے سوال اٹھایا۔ کسی پولیس مین کی طرح وہ ہر معاملے کو انتہائی شک و شبے کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور کبھی اس کے شکوک و شبہات درست بھی نکل آتے تھے۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" عالمہ نے کندھے اچکائے۔

"یاد ہے۔ افغانستان پر حملے سے کچھ عرصہ پہلے مغربی چینلز پر ایک ویڈیو بار بار دکھائی جا رہی تھی جس میں افغانستان کی سرزمین پر دو افراد (جنہیں طالبان کہا گیا) ایک عورت کو لاٹھیوں سے پیٹ رہے تھے۔ اس ویڈیو کو لے کر اسلام اور مسلمانوں کو غیر مہذب اجڈ گنوار کیا کیا نہ القاب دیے گئے اور بعد میں ایک مغربی صحافی نے ہی پول کھولی کہ یہ ویڈیو جعلی تھی۔ اس میں نظر آنے والے مردوں اور خاتون کو رقم دے

[...]راس کام پر آمادہ کیا گیا تھا۔" عالمہ ایک لمحے کو رکی پھر [...]

"[...] کچھ بعید نہیں۔ اسلام کی تصویر مسخ کرنے کے [...] ایک چال بھی ہو سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ [...] طرح کا واقعہ پیش آیا ہو مگر کب؟ کہاں؟ کیا [...] سوات کا ہی واقعہ ہے؟ اور حال ہی کا ہے؟ اس [...] صحافی حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔"

"[...] حیرت اس بات پر ہے کہ 34 کوڑے [...] نے کے بعد وہ لڑکی کتنے آرام سے اٹھ کر چلی [...]" فاضلہ بھی مشکوک ہو رہی تھی۔

"[...] نہیں کیا حقیقت نکلے گی اس کے پردے میں [...]" عالمہ نے ایک گہری سانس لی "مگر یہ تو طے ہے کہ اب اس کی آڑ میں پھر اسلام اور پاکستان کو ہدف [ملا]مت بنایا جائے گا اور ہماری بہت سی آوازیں ان کی ہم نواہوں گی۔ پرانی کہاوت ہے' جس کا کھائیے اسی کا گایئے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

[ا]گلے ہفتے عالمہ ایک پروگرام دیکھ رہی تھی جو ڈاکٹر [عافی]ہ صدیقی کے حوالے سے تھا۔

"آیئے ناظرین اب ہم آپ کو ایک ویڈیو دکھاتے [ہیں] جو شاید نہیں یقیناً دنیا کی سب سے مہذب قوم اور [مہذ]ب یافتہ (بہ زعم خود) سوسائٹی کے منہ پر ایک طمانچہ ہیں اور ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں جو لوگ اپنی ہم مہذب اور ہم وطن شہری کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں انہوں نے ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا ہوگا؟ اور ہم تو چلیے جاہل ہیں' غیر مہذب ہیں' حقوق انسانی کی پامالی میں آگے ہیں مگر جناب یہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ جو دنیا بھر میں حقوق انسانی اور خاص طور پر خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے چیمپئن ہیں' آپ کے اپنے ملک اور اپنی ریاستوں میں یہ کیا ہوا ہے؟ کمپیئر کا لہجہ آخر میں طنزیہ ہو گیا۔

اسکرین پر ویڈیو چل رہی تھی اور عالمہ اسے دیکھ کر دنگ تھی۔ آخر یہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

ریاست اوہائیو کی کیٹی کا جرم اتنا تھا کہ وہ اپنی مرحومہ بہن کا ڈرائیونگ لائسنس استعمال کر رہی تھی۔ اسے گرفتار کر کے پولیس سیل میں لے جایا گیا جہاں اس شبے میں کہ اس کے پاس کوئی معمولی یا غیر معمولی ہتھیار تو نہیں' اسے مکمل طور پر بے لباس کر کے تلاشی لی گئی۔ جو چار پولیس اہلکار اس واقعے میں ملوث تھے ان میں دو مرد اہلکار تھے اور دو خواتین اہلکار' اوہائیو کے ایک مقامی چینل سے ایک ویڈیو نشر ہوئی اور ان ہی کا صحافی اب تفصیلات بتا رہا تھا' کیٹی

کے شوہر کے تاثرات بھی دکھائے گئے جو بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی کو کئی گھنٹے اسی حال میں سیل میں محبوس رکھا گیا اور اس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لیے ٹائلٹ پیپر کا استعمال کیا اور جب وہ گھر آئی تو اس کے جسم پر فقط ایک گیلی چادر تھی جس سے اس نے خود کو ڈھانپا تھا۔ کیتھی کے شوہر نے یہ بھی کہا کہ اس کی بیوی کے ساتھ اس طرح کا سلوک ایسا ہی ہے جیسے اس کا ریپ کیا گیا ہو۔

مقامی چینل کا صحافی مزید تفصیلات بتا رہا تھا کہ مقدمہ اب عدالت میں زیر سماعت ہے۔ کیتھی اور اس کا شوہر انصاف چاہتے ہیں۔

عالمہ انتظار کرتی رہی کہ شاید کسی چینل پر یہ خبر نشر ہو' جس کی ویڈیو مشتبہ نہیں بلکہ مستند تھی مگر شاید کسی نے بھی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا ہمیں اپنے دامن کے ہلکے گہرے داغ بہت نظر آتے ہیں مگر دوسروں کے تار تار وجود ہماری نگاہوں سے او جھل رہتے ہیں۔ عالمہ نے دل گرفتی سے سوچا۔ اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔

ڈیئر کیتھی!

تمہارے ساتھ جو ہوا بہت افسوس ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان' بحیثیت ایک پاکستانی' بحیثیت ایک عورت میں اس کی شدید مذمت کرتی ہوں۔ اور امید کرتی ہوں کہ تمہارے مجرموں کو سزا ملے اور تمہیں انصاف' یہ تو طے ہے کہ انتہائی اور شدید رویے دنیا میں ہر جگہ ہیں اس کے لیے کسی کا مخصوص حلقے یا مخصوص مذہب کا پیروکار ہونا شرط نہیں' اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک مظلوم ہی دوسرے مظلوم کا درد سمجھ سکتا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ بگرام کی سابقہ قیدی نمبر 650 پر کیا گزری ہوگی جب اسے بد ترین تشدد اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنایا گیا ہوگا' وہ بھی محض شک و شبہے کی بنیاد پر جس طرح تمہارے ساتھ ہوا۔

تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں سے اس کے چھوٹے چھوٹے تین بچے جدا کر دیے جائیں جس میں سے ایک شیر خوار بھی ہو' اس ماں کا دل کیسے نہ تڑپتا ہوگا۔ تم تصور کر سکتی ہو ہماری قوم کی بیٹی پر ظلم کے کیا کیا حربے آزمائے گئے ہوں گے جو اپنے نام کی طرح عزت مآب تھی' جو بے گناہ تھی اور بے گناہ ہے۔ اب وہ تمہارے ملک میں ہی قیدی بنی ہوئی ہے۔ تو پھر کیا تم اس کے لیے کوئی آواز اٹھاؤ گی؟

مجھے یہ امید اس لیے ہے کہ اس مظلوم قیدی عورت کے بارے میں بھی ہمیں تمہاری ہی ایک صحافی نے بتایا تھا۔ اسی نے آواز بلند کی تھی۔ مگر خیر یہ ہمارے زخم ہیں ان کا کیا ذکر' میں تم سے اپیل کرتی ہوں کہ یہاں سے جو چند آوازیں ایک مظلوم کی رہائی کے لیے اٹھ رہی ہیں تم اپنی آواز بھی اس میں شامل کر لو' میں جانتی ہوں تمہاری قوم کی اکثریت مہذب انسانی رویوں اور اقدار پر یقین رکھتی ہے اور ظلم کے خلاف اور مظلوم کے لیے آواز اٹھانا جانتی ہے۔ تب ہی تو عراق' افغان جنگ کے خلاف سب سے زیادہ مظاہرے مغرب میں ہوئے۔ یہ تو بس گنتی کے چند افراد کی پالیسیاں ہیں' جنہوں نے پوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔

تو میں امید رکھوں؟ کہ یو ایس کی ایک شہری خاتون اس پاکستانی خاتون کی زندہ اور بحفاظت وطن واپسی کے لیے آواز بلند کرے گی جو اس کے اپنے وطن میں قید ہے۔ جس کے دو بچے ابھی تک اس سے جدا اور لاپتہ ہیں۔

ڈیئر کیتھی! ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی اس کی آواز بن جاؤ۔

تم دونوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف انصاف کی منتظر۔

ایک پاکستانی۔

ارم مریم

دیوار گیر گھڑی نے با آواز بلند رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا تو خدیجہ بیگم بے قراری ہو کر نماز کے تخت سے نیچے اتر آئیں۔ جائے نماز کا کونہ موڑا اور تسبیح اٹھائے پاؤں میں چپل پہن کر کمرے سے نکل آئیں۔ پورے گھر پر خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ آنگن پار کر کے انہوں نے کچن میں قدم رکھا اور آہستگی سے بیرونی دروازے کی چٹخنی گرا کے پٹ وا کیا۔ گلی میں تاحد نگاہ تاریکی تھی۔ دور کہیں سے پالتو کتے کی آواز فضا میں موجود خاموشی اور سناٹے کو چیر کر ان تک آئی تو ان کا خدشات کی یلغار سے سہا دل کچھ اور بے کل ہونے لگا۔

بے دلی و مایوسی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پلٹیں تو ضوبیا کو اپنے پیچھے کھڑے دیکھ کر ایک پل کو ڈر سی گئیں۔

"ارے تم اس وقت؟" مسکراہٹ لبوں پر تو آنکھوں سے محبت و شفقت چھلکی تھی۔

"جی میں..." وہ ذرا مسکرائی۔

"آج بھی لیٹ ہیں ہارون؟"

"ہوں، پتہ نہیں کیوں یہ لڑکا اتنی دیر کرنے لگا ہے۔"

"آ جائیں گے، دنیا کے مصروف ترین انسان ہیں پورا ملک ان ہی کے کندھوں پہ تو سوار ہو کر چل رہا

مہمان ناول

ہے۔" انداز میں طنز کی آمیزش بھی تھی، جسے خدیجہ بیگم نے اپنی سادگی میں محسوس ہی نہیں کیا اور ایک بار پھر کلاک پہ نظر ڈالتے ہوئے قدرے چونکیں۔

"تم بیٹا! اس وقت بہت رات ہو چکی ہے، جاؤ آرام کرو جا کے۔" ان کے دبے ہوئے انداز میں جو گریز اور احتیاط چھپی تھی، اس سے ضویا اچھی طرح سے آگاہ تھی، جب ہی بے نیازی سے کاندھے اچکا کر بولی۔

"ممّا سو گئی ہیں۔" خدیجہ بیگم نے اب کے ذرا غور سے اس کی شکل دیکھی۔ صبیح چہرے کی جاذبیت، نکھار اور دلکشی اس کی کم عمری کی ہی عطا نہیں تھی۔ بلاشبہ قدرت نے اسے بہت فیاضی سے حسن کی دولت عطا کی تھی مگر کچھ دنوں سے وہ اس کے بدلے ہوئے

ڈھنگ محسوس کر کے عجیب سی بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ گو کہ ہارون کی طرف سے انہیں بھرپور قسم کی تسلی و اطمینان تھا۔ اپنی تربیت پہ بھروسہ بھی مگر......

"آپ سو جائیں پھپھو! ہارون کے آنے تک میں یہیں ہوں۔ اصل میں مجھے ان سے کچھ سوالات حل کرانے ہیں۔" انہیں بغور اپنی جانب تکتے پا کر وہ نظریں چرا کر مگر بہت اعتماد سے جھوٹ بول رہی تھی، وہ چپ سی رہ گئیں۔

"کیا سوچنے لگیں پھپھو؟" ضویا کچھ جز بز سی ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں ہارون کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔ وہ آئے تو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ تم ایسا کرو جو بھی سوال سمجھنے ہیں، کل دن میں سمجھ لینا، اتنی رات کو ایک تو وہ تھکا ہوا ہوگا، دوسرے اگر بھائی صاحب یا بھابھی کو پتہ چلا تو بالکل مناسب بات نہیں ہے۔"

ضویا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"دن میں وہ دستیاب کہاں ہوتے ہیں۔ چلیں میں آپ کی موجودگی میں پڑھ لوں گی۔ اب بتائیں، چائے بنا لاؤں۔ ایسے تو انتظار نہیں ہو سکتا، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے۔"

ضویا چائے بنانے کی غرض سے کچن میں جا چکی تھی، وہ بہت تھکے ہوئے سے انداز میں صوفے پہ واپس آ کر ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ بیرونی دروازے سے باہر پہلے بائیک اور پھر کال بیل کی آواز سنتے ہی جیسے مطمئن ہو گئیں۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے، اٹھتے بھی ان کے منہ سے کراہیں نکل گئی تھیں۔ یہ جوڑوں کا درد سردیوں کے آغاز سے بھی پہلے ان کی جان کو آن پڑتا تھا۔

عجلت بھرے انداز میں کمرے سے نکل کر باہر آئیں تو ضویا کو دروازہ کھولتے پا کر وہ وہیں کھڑی رہ گئیں۔ ہارون اسرار بائیک گھسیٹتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ بائیک کھڑی کر کے وہ ان کے پاس چلا آیا۔

"السلام علیکم اماں! آئی ایم ساری۔ آج پھر میں لیٹ ہو گیا۔" سر سے کیپ اتار کر ہاتھ کی مدد سے بال سنوارتا وہ خفیف سا ہو کر بولا۔ کچھ فاصلے پر موجود ضویا کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! اب تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔" انہوں نے پیار لٹاتی نظروں سے اس کے اونچے پورے وردی میں سجے شاندار سراپے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تو ہارون سر ہلاتا پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ضویا وہیں سکھ چین کے پیڑ سے پشت ٹکائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بالکل خاموش کھڑی تھی۔

"چائے بن گئی بیٹا؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"جی......" وہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا گئی پھر جانے کیا دل میں سمائی کہ سوچے سمجھے بنا اس کے پیچھے چلتی کمرے کے دروازے پہ آن ٹھہری۔ نہایت محتاط سی انگوٹھی کی مدد سے دی گئی دستک کے بعد دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھ دیا۔

ہارون اپنے دھیان میں تھا، شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے پلٹا اور اسے روبرو پا کے ٹھٹکا۔

"تم......" اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکی تھی۔

اوپری دونوں بٹن جو کھل چکے تھے، بند کرتے ہوئے وہ سوالیہ استفہامیہ انداز میں اسے تک رہا تھا اور ضویا جو دل کڑا کر کے یہاں تک آ تو گئی تھی، اب جھجک کر کھڑی تھی۔

"وہ...... پھپھو کھانے کا پوچھ رہی تھیں۔" کچھ اور نہ سوجھا تو اس نے احمقانہ سی بات کہہ کر ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ سہیلیوں کے پڑھائے عشق و عاشقی کے تمام اسباق ذہن سے اڑنچھو ہو چکے تھے۔

"مگر میں انہیں گرم کرنے کا کہہ تو آیا ہوں۔" اس کی حیرت دوچند ہوئی تھی تو ضویا کی خفت و خجالت۔

"جی...... مم...... میں چلتی ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا اور اگلے ہی لمحے چھپاک سے باہر۔ "او مائی گاڈ!" دھک دھک کرتے دل پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جانے کب کا سینے میں پھانس کی طرح اٹکا سانس خارج کیا اور کچن میں پھپھو کے پاس جانے کی بجائے دو گھروں کو ملاتا دروازہ کھولتی سرعت سے بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

کہنے کو رہتے ہو دل میں
پھر بھی کتنی دور کھڑے ہو
کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

حوریہ اپنی فرینڈز کے ساتھ سر احمد جہاں زیب کو اسائنمنٹ جمع کروانے کے بعد پیٹ پوجا کے خیال سے کینٹین کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنے آوارہ دوستوں کے جھرمٹ میں راجا اندر بنے ایزی کو پہلے اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے اور پھر لوفرانہ انداز میں آواز اپنے اشعار پڑھتے دیکھا، اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تھی۔

"ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی"

لمحہ بھر کی نگاہ چار ہونے پہ ہی ایزی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے آنکھ مار دی تھی اور اس کا دل چاہا، بڑھ کر اس آوارہ بدکردار لڑکے کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے مگر اندر اٹھتا اشتعال دبائے وہ تیز تیز چلتی کینٹین میں آئی اور گرنے کے سے انداز میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس نے بی اے بہت اچھے گریڈ سے پاس کیا تھا، انگلش میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہت اچھی جاب اس کا برسوں پرانا خواب تھا، جسے وہ ہر صورت پورا کرنا چاہتی تھی۔ اماں کی ناراضی کے باوجود اس نے اپنے بابا سے بات کی تھی، جو گورنمنٹ ہائی اسکول کے ریٹائرڈ ماسٹر تھے اور تعلیم کے حامی بھی مگر جانے کیوں اسے کو ایجوکیشن میں تعلیم دلوانے کے خیال سے متذبذب تھے اور یہ جھجک حوریہ نے ہی دور کی تھی۔

"مجھے پتا ہے بابا! مجھے اپنی اور آپ کی عزت کا پاس کیسے رکھنا ہے، مجھ پہ اعتماد کریں بابا! پلیز!" وہ اتنی لجاجت سے کہہ رہی تھی کہ حنیف محمد سے انکار نہیں ہو سکا اور حوریہ یہ عہد بھی کر چکی تھی کہ اسے ہرگز ہرگز بھی کسی لڑکے سے دوستی کرنی ہے، نہ ہی ان کی غلط امیدوں پہ پورا اترنا ہے۔ گو کہ اپنے غیر معمولی دلکش اور ساحرانہ نقوش کی بدولت کئی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی تھی مگر اس کا لیا دیا انداز اور صنفِ مخالف کے لیے نو لفٹ کا تاثر دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں سے یہ ایزی جانے کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فلاورز شاپ پر اس نے گاڑی روکی تھی اور اتر کر رنگ برنگ اور خوشنما پھول دیکھنے لگی۔ ہر سو تیزی سے پھیلتی شام کی سیاہی اور تیز چلتی ہوائیں بارش کی پیشگی آمد کا پتا دے رہی تھیں، جس وقت اس نے ریڈ و پنک روز کی کلیوں سے سجا بوکے سنبھال کر پے منٹ کی، تب بوجھل گھٹاؤں سے پہلی بوند نے ٹپک کر اسے چونکا دیا۔ بوندیں ایک تواتر سے گرنے لگی تھیں۔ اس کے لبوں پہ بہت دلفریب سی مسکراہٹ بکھرتی جا رہی تھی۔ کل سے آج تلک کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ وہ جو ابھی

تھا' کل تک جو اس کی فاسٹ ڈرائیو کی اندھی خواہش کی بھینٹ چڑھتے گویا موت کے منہ میں جاتے بچا تھا' وہ اتنی رحم دل بھی کبھی نہیں رہی تھی' نہ ہی اس قدر احمق کہ کسی کو ٹکر مار کر زخمی کرے اور پھر اسے اٹھا کر ہاسپٹل بھی لے کر جائے مگر وہ بری پھنسی تھی۔ ٹریفک کا اژدھام تھا تو آگے وہ درد کی شدتوں سے کراہتا انسانی وجود۔ آن واحد میں لوگ اکٹھے ہوئے تھے اور اسے لعنت ملامت کرنے لگے' اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اسے لے کر ہسپتال جاتی مگر راستے میں ہی اس کا دل اسے بری طرح دغا دے گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' لمحوں میں سحر طاری کر دینے والی پرسنالٹی رکھتا تھا' کیسے لمحوں میں اس کی بیگانگی اور بے نیازی اس کی ذات کو چھوڑے کہیں فضا میں تحلیل ہو گئی تھی اور وہ خود پر بیت جانے والی اس انہونی پر ششدر ایک مرتبہ پھر ایکسیڈنٹ کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر مسرور کے کلینک پر اسے ایڈمٹ کیا گیا تھا' چوٹیں معمولی تھیں مگر سر پر لگنے والی چوٹ خطرناک تھی' جب ہی ڈاکٹر نے اسے ایڈمٹ کر لیا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھر واپس ہوئی تھی کہ اس عرصے میں ماما کی لگاتار کئی مس کالز اس کے سیل پہ آ چکی تھیں مگر آنے سے قبل وہ اس مغرور نقوش والے شخص سے اپنا تعارف ضرور کروا چکی تھی۔

"میں کل پھر آؤں گی۔ ڈاکٹر کی فیس اور ہاسپٹل کے چارجز کی آپ فکر نہ کریں' وہ میں بھروں گی۔ ڈونٹ وری۔"

اس کا تسلی دینے کا بھی اپنا ہی انداز تھا مگر مقابل کے چہرے پر حد درجہ درشتی دیکھ کر اپنی بات کے غلط ہونے کا احساس خفت کا شکار کر گیا۔

"اوہ... آئی ایم ساری۔ شاید آپ نے مائنڈ کیا' ایکچوئلی..." وہ خفیف ہوئی تھی۔

"وہ... آپ کا کوئی کانٹیکٹ نمبر تو ہوگا؟" وہ جانے کیوں اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش رہی تھی۔ مگر چند لمحوں بعد جب اس نے اپنا سوال دہرایا' اس کی وضاحت کے ساتھ کہ اس کے گھر والے پریشان ہوں گے' وہ انہیں اطلاع کرنا چاہتی ہے' اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"آپ کا کام ختم ہو چکا' بہت مہربانی کہ مجھے یہاں پہنچا دیا' ورنہ سڑک پر تو مجھے تماشا بنا کر مرنے کو چھوڑنے کی کوئی کسر آپ نے رکھی نہیں تھی۔"

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اسے کچھ کہہ دے اور وہ اسے بخش دے' ناممکن۔ ابھی بھی وہ اس پر نفرین بھیج کر اپنی راہ ہو لیتی۔

"پلیز جائیں آپ یہاں سے۔ لیو می الون پلیز۔" وہ ازحد تلخی سے کہہ رہا تھا۔ اسوہ یکلخت پلٹی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلینک کے باہر گاڑی روک کر وہ بارش کی بوچھاڑ کی پروا کیے بغیر نکلی تھی اور بوکے اٹھائے تیز قدموں سے چلتی کلینک کے داخلی گلاس ڈور کو دھکیلتی اندر داخل ہو گئی۔ پہلا دھچکا اسے خالی بیڈ کو دیکھ کر لگا تھا۔ کل وہ یہیں اسے چھوڑ گئی تھی اور اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ خود سے کہیں جا سکتا۔ وہ جیسے کانٹوں پر چلتی ریسپشن پر آئی اور دوسرا دھچکا اسے اس وقت لگا جب ریسپشنسٹ نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سمیت یہ کہتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا کہ وہ مریض آج صبح نو بجے ڈسچارج ہو کر چلا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

ضویا کی نگاہیں بظاہر کتاب پر تھیں مگر ذہن ہارون اسرار کو سوچ رہا تھا' وہی ہارون اسرار جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے سامنے رہا تھا اور اس نے اپنی ماں کی طرح کبھی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک ہارون اسرار کی حیثیت نچلے درجے کے انسان اور ایک معمولی ملازم سے زیادہ نہیں تھی۔

ہارون اسرار اس کا پھپھی زاد تھا جو بچپن میں باپ کے مرنے کے بعد ان کے در پہ آ کر بیٹھ گیا تھا اور ایسا جم کر بیٹھا کہ پھر ہلنے کا نام نہیں لیا وہ اور اس کی ماں کوئی ایسا بھی بوجھ نہیں بنے تھے کہ پھپھو اپنی سادگی اور انکساری کی بدولت شاید ہی کسی کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوں۔ جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھے جب وہ خود سے چند سال چھوٹے بھائی کی دہلیز پر آئیں تو والدین یہ صدمہ سہہ نہیں سکے۔ دل کا جان لیوا دورہ بیٹی کے غم میں مزید اضافہ کر گیا۔ باپ کی وفات کے بعد مراد حسن (ضویا کے والد) اور اماں کو بیٹی کے دکھ نے اور بھی حساس کر دیا۔ کچھ کھانے کی بات ہوتی یا پہننے کی اولیت انہیں دی جانے لگی۔ یہ بھی ایک طرح کا اظہار تھا غم بٹانے کا' اپنائیت و محبت کا تاکہ انہیں شوہر کی کمی کا احساس نہ ہو۔ یہی بات ثانیہ (ضویا کی والدہ) کے دل میں ضد اور اس کے معصوم بچے کی نفرت کے بیج کو تناور درخت بنا گئی۔ اماں تو ایک دو سال کے عرصے میں راہی عدم سدھار گئیں۔ اب ثانیہ بیگم کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ شوہر سارا دن کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے۔ خدیجہ کو انہوں نے بہت آسانی اور سہولت سے ایک ملازمہ کا درجہ دے دیا۔ ہارون کم آمیز اور انتہائی ذہین بچہ تھا۔ گھر کا سودا سلف لانے سے لے کر ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے اس کی تھکن کا خیال کیے بغیر دوڑا دیا جاتا۔ خواہشات کو مارنا اور سنگ سنگ کر جینا وہ بہت کم عمری میں سیکھ گیا تھا۔ یہ تو ماموں کا دم غنیمت تھا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر نہیں بیٹھا تھا۔ ضویا میٹرک کے بعد کالج میں گئی تھی۔ نئی نئی سہیلیاں ہوئی تھیں جو پڑھائی سے زیادہ دوسری باتوں کی دلچسپی رکھتی تھیں۔ انڈین موویز' انڈین ڈرامے' ٹاپ ٹین' سانگز بالی ووڈ اینڈ ہالی ووڈ کے ہیروز ان کی پسند کے گراف پر بہت اوپر تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ سب فلمی دنیا کی تمام باتوں کی آگاہی رکھا کرتی تھی۔ یہی باتیں وہ آپس میں ڈسکس کیا کرتی تھیں۔ ضویا کے لیے یہ سب کچھ نیا اور بہت دلچسپ تھا۔

اس کی برتھ ڈے سیلبریٹ کرنے کے لیے اس کی یہی فرینڈز اس کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے اس کے گھر میں ہارون اسرار کو دیکھا تھا' وہ ان دنوں سی ایس ایس کر رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی' وہ پولیس میں بھرتی ہو کر اپنے ملک کے لیے کچھ کر سکے۔

وہ معمول کے مطابق صبح کے ناشتے کے لیے فریش جوس کے پیکٹ بریڈ اور جیم وغیرہ لایا تھا اور کچن میں رکھ کر پلٹ رہا تھا' جب لائبہ نے اسے بالکل اچانک دیکھ لیا۔ وہ تو دل تھام کر رہ گئی تھی۔

"یہ... یہ پرنس کون تھا' اتنا گڈ لکنگ اور ڈیشنگ ہے تمہارا کزن اور تم نے آج تک ہوا نہیں لگائی؟" وہ سب اس کے سر ہوئی تھیں اور ضویا حق دق سی آنکھیں پھاڑے انہیں جانے کون سے القاب سے نوازتے اور اس کے لیے آہیں بھرتے اور خود کو صرف اس وجہ سے لکی ہونے کی نوید سنتی رہی تھی۔

"سنو' کیا تمہارا اس کے ساتھ کچھ چل رہا ہے۔"

زہرا نے اس کا بازو ہلایا تھا اور وہ اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش میں کچھ اور ہونق ہو گئی۔

"کیا مطلب' کیا چل رہا ہے؟" اسے یہ انداز ناگوار محسوس ہوا تھا۔

"مطلب عشق وشق 'افیئر'۔" زہرا نے ایک بار پھر آہ بھری اور یکایک ہی ضویا کو جانے کیوں ایک بار پھر شرمندگی نے آن لیا' ویسی ہی شرمندگی جو اس نے اس وقت محسوس کی تھی کہ جب اس نے کہا تھا "اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔"

"نہیں۔" وہ چیخی تھی۔ "یعنی وہ اتنا ڈیشنگ" اس قدر شان دار شخص تمہارے سامنے ہے اور تمہیں نظر نہیں آتا۔"

"کیا تمہاری آئی سائیڈ ویک ہے؟" نائلہ کے سنجیدگی سے سوال کرنے پر وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"یہ اپالو تمہیں کیوں نظر نہیں آیا' ایسا کرو اگر تم نہیں تو میری بات بنوا دو۔" نائلہ نے آنکھ میچ کر جذب سے کہا اور ضویا گھبرا کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

اسی رات وہ جب ان باتوں کو لے کر اچھی خاصی ڈسٹرب ہو گئی تھی اور بے چینی سے باہر ٹہل رہی تھی وہ اچانک ہی سامنے آگیا تھا۔ وہ یقیناً پاپا کے کمرے سے باہر آیا تھا۔

"سنو۔" وہ اپنے دھیان میں دروازہ بند کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ اس پکار پر چونکا۔ سرخ اور نیلے خوبصورت پرنٹ کے شلوار سوٹ میں دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے وہ اسے بہت توجہ' بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کہاں رہی تھی' جانچ رہی تھی اور وہ تو ان تعریفوں سے بھی کہیں بڑھ کر اٹریکٹو اور دلربا شخصیت کا مالک تھا' وہ حیران حیران سی دیکھ کر سوچتی رہی۔ ہارون کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ سا ہوا۔

"کچھ کام ہے؟" جزبز ہونے سے پہلے کی کیفیت حیرانی کی تھی۔

"ہاں کام تو ہے لیکن کل بتاؤں گی۔" وہ جانے کیوں مسکرائی اور ایک بار پھر اس کا سراپا جائزہ لیا۔ ہارون کو عجیب سا احساس ہوا' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

پھر مزید تین سال گزر گئے' وہ اپنی فرینڈز کی تمام عادات اپنا لینے کے باوجود بھی کبھی کھل کر ہارون سے اظہار نہ کر سکی۔ البتہ دل میں جھنجلاتی ضرور رہتی۔

جانے کیسا دبدبہ اور رعب تھا اس کی شخصیت میں کہ وہ اس کے سامنے جاتے ہی سب کچھ بھولنے لگتی۔ "کیا وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتا' کتنا بدل گئی ہوں میں اس کی وجہ سے۔ اس کے آس پاس منڈلاتی ہوں' اس کے کتنے ہی کام کرتی ہوں' وہ کیوں خود سے نہیں سمجھ جاتا۔" کتاب پٹختے ہوئے وہ چڑ سی گئی۔

باہر بارش کا شور تھا' وہ اٹھی اور چلتی ہوئی کھڑکی میں آن رکی۔ گلاس ونڈو کے پار قدرت کے خوبصورت رنگ بکھرے تھے' وسیع و عریض لان میں بہار دکھاتے گل بوٹے بارش میں دھل کر نکھر سے گئے تھے۔ تب ہی وہ چونکی تھی۔ نگاہ اٹھی اور ساکن رہ گئی۔ ثانیہ بیگم کسی پہ برہم ہو رہی تھیں۔ وہ ہارون اسرار تھا جو ہمیشہ کی طرح ان کی لعنت ملامت کو بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا۔ ضویا کے اندر ناگواری بکھری تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور تیز تیز چلتی باہر آگئی۔

"کیا ہوا ہے؟ کیوں چلا رہی ہیں مما؟" بدلحاظ اور گستاخ لہجہ۔ ثانیہ بیگم کے ساتھ ہارون اسرار نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ ہارون اسرار نے ایک کے بعد دوسری نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی اور پلٹ کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟"

ثانیہ بیگم' ہارون اسرار کی چوڑی پشت کو گھورتے ہوئے اس پر غرائیں۔

"آپ کیا قصور کیا تھا اس نے کہ آپ اس پر اس طرح برس رہی تھیں۔ مما! کتنی بار یہ بات بتاؤں کہ وہ آپ کا ملازم نہیں ہے۔ پولیس میں اعلا گریڈ کا آفیسر ہے۔"

"اونہہ۔۔۔ ہوا کرے' ہمارے ٹکڑوں پر ہی تو۔۔۔"

"مما۔۔۔" ضویا کے لہجے میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔ "وہ اس گھر کا ہونے والا داماد بھی ہے' یہ بات آپ کو پتا ہے پھر بھی آپ اسے۔۔۔"

"شٹ اپ۔" اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی اس سے پہلے ہی وہ حلق کے بل دھاڑی تھیں اور ایک

زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کر دیا تھا۔ ضویا گال پر ہاتھ رکھے چھلکتی آنکھوں میں تحیر سموئے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ہمت کیسے ہوئی تمہاری اپنے ماں باپ سے ایسی بات کہنے کی یہ فضول بکواس تم سے' اس کی ماں نے کی ہے؟" ان کی آنکھیں لہو رنگ ہو چلی تھیں۔

"نہیں' پاپا نے اور پاپا اپنے ابا اماں کی خواہش کو ہرگز نہیں بھلائیں گے۔ مما! چاہے آپ کچھ بھی کر لیں' ایسے بھی کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔"

حواس بحال ہوئے تو ضویا ان کے وجود پر بجلیاں گرا کر ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر بھاگ گئی۔ وہ ششدر کھڑی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"پھر تم نے کیا سوچا؟" خدیجہ بیگم نے اپنے سامنے بیٹھے تھکے تھکے سے ہارون اسرار کے چہرے پر گہری نظر ڈالی' وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی گھر آیا تھا۔

"کس بارے میں؟" وہ چونکا تھا اور حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان کا انداز خاص تھا یا اسے محسوس ہوا۔

"ضویا کے متعلق؟" انہوں نے مسکرا کر دلچسپی سے اسے دیکھا تو ہارون کو جھٹکا لگا تھا۔

"کیا مطلب ضویا کے متعلق میں کیوں سوچنے لگا۔" یہ نام سن کر اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

"بھول گئے بیٹا! حالانکہ یہ بھولنے والی بات تو نہیں تھی۔ اماں' ابا کی شدید خواہش تھی یہ اور بھائی جان' اماں کی۔" وہ عاجز سا ہوتا انہیں ٹوک گیا۔ "وہ سب پرانی باتیں تھیں۔ نانا جان اور نانو اب اس دنیا میں نہیں رہے' ان کے ساتھ ہی ان کی خواہش بھی منوں مٹی تلے جا چھپی۔ آپ پلیز! اس تذکرے کو رہنے دیں ہم پہلے ہی ماموں کے زیر احسان ہیں۔ کیا آپ اپنے بیٹے کو ساری عمر ان کا زیر بار رکھنا چاہتی ہیں؟" اس کا لہجہ ضد' تلخ اور کڑواہٹ لیے تھا۔ انہوں نے اس کی تلخی کو محسوس کیا اور گہرا سانس کھینچا۔

"کیا تم ضویا کو پسند نہیں کرتے؟" ان کے لہجے میں ایک انجانا سا خوف در آیا تھا۔ ہارون کے چہرے سے بے بسی کا اظہار چھلکا۔

"وہ اماں۔ میں۔۔۔ آئی ایم سوری۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ لائف پارٹنر کے لیے میرے ذہن میں جو امیج ہے' وہ کم از کم ضویا جیسی لڑکی کا نہیں ہے۔" وہ جھنجلاتے ہوئے کہتا بیٹھ گیا۔

"تو پھر کیسی لڑکی کا ہے؟" خدیجہ بیگم کا لہجہ کانپا اور چہرہ متغیر ہونے لگا۔

"سائرہ خان' اماں! وہ بہت اچھی ہے' میرے دوست کی بہن ہے' اعلا تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی۔" اس کے لہجے میں ہی نہیں' آنکھوں میں بھی نرمی اتر آئی۔ خدیجہ بیگم یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

"یعنی تم۔۔۔ تم۔۔۔ ضویا سے شادی نہیں کرو گے؟" ان کے حلق سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی۔ ہارون چونکا اور بہت تھکے ہوئے انداز میں ماں کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"کیا ممانی جان' ضویا کی شادی مجھ سے کر دیں گی؟" اس کی آواز سپاٹ تھی۔

"پتا نہیں لیکن بھائی جان ضرور ایسا چاہتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی انہوں نے مجھ سے بات کی ہے۔"

"اور کل شام ضویا کو دیکھنے ایک بہت ایڈوانس قسم کی فیملی آئی ہوئی تھی جو اپر کلاس کے لگتے تھے۔"

ہارون نے بھرپور مسکراہٹ سے کہتے ہوئے خدیجہ بیگم کو حیران کر ڈالا۔

"آپ ابھی خاموش رہیں اور دیکھیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔ اماں بہتر ہوگا کہ ضویا اس گھر میں آنے کے بجائے کہیں اور کھپ جائے۔"

"ہاں! تاکہ تم اپنی پسند کی لڑکی لا سکو۔" انہیں اس کی بے نیازی کھلی تھی۔ ہارون نے مسکراہٹ ضبط کر لی اور وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے چند روز قبل کی وہ برستی شام بہت اچھی طرح سے یاد تھی۔ جب کمرے میں داخل روم سے نکلتے ہوئے اس نے ضویا کو اپنی اسٹڈی ٹیبل پر جھکے دیکھا تھا۔ آہٹ پر وہ پلٹی تھی اور اسے روبرو پا کر گھبرانے یا

بوکھلانے کے بجائے وہ بہت اعتماد سے مسکرائی تھی۔ اتنے اعتماد سے کہ وہ جو اپنے کمرے میں بے تکلفانہ انداز میں جینز پر بنیان ہی پہن کر باہر آگیا تھا۔ خود کو اس کے سامنے اس حلیے میں پاکر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" شرٹ پہننے کے چکر میں وہ اس کی کارگزاری پر دھیان نہیں دے سکا تھا۔

"خود دیکھ لونا!" وہ ہنسی اور سراہتی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ ہارون اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرتا جزبز ہوا تھا اور تیزی سے شرٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔

"اوکے اس وقت تو تم جاؤ۔ یقیناً تمہیں کوئی سمری یاد کرنا ہوگی۔ ٹرانسلیشن کروانا ہوگی یا پھر..."

"یا پھر کچھ نہیں۔ ہارون اسرار! ان سب فضولیات کے علاوہ بھی تو دنیا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً" یہ کہ تمہارا نام بہت یونیک ہے مگر تم سے زیادہ نہیں۔ سچ بتاؤ۔ ہر روز کتنی لڑکیاں مرتی ہیں تم پر۔" اس کے نزدیک آکر آخری بٹن جو رہ گیا تھا' اس کے ہاتھ ہٹا کر خود بند کرتے ہوئے وہ اس درجہ اعتماد سے بولی تھی کہ ہارون اسرار اس کی اس جرأت کے مظاہرے یا دوسرے لفظوں میں بے شرمی پر دنگ رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

طوفانی ہواؤں کے جھکڑ دروازوں اور کھڑکیوں سے سر پٹخ رہے تھے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی خوفناک چمک ماحول میں پراسراریت پیدا کر رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو گلاس ونڈو کا شیشہ جیسے تڑختا ہوا سا محسوس ہوتا اور یہ نیم تاریک سا کمرہ چکاچوند روشنی سے بھر جاتا۔ آف وائٹ پردے' چھت سے لٹکتا قیمتی فانوس' بلیو مخملیں صوفے ہر شے پر ایک وحشت بھری خاموشی تھی۔ اسی خاموشی کا حصہ اس کا وجود بھی تھا جو کسی پتھر کی مانند ہی ساکت تھا۔ ایزی چیئر پر نیم دراز سینے پہ ادھ کھلے فیشن میگزین کو اوندھائے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی' تب ہی وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونکی جو کہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا گیا تھا۔ کیچڑ سے بھرے جوگرز نے قیمتی کارپٹ پر نقش و نگار بنائے تھے' جیسے تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

"اسٹاپ اٹ ایزی شیم آن یو۔" اس نے انگشت شہادت کی مدد سے کارپٹ پر کیچڑ سے بن جانے والے جوتوں کے نشانوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ملامتی نظروں سے اسے گھورا۔

"یہ کارپٹ تمہارے باپ نے تو نہیں بچھوایا یہاں پر۔" اس کا لہجہ اس کے چہرے کے نقوش کی طرح ہی تھا۔

"اوہ لیس! میرے باپ نے نہیں بچھوایا تو تمہارے باپ نے بھی نہیں بچھوایا۔ یہ تو ہماری مشترکہ ممی نے بچھوایا ہے۔ جو اتنی امیر کبیر ہے کہ اتنے ہی دس کارپٹ بھی تمہیں لاکر دے سکتی ہے۔ لو میرے لال اور انہیں بے دریغ گندا کرو۔" اس نے چڑ کر کہا۔ ایزی نے جیسے اس کی کسی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ بڑا سا مخملیں فلور کشن گھسیٹا اور اسے سر کے نیچے رکھ کر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

"خیریت! تم اتنی رات تک جاگ رہی ہو؟"

جینز کی جیبیں ٹٹول کر گولڈ لیف کا سگریٹ کیس اور لائٹر نکالنے کے بعد وہ سگریٹ نکال کر لبوں میں دبا تا اب شعلہ دکھا رہا تھا۔ اسوہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہاں۔"

ایزی جو نیا سگریٹ سلگانے کو ڈبیا اٹھا رہا تھا' سرعت سے ہاتھ پشت کے پیچھے لے گیا۔ سامنے موجود عورت نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ ان کے ریشمی لانبے گھنیرے بال ان کی پوری پشت کو چھپائے ہوئے تھے۔ وہ اس عمر میں بھی اتنی جاذب نظر اور پرکشش شخصیت کی مالک تھیں کہ ایک کے بعد دوسری نگاہ اس پر خود بخود اٹھتی تھی۔

"نہیں' بس یونہی' بس جاہی رہے تھے سونے۔" جواب اسوہ نے دیا تھا جبکہ ایزی میکانکی انداز میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ چکا تھا۔ جب ان کی ٹھہری ہوئی آواز پر ٹھٹکا۔

"وہ اچانک مڑا۔

"اگر جوتے خراب ہوں تو انہیں باہر اتار دیا کرو۔" ایزی نے ٹھٹک کر اسوہ کو دیکھا' جو ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہی تھی۔ وہ پیر پٹختا ہوا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا جبکہ اسوہ لیٹ کر آنکھیں موند کر سوچنے لگی۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جس کی تلاش میں اس نے خاک چھانتی پھری ہے' وہ اسے مایوسی کے تھکن کی انتہاؤں پر یوں اچانک مل جائے گا۔ ان دنوں پر فضا میں حبس تھا۔ آسمان کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا۔ بارش کے آثار تھے' جب وہ گھر سے نکلی اور ڈیم روڈ سے ٹرن لے کر چرچ روڈ کی سمت آگئی تھی اور تب ہی اسے لگا تھا جیسے برستی بوندوں نے سرتال بجائے اور فضائیں مہک اٹھی ہیں۔

موسلا دھار بارش میں بھیگتا وہ ایک شخص جسے اس کی نگاہ نے کہاں کہاں اور کس کس جتن سے کھوجا تھا۔ سڑک کنارے چلتا ہوا کتنا بے نیاز دکھ رہا تھا۔ اس نے تو جیسے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے گاڑی سڑک پر روکی۔ ایک افراتفری کے سے عالم میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ یوں اس طرح کہ اسے پھر سے کھو دینے کا خوف اسے ہراساں کر رہا تھا۔

"سنیں... سنیں... پلیز۔" وہ بارش کیچڑ اور گاڑیوں کی پروا کیے بغیر لپکتی ہوئی اس تک آئی تھی۔ وہ چونک کر رکا تھا اور حیران سا ہو کر پلٹا۔ اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں نہ کوئی شناسائی کی رمق تھی' نہ ہی کوئی پہچان بلکہ وہ کیسی حیرانی اور بیگانگی سمیت اسے گھور رہا تھا۔

"اوہ گاڈ...! اگر اب بھی تم نہ ملتے نہ تو مجھے لگنے لگا تھا میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاؤں گی۔" اس کا لہجہ خوشی کے احساس سمیت بے ربط ہو چلا تھا۔ اس نے اب کے ذرا دھیان سے مرکزی نگاہ سے اسے دیکھا مگر ان آنکھوں میں پہچان کا رنگ پھر بھی نہ ابھرا تھا۔

"واٹ نان سینس۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ ہیں کون اور یہ جذباتی تقریر کس سلسلے میں فرما رہی ہیں؟" اس کا لہجہ بہت سخت اور تلخ تھا۔

اسوہ کے اندر یکلخت چھناکا ہوا' وہ ایک دم چپ سی ہوئی تھی۔ اس نے بہت ٹوٹی ہوئی آس سمیت اسے دیکھا۔ یوں جیسے وہ یقین نہ کرپائی ہو کہ وہ واقعی اسے فراموش کر چکا ہے۔

"آ... آپ کو واقعی یاد نہیں' کچھ بھی۔" اس کے مدھم لہجے پر آنسوؤں کی نمی غلبہ پانے لگی۔

"مگر کیا؟" وہ جھنجلانے لگا۔ بیچ راہ یوں راستہ روک کر کھڑا کرنے والی یہ لڑکی اسے کھسکی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"وہی... وہی حادثہ... جب آپ میری گاڑی سے ٹکرا گئے تھے اور میں..."

"اوہ..." اسے جھٹکا لگا۔

"تو وہ تم تھیں۔" وہ آنکھیں نکال کر پھنکارا کچھ اس طرح کہ اسوہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بارش اسی تواتر سے دونوں کو بھگو رہی تھی۔ اس نے مجرمانہ سے انداز میں سر جھکا لیا۔

"میں آئی تھی اگلے روز ادائیگی کرنے اور آپ کی عیادت..."

"آپ کو یہی مجھے بتانا تھا۔" اس نے طنزیہ سوال کیا۔ اسوہ لاجواب سی ہو گئی اور بے بس سی ہو کر ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ وہ کبھی بھی اسے ایک بار پھر نہ کھوتی' اگر وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ کر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔

"اگر یہ محبت ہے تو کاش! مجھے یہ محبت نہ ہوئی ہوتی۔"

ایک تارہ اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر چپکے سے تکیے میں جذب ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ہارون نے جھنجلا کر فائل بند کر دی' اس کا ذہن منتشر تھا' وہ یکسوئی سے کوئی کام بھی نپٹا نہیں پا رہا تھا۔

اپنے دو سالہ کیریر میں اس نے بہت سے مشکل کیس خوش اسلوبی سے ہینڈل کیے تھے اور کامیاب بھی رہا تھا۔ سینئرز آفیسر اس کی ذہانت کے قائل اور ان تھک محنت کو پسند کرتے تھے مگر زندگی میں اس مقام پر وہ جیسے اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا۔ اماں کی ناراضی اس کے اعصاب کے تناؤ میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایک ہی ضد اور وہ بھی بے جا۔ کیا وہ ضویا سے شادی کرنے کے بعد اسے وہ مقام دے پائے گا جو سائرہ کو اس کا دل کب کا دے بھی چکا ہے۔ کیا وہ اسے محض اس لیے اپنی زندگی کا حصہ بنا لے کہ اس کی ماں اپنے بھائی کے احسانوں کا بار اتارنا چاہتی ہے۔ احسان فراموش تو وہ بھی نہیں تھا مگر احسان کا بدلہ اس طرح چکانے پر بھی ہرگز آمادہ نہیں تھا کہ ساری عمر کا روگ پال لے۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ تخیل کے پردے پر سائرہ کا دلنشیں سراپا لہرانے لگا تو ایک آسودہ مسکراہٹ آپ ہی آپ اس کے لبوں پر آن ٹھہری۔

ضویا کی عادات و اطوار کیا تھیں، اس نے کبھی ان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پہلی مرتبہ وہ تب چونکا تھا، جب ضویا اپنی فرینڈز کے ساتھ اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ سب کی سب جن نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں، وہ ان سراہتی اور ستائشی نگاہوں کا اب عادی ہو چکا تھا۔ صنف نازک کا اپنی طرف جھکاؤ اب اسے حیران نہیں کرتا تھا مگر ضویا کی فرینڈز کی حرکات اور اشارے بازیوں پر وہ تشویش کا شکار ہوا تھا۔ ضویا کا میل جول اتنی غلط لڑکیوں سے ہو گا، اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

"کیا سوچا جا رہا ہے یوں مسکرا مسکرا کے؟" مگر جھٹکا اسے اس وقت لگا تھا جب اس نے ضویا کا جھکاؤ اپنی طرف محسوس کیا۔ ہارون نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کم از کم تمہیں نہیں۔ بائی دا وے، تمہیں کسی نے اتنا بھی نہیں بتایا کہ رات کو اس پہر کسی غیر محرم مرد کے کمرے میں آنا کتنی آکورڈ حرکت ہے۔"

اس کا لہجہ بلا کا سرد اور تلخ تھا اور یہی تلخی بے گانگی ضویا کو آگ لگاتی تھی۔ وہ ہارون کو اب بھی خود سے کمتر سمجھتی تھی۔

"اپنے گھر کے کسی حصہ میں بھی آتے جاتے مجھے قطعی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں شاید یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ تم ہمارے گھر کے ہی ایک کمرے میں موجود ہو۔"

وہ بات کرتے ہوئے اس کی کرسی، جس پر وہ بیٹھا تھا، بالکل پیچھے پر آ کر ٹک گئی۔ فل فٹنگ کی جدید تراش خراش کی شرٹ کا گلا انتہائی گہرا تھا وہ بہکا دینے کی حد تک حسین تھی۔ وہ بہت مضبوط اعصاب رکھتا تھا مگر اس طرح سے آزمائش میں پڑنا وہ بھلا اٹھا۔ ناگواری اور برہمی کے ساتھ اسے دھکا دے کر دور ہٹایا۔

"کیا کہوں تم کو، مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ تمہاری جیسی سطحی سوچ کی معمولی لڑکی میرے ماموں کی اولاد ہے، جسے نہ ان کی عزت کی پروا ہے نہ..."

"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔" اس کی غضب سے بھری دھاڑ ہارون کی سرد سفاک آواز پر غالب آگئی۔

"میں یہاں تمہارا درس سننے نہیں آئی۔ تم یہ بتاؤ انکار کیوں کر رہے ہو؟" وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑے تیور لیے سوال کر رہی تھی۔

"خود سے پوچھو، کیا کمی ہے تم میں، جو میرے انکار کی وجہ بنتی۔" وہ جواباً لحاظ کیے بنا تند لہجے میں بولا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی پھر ایک وحشت کے سے عالم میں اسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے ہوئے غرائی۔

"ایک بات یاد رکھنا ہارون! مجھے ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا ہے۔" وہ گویا اسے دھمکا کر وہاں سے چلی گئی۔ ہارون لب بھینچے کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

نماز فجر کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے گھر یوں بھی موسم اپنی پوری شدت کا احساس بخشتے تھے۔

[illegible] ہی ہوتیں تو دھوپ کی پہلی کرن جیسے ان ہی کے [illegible] آتی اور آخری شعاع تک ٹکی رہتی تھی۔ [illegible] دھوپ اسی قدر بے اعتنائی برتا کرتی۔ چھوٹا [illegible] اور برآمدہ وہ کمرے، کچن، باتھ روم یہ تھی [illegible] جس میں وہ بہت مطمئن اور خوش باش [illegible] خرابی تو اس ایزی کے بچے نے پیدا کر کے [illegible] جب سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، [illegible] اور تقررات نے جیسے اس کے دل و ذہن کو [illegible] تھا۔ اتنی نازیبا حرکت کی تھی کہ وہ غصے میں [illegible] رہی تھی۔ وہ ڈر کر گھر بیٹھنا بھی نہیں چاہتی [illegible] ہی رابعہ کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ [illegible] چلی آئی تھی۔

"[illegible] میں نے کہا بھی تھا چند دن مت آنا، معاملے کو [illegible] ٹھنڈا ہونے دیتیں۔"

"[illegible]" اس نے ٹوک دیا۔ "میں نہ بزدل ہوں اور [illegible] پلیز ایسا سبق مت پڑھاؤ مجھے۔"

[illegible] نہ جانے کیوں رابعہ پر بھی غصہ آگیا تھا اور رابعہ [illegible] کہے بنا کتاب پر جھک گئی تھی۔ سارا دن [illegible] گزرا تھا، وہ کہیں نظر نہیں آیا اور جب وہ [illegible] بعد گیٹ سے نکل کر اپنے پوائنٹ کے انتظار [illegible] تھی، وہ اچانک جانے کہاں سے آن دھمکا

"[illegible] مجھ سے دوستی کر لو۔ فائدے میں رہو گی [illegible] ورنہ نقصان کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔"

[illegible] نے بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ کر [illegible] چھوڑی تھی۔ حوریہ نے کھا جانے والی [illegible] اسے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"[illegible] ہے، تمہیں آسان زبان سمجھ میں نہیں [illegible]" دھپ دھپ کرتا گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ [illegible] جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔

"[illegible] نے کہا تھا نا کہ ....."

"[illegible] گیا ہے؟" وہ رابعہ کی بات کاٹ کر چیخی۔

[illegible] نے جواباً سنجیدہ نگاہ اس کے سرخ ہوتے [illegible] ڈالی اور دوسری تماشا دیکھنے والوں پر۔

"عورت کے پاس اس کی سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہوا کرتی ہے، وہ جس حد تک گھٹیا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ..."

اور حوریہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ غم و غصے کی زیادتی نے اسے یہ کیوں بھلا دیا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ کمزور، بے بس اور...

☼ ☼ ☼

"پلیز! یہ بل کلیئر کر لیں۔" اس نے اپنے دھیان میں مطلوبہ اشیاء جو اس نے یہاں سے خریدی تھیں، کاؤنٹر پر ڈھیر کر کے جیسے ہی سر اونچا کیا، اس کا دل جیسے پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا اور بے تحاشا دھڑکتا چلا گیا۔ وہی تھا جو پہلی ملاقات میں ہی اس کا چین سکون چھین کر لے گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اسے یہاں ایک سیلز مین کی حیثیت سے مل جائے گا۔

"آپ... آپ یہاں ہوتے ہیں، بہت اچھا لگا آپ کو یہاں دیکھ کر۔" اس نے خوشی سے چھلکتی آواز میں بہت جذب سے کہا تھا۔ اس نے کچھ چونک کر جذبات کی شدتوں سے گلنار ہوتا چہرہ لیے کھڑی اسوہ کو کچھ تحیر سے دیکھا۔ اس نگاہ کی اجنبیت اور تحیر اسوہ کے جوش و خروش اور خوشی پہ اوس ڈال گئی۔ وہ ایک پل کو بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔

"یہ آپ کا بل ہے۔ پے منٹ وہاں کر دیں۔" اس نے داہنی جانب کاؤنٹر پر اشارہ کر کے گویا رہنمائی کی۔ اسوہ سنگ کر رہ گئی۔

"اونہہ! ایک معمولی سیلز مین ہو کر یہ نخرہ۔" اس نے ناک چڑھائی اور اشیاء کا شاپر اور بل اٹھا کر پلٹی۔ معاً "کچھ خیال آنے پر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"سنو، صرف اچھی صورت پر اتنی بے نیازی کچھ جچتی نہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی عزت والا کام تو کرتے۔ یہاں تو ذرا سی لغزش پر اونر تمہیں دو منٹ میں بے عزت کر کے رکھ دیتا ہو گا۔" وہ اپنی انا کو طنز کے پردے میں لپیٹ کر نظر انداز ہونے کا بدلہ چکا رہی تھی مگر اس نے دیکھا۔ اس کی اتنی سخت بات کے باوجود بھی

اس کے وجیہہ مردانہ چہرے پر نہ تو کوئی خجالت بکھری ہے' نہ ہی کسی قسم کی کوئی سبکی بلکہ وہ بہت مطمئن انداز میں اگلے کسٹمر کی سمت متوجہ ہوگیا تھا۔ اسوہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکلی۔

☆ ☆ ☆

ہارون کی اضطرابی کیفیت میں بجائے کمی آنے کے اضافہ ہی ہوا تھا۔ اماں سے کل اس کی حتمی بات ہوئی تھی کیونکہ کل ہی ماموں نے ان سے ضویا کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کی بات کی تھی۔ وہ جانے کیوں شادی کی اتنی جلدی مچارہے تھے۔ ہارون کو تو ایسا ہی لگنے لگا تھا جیسے انہیں ضویا کی غلط کمپنی کا علم ہوگیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی بے باکی کا بھی' جب ہی تو وہ اپنی ذمہ داری اس کے سر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہتے تھے اور یہی بات ہارون کو تاؤ دلا رہی تھی اور اسی تاؤ میں جب اس نے اماں سے حتمی انکار کیا تو اماں ایک حد تک اسے سمجھانے کے بعد اب روٹھ کر اپنی سہیلی کے ہاں چلی گئی تھیں۔ دو دن ہوگئے تھے انہیں گئے اور اس ذہنی الجھن نے اسے بخار میں مبتلا کردیا تھا۔ بھوک کی وجہ سے چڑچڑاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ نقاہت سی طاری ہوچکی تھی' جب ہی وہ بستر پر لیٹتے ہی غافل سا ہوگیا۔

اسے یونہی بے سدھ پڑے جانے کتنی دیر گزر چکی تھی' جب ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ضویا بہت محتاط سے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس بھی تھے' اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ ذرا سا آگے بڑھی اور اس پر جھک کر کاندھے کو پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا۔

"ہارون۔۔۔!" وہ خاموش رہی۔ "ہارون!" اس نے اب کی مرتبہ اس کی صبیح کشادہ پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ ہارون نے نقاہت زدہ سے انداز میں بوجھل پلکیں اٹھائی تھیں۔ جلتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھوں میں اس وقت کیا تھا' ضویا قطعی نہ سمجھی۔

"کچھ کھالو ہارون! مجھے پتہ ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس کے لہجے میں ملائمت' نرمی اور محبت سب کچھ تھا۔ ہارون نے جواب نہیں دیا۔ اس کا سلگتا ہوا ذہن دھوئیں سے بھرنے لگا۔ یہ وہی لڑکی تو تھی جس سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس نے بہت سے مقامات پر اس کی توہین کے بعد خوشی محسوس کی تھی اور اب اس کی سب سے قیمتی متاع اس کی ماں تک چھین لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے پر اسے ترجیح دے کر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

"ہارون۔ اٹھو نا۔" وہ ایک بار پھر پکار رہی تھی۔ ہارون کی پیشانی پر دیکھتے ہی سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بھی بلا کی وحشت جھلکنے لگی۔ ضویا نے اس کی نگاہوں کی وحشت سے خوف زدہ سا ہوکر پیچھے ہٹ جانا چاہا تھا کہ عین اسی پل ہارون نے بجلی کی سی تیزی سے بازو دبوچتے ہی ایک جھٹکے سمیت اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ ضویا اس اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ اس قدر بدحواس ہوئی کہ حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

"بہت پسند ہوں میں تمہیں؟" اس کے حلق سے غراہٹ نما آواز نکلی تھی۔ ضویا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ہارون کے چہرے اور آنکھوں میں ایسی وحشت اتر آئی تھی' جو کسی بھی انسان کو حیوان بنانے میں ایک پل نہیں لگاتی۔ ضویا بھی اس پل اس کی حیوانیت کی ہی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کالج میں الوداعی پارٹی تھی۔ وہ سب جوش و خروش سے پروگرام بنارہی تھیں۔ حوریہ بھی رابعہ کے ساتھ اس دن پہنے جانے والے لباس کو ڈسکس کرتی اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آرہی تھی' جب اس بھاری بھرکم گونج دار آواز پر اپنی جگہ سے اچھل گئی۔ پلٹ کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی' وہ خود سامنے آیا تھا۔ لبوں پر محظوظ ہوتی اور مخالف کو زچ کرتی ہوئی غراہٹ تو آنکھوں سے ٹپک رہی' جنون خیزی جو سب کو خوفزدہ کردیا کرتی تھی۔ حوریہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اٹھنے کے لیے رابعہ کو اشارہ کیا جیسے ہی آگے بڑھی' ایزی نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔

"تمہاری عزت کی پروا ہے جان من! جب ہی دوستوں کے بغیر آیا ہوں۔ بتاؤ کیا فیصلہ کیا؟" وہ ڈھٹائی سے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتا اپنی آنکھوں سے گویا اس کے وجود کا پوسٹ مارٹم کررہا تھا۔

"کہا۔۔۔ میں لڑکوں سے دوستی کی قائل نہیں ہوں' پتا نہیں آخر میں ہی کیوں نظر آتی ہوں۔" اس کے خوف پر غصہ اور جھنجلاہٹ غلبہ پانے لگی۔

"اوہ آئی سی۔" ایزی نے ہونٹ سکوڑ کر تمسخرانہ نظر اس پر ڈالی پھر بڑی ادا سے اس کی جانب جھک کر بولا۔

"صحیح کہتی ہو۔ حسین لڑکیوں کی تو مجھے واقعی کمی نہیں' البتہ یہ تمہارے مجھ سے پنگا لینے کی سزا ہے۔" سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد اس نے گہرا کش لیا تھا۔ حوریہ کترا کر نکلنے لگی تھی کہ ایزی نے اب کی مرتبہ اس کی کلائی اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑلی تھی اور خفیف سا جھٹکا دے کر اسے اپنے مقابل کھینچ لیا۔ حوریہ کی کلائی پر جیسے الاؤ دہک اٹھے۔ خفت' بے بسی اور شدید اشتعال نے اس کی آنکھوں میں دھند سی بھر دی۔

"تم۔۔۔ میں تھوکتی ہوں تم پر' سمجھے۔" بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے وہ غرائی۔

"سنو احمق لڑکی! تم مجھ سے کبھی بھی اپنا آپ نہیں چھڑا سکتیں۔ یاد رکھنا اس بات کو۔" اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ عادت کے مطابق دھمکی دے کر پلٹ گیا۔ حوریہ کی آنکھوں میں ٹھہری دھند نے پانی کی شکل اختیار کرلی اور ٹپ ٹپ بے بسی کے آنسو بہنے لگے۔ رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری پھر سر جھٹک کر تاسف سے اسے تکنے لگی۔

"سنو' کب تک اسے یہ تماشا کرنے دوگی۔ کسی سے تو اس کی شکایت کرو۔"

"وہ بہت غلط آدمی ہے رابی! میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔" اسے اپنی کمزوری کا احساس دلا رہا تھا۔ رابعہ بس اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

روشن دان سے چھن چھن کر آتی سورج کی تیز شعاعیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں' وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔ ایسا کیا تھا ان لمحوں میں کہ وہ اس حد تک گر گیا۔ احساس گناہ اسے رات سے اب تک جانے کتنی بار اذیت انگیز موت مار چکا تھا۔ انتقام تھا' نفرت یا پھر وحشت کی انتہا کہ وہ حواس گنوا گیا تھا اور اب ایسی ندامت تھی' ایسی پشیمانی تھی کہ وہ اندر ہی اندر کٹ رہا تھا' تب ہی کمرے کے باہر خدیجہ بیگم کے قدموں کی مخصوص آہٹ ابھری اور اگلے ہی لمحے وہ اندر چلی آئیں۔

"ہارون!" انہوں نے اسے ساکت اور گم صم پاکر بے اختیار پکارا۔

"ہارون! کیا ہوگیا بچے؟" خدیجہ بیگم اس کی اداسی کو پاکے تڑپ سی گئیں۔

"ہارون!" انہوں نے بڑھ کر اس کا سر سہلایا۔ خطرناک حد تک زرد پڑتی رنگت اور آنکھوں کے نیچے موجود حلقے۔ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر بے قرار سی ہوگئیں۔

"خفا ہو ماں سے۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔ ہارون نے اسی پل انہیں دیکھا تھا۔

"اف۔" ان کا دل کانپ سا گیا۔

"ہارون۔۔۔ میرے بچے۔۔۔! کیوں رہا تو۔ ہاں ماں صدقے۔۔۔ کوئی خفا ہوتا ہے تو ہوتا رہے' مجھے نہیں پروا۔ میں تو تیری پسند کی ہی لڑکی کو اپنی بہو بناؤں گی۔" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بے اختیار ہوئیں تو ہارون نے بے اختیار سختی سے لب بھینچے تھے' اتنی سختی سے کہ لہو کا ذائقہ اس کے منہ میں گھلنے لگا۔ وہ بے اختیار چیخا۔

"مت کچھ کہیں اماں! چپ ہو جائیں۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔"

"کیوں... کیوں نہیں سننا تو نے۔ ارے میں کہہ دوں گی بھائی سے مجھے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

"جب مجھ سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا اماں! تو پھر مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھیں۔ کیوں مجھے اکیلا کر دیا تھا!"

وہ کسی ننھے بچے کی طرح ہی ان کی آغوش میں منہ چھپا کر رویا تھا۔ اس وحشت سے کہ اماں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"ک... کیا... ہوا...؟" کسی انہونی کا احساس انہیں سہانے لگا۔

"سب کچھ ہی تو غلط ہو گیا اماں! کچھ بھی صحیح نہیں رہا۔" وہ یونہی گھٹ گھٹ کر بے ربط دہرا تا رہا۔ خاصی دیر بعد وہ خود ہی سنبھلا تھا اور تکیے میں منہ چھپا کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

"کتنی خوبصورت ہیں یہ۔ ہے نا؟" حوریہ نے بے انتہا دلچسپی اور شوق کے عالم میں سامنے موجود وی آئی پی مہمان کی حیثیت سے براجمان ملک کی مشہور و معروف ناول نگار مسز ایف ایم چوہدری کو دیکھتے ہوئے رابعہ کی رائے لینا چاہی۔

"ہاں، بلاشبہ۔" رابعہ نے پوری شدومد سے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ خود بھی لکھتی تھی اور ایک ماہنامہ میں اس کی تحریریں شائع بھی ہوئی تھیں۔

سالانہ تقریبات میں جہاں اور بہت سے اہتمام ہوتے تھے، وہاں شعری مقابلے کا بھی انعقاد ہوا تھا۔ جج کی حیثیت سے شاعرہ اور افسانہ نگار مسز ایف ایم چوہدری کو بلوایا گیا تھا، جو نہ صرف نوجوان نسل کی بلکہ ہر عمر کے لوگوں کی پسندیدہ ترین ادیبہ تھیں۔ یونیورسٹی کے طالبات کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ رابعہ اور حوریہ بھی بے حد مشتاق تھیں اور اب انہیں روبرو پا کے تو گویا وہ مبہوت رہ گئی تھیں۔ فیروزی ساڑھی جس کے بارڈر پر میٹل کا انتہائی دیدہ زیب کام جھلملا رہا تھا۔ بالوں کا سادہ جوڑا اور فریش خوب صورت چہرہ انہیں اس عمر میں باوقار جاذبِ نظر اور بے انتہا دلکش دکھلا رہا تھا۔

تقریب کے اختتام پر رابعہ اسے زبردستی کھینچ کر ساتھ لے گئی تھی۔

"ہائے میم... ہاؤ آر یو۔"

رابعہ کا اعتماد قابلِ دید تھا۔ مسز چوہدری جو لڑکیوں کو آٹوگراف دے رہی تھیں، ذرا کی ذرا متوجہ ہوئیں اور ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا۔

"آپ کو آٹوگراف لینا ہے؟" لڑکیوں سے نپٹ کر وہ ان کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔

"نو میم... مجھے تو آپ سے اصلاح لینی ہے۔ ایکچوئلی میں رائٹر ہوں، نو آموز رائٹر۔ کیا آپ میری..."

"وائے ناٹ، آپ آئیں۔ مجھے خوشی ہو گی۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اپنا وزیٹنگ کارڈ بیگ سے نکال کر رابعہ کی سمت بڑھایا اور چیئرمین کی طرف بڑھ گئیں۔

"ہائے کتنا یونیک سا ہے؟" حوریہ نے اشتیاق سے کہا۔

"ہوں مگر ان کا بیٹا تو بالکل یونیک نہیں ہے، ہر لحاظ سے الٹ۔ جانے کس پر پڑا ہے۔" رابعہ نے منہ بنایا۔

"تم ان کے بیٹے کو کیسے جانتی ہو؟" حوریہ ابھی تک کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔

"پہلے نہیں جانتی تھی، آج پتا چلا ہے۔ ایزی ان کا بیٹا ہے۔"

"واٹ۔" حوریہ کو گویا کرنٹ لگا تھا۔ کارڈ اس کی انگلیوں کی گرفت سے پھسل کر زمین پر جا گرا۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور بہت دنوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔ خدیجہ بیگم

صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی عینک لگائے سبزی بنانے میں مشغول تھیں۔ اسے دیکھا تو مسکرائیں۔

"یہاں آجاؤ دھوپ میں۔" خدیجہ بیگم نے اس کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔ ہارون کے چہرے پر پھیلی زردی اور اضمحلال کچھ اور گہرا ہو گیا۔ یہ ان کی ان کی محبت اور شفقت سب اس کے لیے ہے۔ "انہیں پتہ چل جائے میں کیا کر چکا ہوں، تب بھی یہ..."

اس نے بے ساختہ جھرجھری لی اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ "انہیں نہ بھی پتہ چلے، تب بھی خدا تو جانتا ہے کہ میں کتنا لتھڑ چکا ہوں گندگی میں۔"

"مائی گڈنیس، یہ کیا کر دیا میں نے۔"

اس نے مٹھی میں پیشانی کے بال جکڑ کر جھٹکا دیا۔

"ہارون! کیا ہوا بیٹے، کیا سر میں بہت درد ہے؟" خدیجہ بیگم سے اس کی یہ حرکت چھپی نہ رہی تھی۔ سو تشویش فطری تھی۔ ہارون کے جبڑے بھینچ گئے۔

"اماں!" وہ کراہا تھا۔

"ہاں، اماں کے چاند! مجھے بتاؤ ایسا کیا ہوا میرے بچے کہ تجھے تو چپ ہی لگ گئی۔ نہ ڈیوٹی پہ جاتے ہوئے، وہ تو خیر ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گا مگر یوں گم صم کیوں ہو گئے ہو؟" انہوں نے دہائی دینے کے انداز میں کہنا شروع کیا جبکہ ہارون ایک بار پھر پل صراط پر آ گیا تھا۔

"مجھے اس لڑکی کا پتہ دو، میں رشتہ ڈال آتی ہوں۔" تو انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

ہارون کا دل اداسی میں ڈوب گیا۔ "اماں! اس لڑکی کی شادی ہو گئی ہے اب وہ مجھے نہیں مل سکتی۔"

"اُف... ایک جھوٹ کو چھپانے کو کتنے جھوٹ بولوں گا میں۔" اس کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ اماں اداس سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں، پھر گہرا سانس کھینچا۔

"تو تو اس لیے تو اداس ہو رہا ہے۔" وہ معصوم سادہ عورت اس نتیجے پر پہنچیں۔ ہارون نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔

"اماں!" وہ خاصی دیر بعد بولا۔ "آپ ضویا کے لیے ماموں کو ہاں کہہ دیں اور تاریخ کوئی نزدیکی کی رکھیے گا۔" وہ اٹھا اور قدم گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ خدیجہ بیگم حیران سی اس کے الجھے رویے کو سوچنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ونڈ اسکرین پر شفاف بوندوں کا رقص جاری تھا۔ وہ بہت مگن انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتے زیرِ لب گنگنا رہی تھی، جب کوئی شخص اس کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا۔ اگر وہ بروقت بریک نہ لگا دیتی تو جانے کیا ہو جاتا۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلی اور لپک کر اس شخص کے پاس آئی جو خود بھی اسی کی طرح اس دھچکے سے بمشکل سنبھلا۔ ابھی اسی تشکر و ممنونیت کی کیفیت سے باہر نہیں نکلا تھا۔

"آہم... مے آئی ہیلپ یو؟" تیزی سے برستی بارش کی بوچھاڑ میں بھیگتا وہ پچاس سے پچپن سالہ انتہائی گریس فل اور شاندار قسم کی شخصیت کا مالک ایسا شخص تھا، جسے دیکھ کر بندہ خوامخواہ مرعوب ہو جائے۔ اس آواز پر وہ چونکا تھا اور کچھ تحیر آمیز حیرانی سے اسے دیکھا۔

"نو تھینکس۔" اور قدم بڑھا دیے۔

اسوہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

"آئی ایم سوری سر! غلطی میری ہی تھی، لیکن میں..."

وہ بھاگ کر اس کے مقابل آئی تھی اور ساتھ چلتے ہوئے وضاحتی انداز میں بولی۔

"اِٹس آل رائٹ۔ ڈونٹ مائنڈ..." وہ ذرا سا مسکرایا۔

نہ جانے کیوں اسوہ کو اس سے کچھ عجیب سی اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

"سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ آئی مین، بارش ہو رہی ہے اور آپ پیدل۔ پتہ نہیں کتنی دور گھر ہے آپ کا۔"

اسوہ نے کھسیا کر کہا۔

"لگتا ہے آپ کچھ زیادہ ہی حساس ہیں بیٹا! آئی ایم آل رائٹ اور میں چل سکتا ہوں۔ بارش کیا کہتی ہے' یہ تو خدا کی رحمت ہے۔" اس نے مسکرا کر اس کی خجالت کم کرنا چاہی۔

"مگر مجھے خوشی ہوگی آپ کی مدد کرکے' پلیز!" وہ اب رک گئی تھی اور بہت مؤدب ہو کر کہہ رہی تھی۔ اس شخص نے چند ثانیے کچھ سوچا پھر کاندھے اچکا کر گویا ہامی بھرلی۔ راستے بھر وہ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتا رہا تھا اور وہ بہت باادب بچی بنی سنجیدگی سے جواب دیتی رہی۔

"بس یہیں روک دو بیٹی! ہمارا گھر تنگ گلی میں ہے' آپ کو دقت ہوگی۔" اس نے کہا تو اسوہ نے کچھ کہے بغیر گاڑی روک دی۔

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتی ہوں۔" وہ ان کے ساتھ ہی اتری تھی۔ دو منزلہ چھوٹا سا گھر جس کا سال خوردہ رنگ اڑا دروازہ اپنے مکینوں کی بدحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ شخص اس کے اخلاق سے اچھا خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔

"اوکے سر! اب میں چلتی ہوں۔" دستک وہ دے چکا تھا' جب اسوہ نے ان سے اجازت چاہی۔

"ارے۔" وہ بری طرح چونکا اور کسی قدر خفگی سے اسے دیکھا۔

"اندر آؤ' چائے تو پیو بیٹا!"

اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتی' دروازہ کھل گیا اور دہلیز کے پار جو صورت تھی' اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس پر منکشف کیا کہ وہ کیوں کشاں کشاں وہاں تک چلی آئی ہے۔ جسم و جان میں خوشگوار' پرحدت سی سنسنی کا احساس پھیلتا چلا گیا۔

"اتنی دیر بابا! میں کب سے پریشان ہو رہا تھا۔ آپ نے سیل بھی آف کر رکھا تھا۔"

اس نے جیسے دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ جیسے ان لمحوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھی۔

"وم تو لو بابا کی جان! بتاتے ہیں۔ پہلے ان سے ملو' دس از اسوہ خان! یہی مجھے یہاں تک ڈراپ کرنے آئی ہیں۔"

وہ شخص مسکراتے ہوئے ہوئے بولا تھا' تب ہی وہ اس کی سمت متوجہ ہوا اور اگلے ہی لمحے اس کی پیشانی پر بل سے پڑ گئے تھے۔

"تم۔؟" اس نے دانت بھینچے تھے۔

"مم۔ میں۔۔۔۔ وہ۔۔۔"

"جی' جانتا ہوں میں آپ کو۔ سڑکیں تو گویا آپ کی جاگیریں ہیں اور ہم جیسے لوگ آپ کی نظروں میں کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر ہیں۔" وہ بولا نہیں غرایا تھا۔ آن کی آن میں اس کا چہرا غصے کی زیادتی سے دہک کر انگارہ ہوا تھا تو لہجہ شدید قسم کی حقارت و نفرت سے بوجھل۔ اسوہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس عزت افزائی پر دکھی ہو یا پھر اس کی پہلی مرتبہ بغیر تعارف کے پہچان لینے پر خوشی' جبکہ وہ شخص ارے ارے' ہائیں کرتا تو کنارہ گیا اور اسوہ سر جھکائے سرخ چہرا لیے کھڑی رہ گئی۔

"اگر میرے بابا کو ذرا سا بھی نقصان پہنچتا تو میں اسی وقت تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں جان سے مار ڈالتا۔" وہ اسی پرجلال لہجے اور کٹیلے انداز میں بولتا کچھ خیال آنے پر یکلخت پلٹا۔

"اور ہاں بابا! آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟" وہ باقاعدہ انہیں چھو کر دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولا تھا کہ وہ شخص جو اس کی اسوہ کے ساتھ اس درجہ بدسلوکی پر بے حد خفا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ بمشکل مسکراہٹ ضبط کرپایا۔

"بندہ خدا! تمہارے سامنے صحیح سالم اپنے پیروں پر کھڑا ہوں اور مجھے بتاؤ یہ بھلا کیا بدتمیزی ہے؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں' جبکہ اسوہ آنکھیں جھپک جھپک کر تیزی سے امڈتے آنسو اندر اتارنے کی کوشش میں ہلکان تھی۔

"بابا۔! یہ۔۔۔ آپ اسے نہیں جانتے۔ اسی کی وجہ سے میرا ایکسیڈنٹ بھی ہوا تھا۔" اس نے بھرپور شکایتی انداز میں کہہ کر گویا ان کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

"وہ تو میں تمہاری برہمی سے اندازہ کرچکا ہوں' پھر بھی بیٹے بی ہیو یور سیلف۔ اب سوری کرو۔ کتنی بری بات ہے' وہ ہماری مہمان ہے اور تم نے۔۔۔"

"میں چلتی ہوں۔" وہ جو بہت مشکلوں سے ضبط کیے ہوئے تھی' بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ آنسو روکتے روکتے بھی بہہ نکلے تھے اور اسے اتنی خفت ہو رہی تھی کہ حد نہیں۔

"ارے ارے۔۔۔ ایسا کرو بیٹا! بس یہ میرا بیٹا بہت جذباتی ہے میرے لیے۔ ابھی دیکھنا کان پکڑ کر تم سے معافی مانگے گا۔ چلو ذرا معاذ! پہلے ہم باپ بیٹی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"

انہوں نے جز بز سے ہوتے معاذ کو کام سے لگایا اور اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرمی و ملائمت سے کہا۔

"اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں بیٹا!"

"اٹس اوکے۔" وہ یہی کہہ سکی اور ایک بار پھر قدم واپسی کو موڑے مگر وہ شخص جہاں خوب صورت شخصیت رکھتا تھا' وہیں بات منوانے کے گر بھی جانتا تھا۔ اس نے اتنی نرمی' اتنی محبت اور اصرار سے روکا کہ وہ انکار کر ہی نہ پائی پھر دل بھی آڑے آرہا تھا۔ وہ سر جھکائے ملول سی بیٹھی تھی' جب وہ چائے لے کر آگیا مگر اس نے دل کی مچلتی خواہش سے نظریں چرا لیں اور نظریں نہیں اٹھائیں۔

"معاذ! ہماری بیٹی سے سوری کرو۔" وہ شخص بہت شائستہ اطوار رکھتا تھا۔

"سوری۔" وہ تڑخ کر بولا۔

اسوہ نے پلکیں اٹھائیں' وہ ماتھے پر ہزار شکن لیے مارے باندھے بیٹھا تھا۔ اس کا دل اتنا بوجھل ہوا کہ وہ یکدم سے اٹھ گئی' پھر ان کے روکنے کے باوجود بھی وہ رکی نہیں تھی۔

"جاؤ معاذ بیٹے! اسوہ کو اس کی گاڑی تک چھوڑ آؤ۔"

وہ طوعا" و کرہا" اٹھا اور اس کے ساتھ چلتا بیرونی دروازے تک آگیا۔

"رہنے دیں' میں چلی جاؤں گی۔" اسوہ کو اس کی یہ ناگواری بہت تکلیف دے رہی تھی۔ اپنے جذبوں کی ناقدری پر دل خون ہوا جا رہا تھا۔

"اپنے بابا کی ہر بات میں عبادت سمجھ کر پوری کرتا ہوں۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

بارش اب رک چکی تھی۔ ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ فضا میں بے انتہا ٹھنڈک تھی۔ اس من چاہی رفاقت کا ایک ایک پل خوشگواری اور کیف لیے تھا۔

"تھینکس۔" وہ گاڑی تک پہنچی تو دروازہ کھولتے ہوئے اسے مڑتے دیکھ کر بولی۔

"میں بہت اچھی چائے نہیں بنا تا کہ اس کے لیے تھینکس کہا جائے۔"

"ہاں' چائے تو واقعی بالکل اچھی نہیں تھی۔ اب پوچھو تھینکس کس بات کا تو وہ اس لیے کہ تم نے پہلی بار بغیر انٹروڈکشن کے مجھے پہچان لیا۔" وہ ہنس دی۔ معاذ گنگ کھڑا تھا۔ معا" وہ پلٹا اور تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اسوہ نے تب تک اسے دیکھا جب تک وہ نظر آیا تھا پھر اس نے گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

دیر تو اسی کے انکار کے باعث تھی۔ وہ مانا تو سارے کام منٹوں میں نپٹا لیے گئے۔ ممانی اور ماموں تک غالبا" اماں نے اس کے انکار اور ضد کی بھنک بھی نہ لگنے دی تھی' ورنہ ماموں تو شاید بھانجے کی محبت میں خاموش ہی رہتے مگر ممانی ضرور اسے انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ جاتیں۔ وہ تو اب بھی خفا خفا سی ہی تھیں۔ ہارون کا روشن مستقبل اور اونچی پوسٹ بھی ان کے دل سے اس کی نفرت کو نکال سکی تھی' نہ ہی اسے اس نئے رشتے سمیت قبول کروا سکی تھی۔ البتہ ماموں بہت خوش تھے۔ وہ یونہی تو اس پر اتنا وقت اور پیسہ برباد نہیں کرتے رہے تھے۔ یہ بات ذہن میں رکھ کر ہی انہوں نے اسے منزل پر پہنچایا تھا۔

"تمہیں تو خوشی سے بھنگڑا ڈالنا چاہیے تھا۔ آخر من چاہی مراد پائی ہے۔"

ممانی جان نے دلہن بنی سپاٹ چہرا لیے بیٹھی ضویا کو دیکھ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہی تھی۔ ضویا نے ایک خاموش نظر ان پر ڈالی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ اس طرح گم صم ویران اور بجھی ہوئی تو وہ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے تھی۔ وہ ماں ہو کر بھی اس تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی تھیں تو پھر اس نے لب بھینچ کر آنکھوں کی نمی کو باہر آنے سے روکا۔ نکاح ہوا' ایجاب و قبول کے مراحل طے ہوئے۔ وہ اپنے وجود کو کسی گلیشیر میں ڈھلتے محسوس کر رہی تھی۔ وہ محبت' وہ چاہت' وہ خوشی جانے کہاں کھو گئی تھی' وہ نہیں جانتی تھی۔ رخصتی ہوئی اور وہ اس گھر کے ان مکینوں میں آ گئی جن سے کبھی وہ بالکل لاتعلق رہی تھی اور نفرت رکھتی تھی ان سے' اور پھر دل کے موسموں میں تغیر آیا اور یہی مکین اسے خود سے بھی عزیز ہو گئے اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک بار پھر واپس عمر کے اسی حصے میں آ گئی ہے' جب اسے ان مکینوں سے نفرت' بغض اور کینہ محسوس ہوا کرتا تھا۔ ہارون کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات نصف سے زیادہ بیت چلی تھی اور آخر نومبر کی یہ قدرے خنک رات تھی۔ چاند کا سفر کب سے جاری تھا۔ جاڑے کا چاند کہر میں لپٹا کسی قدر تھکا ماندہ اور ملول نظر آ رہا تھا مگر ہارون اسرار کے اضمحلال اور تھکان سے زیادہ ہرگز نہیں' خود سے بھی غافل کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی سحر طراز بولتی آنکھیں کسی قبرستان کی مانند ویران خاموش اور سربستہ راز کی طرح تھیں۔ خود سے لاتعلقی کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں کے درمیان دبا سگریٹ سلگ سلگ کر لبوں کے کنارے کو جھلسانے لگا۔ تپش کا احساس پا کر ہی وہ قدرے چونکا اور سگریٹ لبوں سے نکال کر پھینکتے ہوئے جوتے سے مسل دیا اور ہاتھ میں پکڑے' اس مخملیں کیس کو دیکھا جو کچھ دیر قبل ہی اماں اسے دے گئی تھیں۔

"اب جاؤ اپنے کمرے میں' بچی کو کیوں انتظار میں بٹھایا ہوا ہے۔"

انہوں نے جاتے جاتے تاکید کی تھی اور وہ گہرا سانس کھینچ کر سوچنے لگا تھا۔ کیا واقعی وہ اب بھی اس کی منتظر ہو گی اور دل تمسخرانہ ہنسی ہنسنے لگا تھا۔ اپنے کمرے کی جانب جاتے اس کے قدم من من بھر کے ہونے لگے۔ جی چاہا' یہیں سے پلٹ کر ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں ضویا ہو نہ اس سے وابستہ احساس گناہ مگر اب دل کی ماننے کا وقت گزر چکا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ جس پل اندر داخل ہوا' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نہ انداز میں کوئی سرمستی' نہ نگاہ میں بے قراری۔ اس کا ہر انداز بہت بجھا ہوا تھا' وہ یونہی چلتا ہوا آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

ضویا دلہناپے کے تمام لوازمات سے عاری بالکل سادہ لباس میں دھلے دھلائے چہرے سمیت بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کھلے ہوئے بالوں نے پوری پشت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ صبح کی یاسیت اور بے کلی کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔

"یہ اماں نے دیا تھا۔" ہارون نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر کیس اس کے پہلو میں رکھنا چاہا' جب وہ رکھائی سے کہتی اسے ٹوک گئی تھی۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہارون نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک خجالت سے بھرپور نگاہ اس کے تنے ہوئے نقوش پر ڈالتے ہوئے کیس اس کی گود میں رکھنا چاہا تھا' جب وہ بدک کر اچھل کر دور ہوئی تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می' انڈر اسٹینڈ۔" اہانت آمیز لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔ ہارون کا سرخ و سفید چہرا آن کی آن میں متغیر ہوا تھا۔ بے بسی کا اظہار اس کے ہر نقش سے چھلکا تھا۔ کچھ دیر وہ لب بھینچے خود پر ضبط کرتا رہا' اس کے باوجود جب کچھ دیر بعد بولا تو آواز میں لرزش کے ساتھ نمی بھی واضح محسوس ہوئی تھی۔

"مجرم ہوں تمہارا' جو غلطی ہوئی ہے اس کی تلافی تو ممکن نہیں مگر ضویا! میں تمہیں خوش رکھوں گا۔ بس

بھول جاؤ اس بات کو اور مجھے معاف....."

"معاف کروں تمہیں اور بھول جاؤں' یہ اتنا آسان نہیں ہے مسٹر!" وہ چھیدتی ہوئی نظروں سے گھورتی حلق کے بل غرائی تو ہارون اس کی آواز کے والیوم سے گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"آہستہ' پلیز اماں نے سن لیا تو....؟"

"ہاں تم تو چھپاؤ گے ہی اپنے اس گناہ کو مگر یاد رکھو' تمہیں سکون سے نہیں رہنے دوں گی۔ جو زخم تم نے مجھے دیا ہے' وہ کبھی بھرنے والا نہیں مگر میں تم سے ساری عمر اس کا خراج وصول کروں گی۔ یاد رکھنا۔" وہ انگلی اٹھا کر پھنکاری۔ ہارون ٹھٹک سا گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا روپ دیکھنے لگا۔

"ضویا! پلیز۔ دیکھو' میں شرمندہ ہوں۔ اس شب کے بعد سے آئینے میں نگاہ ملا کر خود کو نہیں دیکھ سکا۔ مجھے....."

"آئی ہیٹ یو۔ تم سسک سسک کر بھی مرجاؤ میرے سامنے تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی سنا تم نے۔"

وہ ہسٹریک ہو کر چلائی۔ ہارون اس کا یہ تحقیر آمیز انداز دیکھتا رہا' جبکہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حوریہ نے لب بھینچ کر خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے تھے اور جھکا سر کچھ مزید جھکا کے آگے بڑھنا چاہا تو ایزی جو سیڑھیوں پر ٹانگیں پسارے بہت ریلیکس انداز میں بیٹھا نظروں کو اس پر فوکس کیے ہوئے تھا۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے مقابل آتے ہوئے راستہ روک لیا۔

"سنو! تم اس قدر مغرور اور بدتمیز خودسر کیوں ہو؟" اس کی پیشانی پر موجود سلوٹوں کو محظوظ مسکراہٹ سے تکتے ہوئے وہ بہت دوستانہ سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"یہ خودسری' بدتمیزی اور نخوت تم جیسے ایڈیٹ اور اوباش لڑکوں کو ان کے مقام پر رکھنے کے لیے ہے۔"

اس کا ضبط چھلکا اور وہ پھٹ پڑی تھی۔

"یہ رکھ لو' نیا ماڈل ہے۔ رات کو بات کیا کروں گا تم سے۔" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے سلور کرے چمچماتا ہوا موبائل فون اس کی سمت بڑھایا۔ حوریہ اس درجہ ڈھٹائی پر آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے وہ سیل فون اس سے تقریباً" جھپٹا اور طیش کے عالم میں اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ "میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور اس موبائل فون پر بھی۔ چھوڑ دو میری جان! ورنہ میں اب تمہاری ماں سے تمہیں سیدھا کرواؤں گی۔"

ماں کا نام سن کر ایزی آتش فشاں بن گیا۔ "سنو' یہ خیر سگالی کی آخری کوشش تھی جو تم نے ٹھکرائی ہے۔ اب ذرا سنبھل کر رہنا' اس لیے کہ ایزی معاف کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہے۔"

بھاگنے کے انداز میں وہاں سے آگے بڑھی تھی' جب ایزی نے للکار کر بہت سرد لہجے میں وارننگ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فل یونیفارم میں وہ پولیس اسٹیشن جانے کو بالکل تیار تھا۔ بائیک کی چابی اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے اس کے انداز سے تھکن اور چہرے سے اضطراب چھلک رہا تھا۔ ضویا نے ایک نظر اسے دیکھا اور منہ پھیر لیا' وہ آج بھی اتنا ہی امپریسو اور گریس فل تھا' بس اس کے دل نے دھڑکنوں کے انداز بدل لیے تھے۔ نگاہوں میں وہ رنگ نہیں رہے تھے۔

"ضویا! آج شام میں تیار رہنا۔ اماں کہہ رہی تھی تمہیں کہیں گھمانے کو لے جاؤں۔"

بہت محتاط سے لہجے میں کسی قدر جھجک تھی' انجانا سا خوف۔ ضویا نے تلخی سے اسے دیکھا اور تڑخ کر بولی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"مگر اماں....."

"تم ان سے بھی یہی کہہ دینا۔" وہ گستاخانہ انداز میں چیخی تو ہارون خاموش سا ہو گیا۔

"میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پریشان ہوں گی' وجہ پوچھیں گی۔" وہ جیسے لاچار سا ہو رہا تھا۔

"تو وجہ بتا دینا۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا اور سر تک کمبل تان لیا۔ ہارون لب بھینچے کھڑا رہا پھر تھکے ہوئے انداز میں باہر نکل گیا۔ اسے ضوبا کی کسی بات پہ غصہ نہیں آتا تھا۔ اسے غصہ آ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے اس رویے میں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ وہ بے خوف ہو گئی تھی اس لیے کہ سارا خوف اس نے اپنے اندر بھر لیا تھا۔ وہ اسے طعنے دیتی تھی۔ بلند آواز سے چیخ کر وہی بات کرتی تھی' جسے وہ سرگوشی میں بھی سننا نہیں چاہتا تھا اور پھر اس کے چہرے پہ بکھری اذیت کو دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنستی تھی۔

"ڈرتے ہو' اپنی ماں سے' اپنا گناہ چھپانا چاہتے ہو' حالانکہ ڈرنا تو تمہیں رب سے چاہیے تھا۔"

اور تب اس نے بے تحاشا سرخ رت جگوں کی مظہر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اللہ سے ہی تو ڈرتا ہوں' تب ہی احساس ندامت اور گناہ کا احساس مجھے پل پل کچوکے لگا رہا ہے۔ ضوبا!"

اس کے لہجے سے اتنی یاسیت' اتنی بے چارگی اور تھکن چھلکی تھی کہ ایک پل کو ضوبا کا پتھر دل بھی موم ہونے لگا تھا۔

"میں تمہارے سامنے صفائی دینا نہیں چاہتا کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ ایک لمحے کی لغزش تھی۔ ایک ایسی بھول جو عمر بھر کے روگ کی صورت میرے گلے کا طوق بن چکی ہے۔ میری سانس' میرے سینے میں اسی روز سے اٹکی ہے۔ میری روح میں اضمحلال در آیا ہے' ضوبا! یہ گناہ کا احساس ہے جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے ضوبا! اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو میں یونہی گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گا۔"

وہ دھیمے لہجے میں کہتا مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ ضوبا نے ایک نظر اس کی شکستگی اور درماندگی کو دیکھا اور عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔

"تم اسی طرح جلتے رہو۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی تھی۔

ہارون نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم محبت کرتی تھیں مجھ سے' ایسی بھیانک سزا مت دو مجھے۔"

"میں تمہیں معاف کرنا تو دور کی بات ہارون! میں تمہیں یہ بھولنے بھی نہیں دوں گی۔"

ہارون نے اس کی سفاکی کو محسوس کیا تھا اور یکایک اس کی مضطرب بے چین بھیگی آنکھوں میں وحشت سی در آئی تھی۔ اس نے جاتی ہوئی ضوبا کا بازو دبوچا تھا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب پھیر کر منہ پہ ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں بھولنے دو گی تم مجھے' کیوں معاف نہیں کرو گی' جبکہ تم اس گناہ میں میرے ساتھ شریک تھیں' اس کا انداز وحشت بھرا تھا۔ ضوبا کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا آپ چھڑانا چاہا' مگر وہ تو جیسے اس پل حواسوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کا چہرا اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑ کر بھینچتا ہوا سرد غراہٹ زدہ لہجے میں چیخنے لگا تھا۔

"کیا اس رات تم جان بوجھ کر میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں اور اس سے پہلے متعدد بار رات کی تنہائی میں ایک اکیلے جوان مرد کے پاس' رشتے میں تمہارا محرم تھا کیا مرد اور عورت کی تنہائی میں شیطان ان کے درمیان آ جاتا ہے' پھر وہی ہوتا ہے جو اس رات ہوا' پھر' پھر یہ واویلا کیوں؟ بولو میں اگر احساس جرم میں مبتلا ہو کر تم سے معافی مانگتا ہوں تو تم کس بنا پہ اکڑ رہی ہو؟"

وہ ہذیانی انداز میں چلاتا' اس کے منہ پہ تھپڑوں کی برسات کر رہا تھا۔

"میں تو اس رات حواسوں میں نہیں تھا۔ تم تو نارمل تھیں' روک سکتی تھیں مجھے۔ کیوں نہیں روکا' بولو' بولو' جواب دو۔" اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور ضوبا اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو سنبھالنے لگی تھی مگر تب اس کی بے ترتیب سانسیں جیسے تھمنے لگی تھیں' جب اس نے دہلیز پہ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے کھڑی خدیجہ

بیگم کو تیورا کر گرتے دیکھا۔ بے اختیار ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے پر دستک دی پھر اجازت ملنے پہ اندر داخل ہو گئی۔

"السلام علیکم مام!" اس نے اسٹڈی ٹیبل پہ جھکی مام کو سلام کیا۔

"ہوں وسلام کیسے آنا ہوا؟" اس نے سر اٹھائے بغیر اسی محویت کے عالم میں پوچھا۔

"وہ مام! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" ہاتھ مسلتے ہوئے وہ خود میں ان کی متوقع ناراضی کو سہنے کا حوصلہ پیدا کرنے لگی۔

"ہوں بولو۔" وہ اب قلم رکھ کر اس کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"مام چترکار والے ڈانس کلاسز کا آغاز کر رہے ہیں۔ مجھے ڈانس سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ مام پلیز۔"

"کالج میں تمہاری پوزیشن مزید ڈی گریڈ ہوئی ہے اور تمہیں ڈانس سیکھنے کی سوجھ رہی ہے' شیم فار یو۔"

"صرف پچاس ہزار روپے کی تو بات ہے مام!" اس نے ضد کی۔

"اوکے فائن سیکھ لو یہ ڈانس بھی' مگر اسٹڈی کا حرج نہیں ہو۔ یہ فور تھ ایئر ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری شادی کر دوں گی۔"

مام نے چیک کاٹ کر اسے تھماتے ہوئے اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کیا۔

یہ اس سے اگلی شام کی بات تھی' جب وہ چترکار اکیڈمی میں اسی سلسلے میں آئی تھی' تب پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کر کے مین گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اسے اچانک ہی راستے میں مل گیا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا' پھر ایک نظر چترکار کے بورڈ پہ ڈال کر کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ اسوہ جو اسے بالکل غیر متوقع طور پہ سامنے پا کر خوشگوار سی حیرت میں تھی اس کا یہ انداز نوٹ نہ کر سکی۔

"میں یہاں ڈانس کلاسز لینے آئی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اوہ آئی سی۔" معاذ نے لب بھینچ کر سرد نظروں سے اسے دیکھا' پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ چند لمحوں کے لیے وہاں بیٹھ کے میری بات سن سکتی ہیں۔"

اس نے انگشت شہادت سے سامنے ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کیا تو اسوہ حیرت کی زیادتی سے مرنے والی ہو گئی۔

"سر کے بل جناب' مگر سوچ لیں اسکنڈل نہ بن جائے آپ کا۔" پھر حیرت پہ قابو پا کر وہ شریر سے انداز میں بولی تو معاذ نے بہت سرد نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر قدم بڑھا دیے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک آ گئی تھی۔

"چائے نہیں پلوائیں گے؟" بالوں میں جکڑا کیچر نکال کر پھر سے لگاتے ہوئے اس نے بڑی سرشاری سے کہا۔

"اگر میں کہوں' آپ یہ ڈانس کلاسز نہیں لیں گی تو؟"

"تو نہیں لوں گی۔" اس کی ادھوری بات کو اس نے بہت سرعت سے مکمل کر دیا۔ اسے یہ سوچ ہی آسمان کی بلندیوں پہ اڑا رہی تھی کہ وہ ماؤنٹ ایورسٹ جیسا شخص اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"تو ٹھیک ہے مت لو' اوکے۔ میں چلتا ہوں۔" اس کا چہرہ بے تاثر اور سنجیدہ تھا۔

اسوہ کا دل بجھ کر رہ گیا۔ "ارے رے! یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کو مجھے کم از کم یہ تو بتانا چاہیے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا ہے؟" وہ ذرا سا جھنجلائی۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"آپ کے اطمینان کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ یہ ایک اچھی نصیحت تھی' جو میں نے آپ کو کی۔ یہ میرے بابا نے مجھے کی تھی۔"

"آپ بھی ڈانس کلاسز لے رہے تھے؟" اس نے

معصومیت کا تاثر دیتے چوٹ کی۔ معاذ نے اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو سنجیدگی سے دیکھا اور جواب دیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سنیں معاذ!" وہ بھاگ کر اس کے پیچھے آئی اور راستہ روک لیا۔

"آپ ہر بات مانتے ہیں اپنے بابا کی؟" عجیب سا سوال تھا۔ معاذ نے سمجھے بغیر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اگر آپ کے بابا کہیں اس لڑکی یعنی مجھ سے شادی کرلو تو کرلوگے؟" اس نے نچلے لب کا کونہ دانتوں تلے دبایا، معاذ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میرے بابا میرے مزاج سے آگاہ ہیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے مجھے ہرگز شادی کرنے کا نہیں کہیں گے جو مجھے پسند نہ ہو۔"

وہ اپنی بات کہہ کے رکا نہیں تھا، جبکہ اسوہ کو لگا تھا۔ ریسٹورنٹ کی عمارت اس کے وجود کو اپنے ملبے تلے دبا چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ بیگم اس حقیقت کی سفاکی کو سہہ نہیں پائی تھیں۔ انہیں دل کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ وہ اسپتال جاتے راستے میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری قیامت ہارون اسرار کے سر پہ ٹوٹی تھی۔ ایک کے بعد وہ دوسرے گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے اس نے ضبط اور حواس کھوئے تھے، تب بھی ناقابلِ تلافی نقصان حصے میں آیا تھا اور دوسری مرتبہ بھی وہ آپے سے باہر ہوا تھا تو جیسے طوفان سب کچھ ساتھ بہا کے لے گیا تھا۔ اضطراب اور وحشت کی کوئی حد نہیں تھی۔

سگریٹ پھونک کر، آنسو بہا کر اور مسلسل ٹہل کر وہ تھک گیا تو وضو کر کے کلامِ پاک پڑھنے لگا۔ تہجد پڑھی اور سجدے میں گر کر ضبط کو پارہ پارہ ہوتے دیکھنے لگا۔

"یا رب العالمین رحم فرما! مجھے معاف فرما دے۔ میرے مالک! مجھے معاف فرما دے میرے رب تو گواہ ہے تو جانتا ہے میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ اس گناہ کا تو تصور بھی میرے آس پاس نہیں تھا۔"

آہیں، سسکیاں اور گریہ وزاری ضوبا کی آنکھ کھلی تھی۔ اسی نے ذرا سا اونچا ہو کر جائے نماز پہ سجدہ ریز وجود کو دیکھا اور کمبل ہٹا کر بیڈ سے اتر آئی۔ اس ایک واقعے کے ایسے گہرے اثرات اور یہ پشیمانی ضمیر کے زندہ ہونے کی علامت تھی۔

وہ بھی تو شریکِ گناہ تھی۔ پھر ایسی ندامت، ایسی بے قراری اسے کیوں نہیں تھی۔ اس نے اس پہ غور ہی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک خوفِ خدا دل میں نہ جاگے، تب تک کوئی احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ابھی بے احساس تھی۔

وہ بے حد آواز قدموں سے چلتی اس کے نزدیک آئی اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہارون کا سسکیوں سے لرزتا وجود یکلخت ساکن ہوا تھا، اگلے ہی لمحے اس نے سر اٹھایا تھا۔ ان کشادہ حسین آنکھوں میں پھیلا ہراس ان کی خوبصورتی کو بڑھا کر گیا تھا۔

"کیوں رو رہے ہو؟" کچھ دیر اس کی سرخ بھیگی آنکھوں اور آنسوؤں سے تر متورم چہرے کو یونہی تکتے رہنے کے بعد اس نے نخوت زدہ انداز میں استفسار کیا تھا۔

"تم جانتی ہو۔"

ہارون کا گلا رندھ گیا اور اسے جانے کیا ہوا، منہ پہ ہاتھ رکھے وہ قل قل کر کے ہنستی چلی گئی۔ ہارون کی نگاہ سے پہلے استعجاب چھلکا، پھر بتدریج شرمندگی اور دکھ۔ وہ سر جھکا کر دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو تکنے لگا، جو دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

"کیا سمجھتے ہو تم اس طرح رونے، گڑگڑانے سے رب تمہیں معاف کر دے گا؟" ہنسی پہ قابو پا کر وہ طنز سے بھرپور کاٹ دار لہجے میں بولی۔ تب ہارون نے غم ناک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"نہیں ہارون اسرار! رب بھی اس وقت تک گناہ معاف نہیں کرتا جب تک وہ بندہ نہ کر دے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ تمہیں تو اسلام اور مذہب کی بہت معلومات ہیں، کیا تم یہ بات بھول گئے؟"

ہارون کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور تاریک سائے چہرے پہ لرزنے لگے۔

☼ ☼ ☼

سخت متوحش سی گریز ناں دل لیے اسے لمحہ بہ لمحہ جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی دھمکی پہ عمل کر ڈالا تھا۔ اس کے لیے حوریہ کو اغوا کرنا کسی چڑیا کو پکڑنے سے بھی زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔

یونیورسٹی سے واپسی پہ اس نے رابعہ کی موجودگی میں بہت دھڑلے سے قدرے سنسان روڈ پہ اسے کسی بکری کی طرح اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا اور اب وہ یہاں تھا اپنی من مانی کو تیار۔

بیئر کا ٹن کھول کر دو تین بڑے گھونٹ لینے کے بعد وہ کچھ مزید اس کے نزدیک آیا تھا اور ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے گرد لپٹا چادر نما دوپٹہ ایک ہی جھٹکے میں اتار کر کمرے کے دوسرے کونے میں پھینک دیا تھا اور وہ بغیر دوپٹے کے اس کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپتی بے اختیار زور زور سے رونے لگی۔

"کیوں روتی ہو جانِ من! تمہیں ہماری قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔" وہ اس کے نزدیک آ کر اس کے بالوں کی چوٹی کے بل کھولنے لگا۔

اس نے غم و غصے کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا اور یہیں گویا ایزی کے غضب کو آواز دی تھی۔ اس نے ٹن دور اچھالا اور اگلے ہی لمحے تڑپتی مچلتی حوریہ کو بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ بھرپور مزاحمت کرتی اس کی گستاخانہ جسارتوں پہ تڑپ کر مچلتی ہوئی جھکی اور اس کے بازو میں دانت گاڑھ دیے، ایزی کی گرفت ایک پل کے لیے ڈھیلی ہوئی، حوریہ اس پل سے فائدہ اٹھا کر اس کا حلقہ توڑنے میں کامیاب ہوئی تھی اور بھاگ کر اس سے کئی فٹ دور چلی گئی۔ "یا اللہ میری مدد فرما!" تیزی سے ڈوبتے دل سمیت اس نے زور، زور سے روتے ہوئے دعا مانگی تھی۔ اور اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

دروازہ اچانک بہت زور سے بجا تھا۔ بہت جارحانہ انداز میں۔ حوریہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑی تو ایزی کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

"کون ہے؟" وہ چیخا تھا۔

"میں ہوں تمہاری مام، دروازہ کھولو۔" باہر سے چیخ کر کہا گیا تھا۔ اسے جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"ایزی! میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔" اب کے آواز میں سرد غراہٹ در آئی تھی۔

حوریہ نے آنسو بھری نظروں سے ایزی کے پتھر بنے وجود کو دیکھا اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر مسز ایف ایم چوہدری ہی تھیں، وہ یقیناً بہت عجلت میں آئی تھیں۔ جب ہی ان کا لباس شکن آلود اور بال کھلے ہوئے تھے، وہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مسز چوہدری نے بہت خاموش اور سرد نظروں سے اسے دیکھا اور پھر آہستگی سے اسے خود سے الگ کرتیں آگے بڑھ کر ایزی کے سامنے آن رکی تھیں۔

"واٹ از دس؟" انہوں نے اس کے قدموں میں پڑے خالی ٹن کو ٹھوکر ماری اور چیخ کر ایزی کو مخاطب کیا، جس کا سر جھک کر کاندھوں پہ گر گیا۔

"اور یہ کیا ہے؟" انہوں نے پلٹ کر تھر تھر کانپتی آنسو بہاتی حوریہ کی سمت اشارہ کیا۔ "تم تو کہتے تھے لوگ تمہارے بارے میں بکواس کرتے ہیں۔ الزام تراشی کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اب بھی مکر جاؤ۔"

انہوں نے ایک زناٹے کا طمانچہ ایزی کے چہرے پہ دے مارا تھا، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور پھر تو جیسے وہ پاگل سی ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے منٹوں میں اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ چپ چاپ پٹ بھی رہا تھا، حوریہ آنکھیں پھاڑے یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ کیسا احساس رگ جاں میں اترا تھا، آگاہی کا، وہ سوچتے سوچتے حواس کھونے لگتا، جہاں اور زیاں ہوا تھا وہاں یہ بھی کہ اسے اس عہدے کے لیے نااہل قرار دے کر برطرف کر دیا تھا۔

ضویا کی ڈلیوری نزدیک تھی' ممانی اسے لینے آئی تھیں' وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ ان ہی دنوں سوہا کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی اور عثمان کے سعودیہ جاکر کام کرنے کی بھی' مگر وہ ہر معاملے سے لاتعلق تھا۔ ماموں اس سے خفا تھے تو ممانی نفرت میں کچھ اور بڑھ چکی تھیں۔ انہیں اپنی بات ثابت کرنے کا موقع ہاتھ آیا تھا' اور وہ خوب کھل کر کررہی تھیں۔

ضویا کی ڈلیوری کے بعد سوہا کی شادی طے پائی' عثمان نے البتہ انتظار فضول جانا تھا' سو وہ سعودیہ فلائی کرگیا۔ دو ماہ بعد ضویا نے ایک صحت مند اور خوبصورت بچے کو جنم دیا تھا۔ ماموں نے ہی ملامتی انداز میں اسے اطلاع پہنچائی تھی۔

"اب کچھ کام بھی ڈھونڈ ہی لو۔ بیوی' بچے کو بھیک مانگ کر کھلاؤ گے؟" انہوں نے طنزاً کہا تھا۔

تب وہ اپنا ہر احساس جھٹک کر بہت شوق سے بچے کو دیکھنے گیا تھا' جو کاٹ میں لیٹا چلا چلا کر رو رہا تھا' جبکہ ضویا بے نیازی سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سیب کی قاشیں مزے لے لے کر کھا رہی تھی۔

ہارون نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور خود بڑھ کر ہاتھ پیر مار کر روتے ہوئے اس ننھے فرشتے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا' مگر وہ معصوم جان تو ماں کی نرم آغوش کی متلاشی تھی' اس کا لمس پاکر کچھ اور بھی شدتوں سے رونے لگا۔

"ضویا! اسے بھوک لگی ہے۔ پلیز اسے فیڈ کرواؤ۔" اس کی بے نیازی اور لاتعلقی کے باوجود وہ بچے کو اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ بہت لجاجت سے بولا تھا۔

"تو اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تمہیں نظر نہیں آرہا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ پھنکار کر بولی۔

ہارون کس قدر جھنجلایا مگر یہ

"لینے گئی تو ہیں ماما! اس کا فیڈر آجائیں گی' کیوں اتاؤلے ہوجاتے ہو ہر کام میں۔" ماتھے پہ تیوریاں لیے وہ رکھائی سے بولی۔

"کیا مطلب' اب ممانی جان فیڈر سے اسے دودھ پلائیں گی؟" اس کے ہٹیلے انداز ہارون کو تاؤ دلانے لگے۔

"تو اور کیا میں کرواؤں گی۔ سنو مسٹر ہارون! اگر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو تو اس کو دل سے ابھی نکال دو۔ مجھ سے اس کے لیے کسی قسم کی نرمی کی توقع مت رکھنا' اس لیے کہ یہ تمہاری اولاد ہے اور مجھے تم سے گھن آتی ہے۔"

بچے کی سمت اشارہ کرتی وہ اس قدر بے لچک لہجے میں غرا کر بولی تھی کہ اس کا یہ بیگانہ انداز ہارون کو انگشت بدنداں کرگیا۔

"یعنی تم؟" صدمے کی زیادتی سے وہ بات بھی پوری نہیں کرسکا۔

"بالکل صحیح سمجھے ہو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی اور اس کے غصے کی زیادتی سے بے انتہا سرخ آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑھ کر مزید گویا ہوئی۔

"سو بہتر یہی ہے کہ تم اس کے لیے گورنس کا انتظام کرلو' میری ماں خواہ مخواہ کی ملازمہ نہیں ہے کہ تمہارے ہوتے سوتے کی آیا گیری کرتی پھرے۔"

ہارون نے جواب نہیں دیا' وہ جواب دینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے بتاؤ میری تربیت یا محبت میں کہاں کمی رہی تھی' جو تم اس حد تک پستیوں میں جاگرے اور مجھے پتا تک نہیں چل سکا۔" وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا' کپڑے تبدیل ہوچکے تھے' حلیہ سنورا ہوا تھا' مگر وہ اسی لباس میں تھیں' چہرے پہ تاریک سائے لرزاں تھے۔

"تمہیں وہ لڑکی پسند تھی۔ تم مجھ سے کہتے میں کسی چیز کو ترجیح نہ دیتی' ماسوائے تمہاری پسند کے۔ ایزی! تم نے بہت ہرٹ کیا۔ مجھے" وہ آگے بڑھی تھیں اور بھرائے ہوئے گلے سے بولیں۔ وہ ہنوز خاموش تھا' البتہ چہرے پہ کسی پشیمانی یا تاسف و گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا اور یہی چیز انہیں ہولا رہی تھی۔

"کیا یہ پہلی لڑکی تھی' جس میں تم اسی گھٹیا انداز میں انوالو ہوئے' یا اس سے پہلے بھی کسی کی عزت کا ... نکال چکے ہو؟"

اچانک خیال آنے پہ انہوں نے کچھ سہم کر استفسار کیا تھا' ایزی نے ایک نظر ان کے ہراساں چہرے کو دیکھا اور پھر سے سر نیہوڑا کر کھڑا ہوگیا۔

"بتاؤں ایزی! بولو' پلیز ٹیل می اور واٹ آئی ول کل ..."

اب کی مرتبہ انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر ہیجان زدہ انداز میں جھنجوڑا تھا۔ ایزی ان کی کیفیت کو دیکھ کر خائف ہوا تھا۔

"یہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ اس سے پہلے کسی لڑکی نے مجھے تگنی کا ناچ نہیں نچایا تھا۔ میں اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔" وہ نروٹھے پن سے بول پڑا اور ان کے جیسے سر پہ لگی تلووں میں بجھی تھی۔

"تم یہ کیوں بھول گئے کہ تمہارے گھر میں ماں اور بہن بھی ہے۔ کل انہیں ان کی عزت کی حفاظت کی پاداش میں کوئی ایسا ہی سبق سکھانے لگے تو؟" انہوں نے ہسٹریک ہوتے ہوئے اسے کتنے ہی گھونسے رسید کردیے تھے۔ ایزی نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور جھٹک کر ہنکارا بھرا۔

"کم آن مام کام ڈاؤن' یہ سب اس لڑکی کی بدتمیزی کی وجہ سے ہوا۔"

اس درجہ ڈھٹائی اور بدلحاظی نے انہیں شدید مشتعل کردیا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی بہت جلد اسی لڑکی سے ہوگی۔" انہوں نے بہت قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"واٹ؟" ایزی کو تو جیسے بچھو نے ڈنگ مارا تھا۔ "میں ہرگز بھی اس لڑکی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس سے شادی ہی رچانے بیٹھ جاؤں۔" اس کا بدلحاظ لہجہ گستاخی لیے تھا۔

وہ اسی سکون سے گویا ہوئی تھیں۔ "حالانکہ تم جیسا آوارہ اور عیاش بندہ ہرگز ہرگز اس کے قابل نہیں ہے' مگر کیا' کیا جائے کہ اتنے گھنٹے تمہاری حراست میں رہ کر' وہ اپنے پیرنٹس کی نگاہوں میں بھی مشکوک ہوگئی ہے' اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ تمہارے ہی نام کی چادر اوڑھا کر معاشرے میں ایک مقام دیا جائے۔"

"نام!" اس نے پیر پٹخے تھے۔ "میں گھر سے بھاگ جاؤں گا' اگر آپ نے زبردستی کی۔" اس نے اپنا آزمودہ حربہ اپنایا۔

"بھاگ جاؤ' مگر یاد رکھنا میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کردوں گی۔ ایک دھیلا نہیں ملے گا تمہیں' اور تم کیا کرسکتے ہو' یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

انہوں نے کھرے طنز سے کہا اور باہر نکل گئیں' ایزی کی جھنجلاہٹ پہ غصہ غالب آگیا' اس نے میز کو لات رسید کی تھی اور تنتناتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک حبس زدہ شام تھی' آسمان پہ کہیں کہیں بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ہوا کے دوش پہ اڑا پھر رہا تھا' دور کہیں سے مینا کی آواز اداس فضا میں مزید اداسی گھول رہی تھی' اس کی گود میں سویا بچہ کسمسا کر رویا' تب وہ چونکا تھا اور ویران آنگن سے ساکت نگاہ ہٹا کر بلکتے ہوئے بچے کو دیکھا۔ معاً اسے اس کی بھوک کا خیال آیا تھا' بچے کو کاندھے سے لگا کر وہ کچن کی سمت بھاگا' جہاں وہ دودھ چولہے پہ ابلنے کے لیے چھوڑ کر بھول گیا تھا۔ دودھ کیتلی کے کناروں سے نکل نکل کر برنر پہ گرنے کے بعد اب سوکھ کر جل چکا تھا۔ بالائی کی پھولی ہوئی تہہ کیتلی کے کناروں پہ اب بھی جمی تھی اور ماحول میں جلنے کی بو پھیل چکی تھی' وہ کچھ لمحوں کو شدید قسم کے رنج میں مبتلا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

بچے کے ایک بار پھر رونے سے وہ اسی کیفیت سے نکلا تھا اور آگے بڑھ کر پہلے چولہا بند کیا' پھر صافی سے کیتلی پکڑ کر اتاری' کچھ سرخ گاڑھا دودھ سطح پہ موجود تھا' اس نے سنک کی ٹونٹی کھول کر کچھ پانی اس میں ٹپکایا

اور فیڈر میں ڈال کر اچھی طرح ہلانے کے بعد فیڈر بچے کے منہ سے لگا دیا۔ بچہ رو رو کر نڈھال تھا یا پھر بھوک سے کہ بے صبری سے دودھ پیتے ہی سو گیا۔

ہارون نے جھک کر اس کے معصوم چہرے پہ بکھرے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے چنا تھا اور یاسیت آمیز گہری سانس کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سات سے آٹھ ماہ کا بچہ نیند میں ہچکیاں بھرتا اس کا کلیجہ شق کرنے لگا۔

عثمان نے سعودیہ جانے کے بعد وافر روپیہ بھجوانا شروع کر دیا تھا۔ سوہا کی شادی ہو گئی' وہ بیاہ کر یوگنڈا چلی گئی۔ چھ ماہ بعد ماموں' ممانی بھی عمرے کے لیے فلائی کر گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی تھی' اپنی من مانی کے لیے اور اس کا فیصلہ اتنا سفاکانہ اور سنگدلانہ تھا کہ ہارون کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ ”کچھ تو گنجائش رکھو ضوبا! میرے لیے نہیں تو اس معصوم بچے کے لیے' یہ اولاد ہے تمہاری۔ غور تو کرو' اس کا کیا قصور۔“

”مجھے سبق مت پڑھاؤ' جب کہہ دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم دونوں کے لیے تو بار بار دستِ سوال دراز کر کے خود کو ذلیل نہ کرو۔“

وہ اتنی نفرت سے بولی تھی کہ اس روز ہی شام کو وہ اپنا مختصر سامان سمیٹ کر بچے کے ہمراہ وہ گھر چھوڑ آیا تھا' جسے ضوبا نے یہ کہہ کر اسے جانے کو کہا تھا کہ اس گھر پہ اس کا کوئی حق نہیں ہے اور چونکہ وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں' سو وہ وہاں سے کہیں اور ٹھکانہ کر لے۔

وہ اتنا ہرٹ تھا' اس قدر ڈسٹرب اور مایوس تھا کہ ممکن تھا خودکشی کر لیتا' مگر اللہ کو اسے ابھی زندہ رکھنا تھا' جب ہی اسے زندہ رہنے کے لیے سہارا فراہم کر دیا تھا' ایسے مشکل وقت میں سائرہ اس کے کام آئی تھی۔ اس کی داستانِ غم نے اسے اتنا ملول کیا تھا کہ آنکھوں میں نمی آٹھہری تھی۔

اور ہارون جس نے کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی اس درجہ ہمدردی و توجہ پہ بکھرتے بکھرتے بھی سنبھل گیا۔ اب یہاں اس گھر میں تنہائی اور آزمائش میں گھرا وہ جینے کے نئے ڈھنگ سیکھ رہا تھا۔ اس لیے بھی کہ اسے اس ننھی جان کی خاطر اپنا خیال رکھنا تھا' جسے ماں کی بے اعتنائی سہنا پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

باہر ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ بارش کا شور تھا۔ کتنی مدھر آواز تھی بارش کی' وہ اٹھی اور اپنے ہینڈ بیگ سے خاکی لفافہ نکال کر باہر آ گئی۔

”مام میں آجاؤں۔“ اس نے دروازے پر دستک دے کر اجازت چاہی۔

”یس“ اندر سے تھکی ہوئی آواز ابھری تھی' اسوہ نے دروازہ پش کیا اور اندر قدم رکھ دیا انہیں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے نہ پا کر نظر گھمائی۔ وہ بیڈ پہ دراز تھیں' کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا وہ اندازہ نہیں کر پائی کہ یوں بے وقت کیوں لیٹی ہیں۔

”آر یو آل رائٹ مام؟“ اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے تشویش سے کہا۔

”آپ ایزی اسٹوپڈ کی وجہ سے ڈس ہارٹ کیوں ہوتی ہیں۔ مام! اس کی تو عادت ہے۔“ معاً ان کے چہرے پہ بکھری زردی کو دیکھتے ہوئے وہ لب بھینچ گئی۔

”یہ لے لیں مام!“

”واٹ از دس۔“ ان کی نگاہوں سے استعجاب چھلکا۔

”وہ پیسے جو میں نے آپ سے لیے تھے۔“ اس نے لفافہ ان کی سمت بڑھا دیا۔

”کیوں ڈانس نہیں سیکھنا؟“

اسوہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کوئی خاص وجہ؟“ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پہ پھیلتی شرمیلی مسکان میں الجھیں۔

”وہ نہیں چاہتا ہے۔“ وہ سر جھکا کر اب کھل کر مسکرائی۔

”وہ۔۔۔ وہ کون؟“ ان کی حیرانی دیدنی تھی۔

”وہی جسے بھلانے کے لیے میں خود کو اس رقص

میں گم کر دینا چاہتی تھی۔“ وہ ہاتھ کی انگلی کا ناخن چبا کر ہنسی۔

”وہ پسند نہیں کرتا اور تم نے اپنی خواہش چھوڑ دی۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ جانچا۔

”جی مام! اس کے لیے تو میں سب کچھ ...“ معاً وہ رک کر چپ ہو لی۔

”کیا بہت اچھا ہے؟“ وہ سوال پہ سوال کرنے لگیں۔ اسوہ بوکھلا سی گئی۔

”جی مام! بہت' بے حد' خود سے ہر کسی سے بڑھ کر' اتنا کہ مام کہ وہ سب ہی چاہے جانے کے قابل۔“ اس نے آنکھیں میچ کر بہت جذب سے کہا پھر بے اختیار سی ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کے لجاجت سے بولی۔

”مام پلیز! آپ اس سے ملیں تو سہی۔ وہ آپ کو پسند آئے گا۔ میں ایزی کی طرح غلط راستہ نہیں اپنانا چاہتی۔“

”ہوں۔“ وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ”تم اس سے کہو نا۔ وہ آ کر مجھ سے ملے۔ بیٹی کی ماں پہل کرتی اچھی نہیں لگوں گی۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اسوہ کے چہرے پہ سایہ سا لہرا گیا۔

”مام! وہ نہیں آئے گا' اس لیے کہ جو کچھ آپ کی بیٹی اس کے لیے محسوس کرتی ہے۔ وہ ایسا کچھ محسوس نہیں کرتا۔ مجھے ہی ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔“

اس کا گلا رندھ سا گیا۔ ان کا دل تو جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
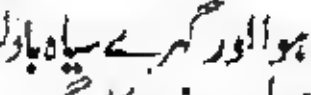
موسم اپنے اندر بے حد خوبصورتی سموئے ہوئے تھا۔ ہلکے ہلکے چلتی ہوا اور گہرے سیاہ بادلوں نے پورے ماحول کو شام سے پہلے ہی شام کا رنگ دے دیا تھا۔ ہلکی ہلکی پڑتی پھوار اور قریبی مسجد سے آتی نعت کی آواز سب کچھ ہی بہت اچھا تھا' مگر وہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اپنے ہی خیالوں میں دور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ماہ ہو گیا' اس پہ یہ سانحہ بیتے اور ایک ماہ سے ہی زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ عزت بچا کر بھی گویا ہر نگاہ میں معتوب ہو گئی تھی۔ کتنا بے مایا کر دیا تھا۔ ایزی کی اس انتقامی کارروائی نے' اسے اپنوں کی نظر میں وہ تو بس ششدر سی بدلتے ہوئے رویوں کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا برسے تھے بابا اس پہ' اور ان کی بدگمانی' اف وہ یاد کر کے ہی لرز جاتی۔

”صحیح کہتے ہیں لوگ' اولاد پہ اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور بیٹیوں کے معاملے میں تو یہ اعتماد ہمیشہ ڈبوتا ہی ہے۔ برا کیا تھا میں نے کہ برادری کی مخالفت مول لے کر اس کو پڑھنے بھیج دیا' ارے رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے نا' کچھ نہ کچھ تو اس نے بھی حوصلہ افزائی کی ہو گی' تب ہی معاملہ اتنا خراب ہوا۔“

حوریہ کا تو دم نکل گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی خود پر اعتماد کھو چکی تھی' اس درجہ الزام تراشی اور غلط بیانی پہ اسے لگا تھا جیسے وہ تیورا کر ایسا کرے گی کہ پھر اٹھ نہ سکے گی' مگر ایسا ہی تو نہیں ہوا تھا' کتنی سخت جان تھی وہ۔

”پوچھو اس سے کہ کون تھا وہ؟ اس کے اگلے پچھلوں کو بلائے اور اپنی صورت لے کر دفعان ہو۔“

وہ چنگھاڑے تھے اور نیم جان ہوتی حوریہ کے قریب ہی جیسے بم پھٹا تھا۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”بتایا تو ہے اس نے وہ ایک بدقماش لڑکا تھا۔“

”چپ زبان کھینچ لوں گا تمہاری' اگر تم نے بے جا حمایت کی تو۔“ قہر بھرے انداز میں وہ امی کو جان سے مار دینے کے ارادے سے آگے بڑھے۔

”یہ اس حد تک گر جائے گی' باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر اس لونڈے کے ساتھ گلچھرے اڑائے گی' ارے مجھے ذرا سا بھی گمان ہوتا تو اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹتا۔“

تب ڈری سہمی لرزتی کانپتی حوریہ میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔

"دفع دور۔ اس سے کہو یہاں سے چلی جائے۔ میں اس کی صورت۔"

"یہی پوچھنے آئی ہوں بابا! کیوں صورت نہیں دیکھنا چاہتے' جبکہ میں بالکل بے قصور ہوں۔"

ایک طمانچہ پڑا اس کی زبان گنگ ہو گئی' اس کے ہونٹوں سے سرخ سرخ خون نکل کر پھیل رہا تھا۔

"اسے لے جاؤ یہاں سے اور جہنم میں جھونک دو جتنی جلدی ہو سکے۔ اس کا رشتہ تلاش کرو' چاہے اپاہج ہی ہو یا پھر سڑکوں پہ بھیک مانگتا فقیر' مگر اسے یہاں سے دفعان کر دو' ورنہ یہ میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائے گی۔"

وہ کف اڑاتے پھنکارتے گھر سے نکل گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم؟ میم! میں رابعہ ہوں' وہی جس نے آپ کو حوریہ کے کڈنیپ ہونے کی اطلاع دی تھی۔"

"ہاں بیٹا بولو۔" وہ جو بہت مگن انداز میں اپنے ناول کی آخری قسط کا کلائمکس لکھ رہی تھیں۔

"میم آئی ایم سوری! کہ آپ نے اپنا کردار اس انداز میں نہیں نبھایا' جیسے کہ نبھانا چاہیے تھا۔" لہجہ ترش اور تلخ تھا۔

"بیٹا! وہ حوریہ نے تو اس روز بھی مجھے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیا تھا' وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی' حالانکہ میں چاہتی تھی کہ اس کی پوزیشن کلیئر کر دوں' مگر...؟"

وضاحت دیتے بھی وہ خجل سی رہیں۔

"خیر جو ہوا اسے جانے دیں' ایک ریکوسٹ کروں آپ سے۔" دوسری جانب رابعہ نے بھی فوراً مفاہمت اختیار کی تھی۔

"ہاں بیٹا! کہو۔" "میم! آپ اپنے بیٹے کی غلطی کا ازالہ کریں۔ حوریہ سے اس کی شادی کروا دیں' میم پلیز۔ وہ اس وقت سخت آزمائش میں ہے' چونکہ وہ اس آزمائش میں اس کی وجہ سے دوچار ہوئی ہے۔"

"ہاں ہاں' بالکل کیوں نہیں۔" وہ چونکیں اور گڑبڑائیں۔

"تھینکس میم! میں منتظر رہوں گی۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے بے دلی سے فون رکھ دیا' تبھی دروازہ تھپتھپا کر ایزی اندر آیا۔

"مجھے دس ہزار کی ارجنٹ ضرورت ہے۔ ماما پلیز دے دیں۔" بلیک چست جینز پہ بلیک شرٹ پہنے وہ رف سے حلیے میں تھا۔

"کیوں اب کون سا گل کھلانا ہے؟" ان کی تیوری چڑھی۔

"میری یہی غلطی تھی' جو تم اس حد تک بے لحاظ ہو گئے ہو۔" انہوں نے پیپرز سمیٹ کر رکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"اسوہ کو تو آپ نے پچاس ہزار بھی ایک منٹ میں نکال کر دے دیے تھے' بغیر کسی حیل و حجت کے۔ ڈانس سیکھنا کب سے اچھا کام ہو گیا۔"

وہ ناگواری سے جتا کر بولا۔ انہوں نے دراز لاک کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ایزی! میں اس لڑکی کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر رہی ہوں۔ شادی بھی جلدی ہو گی۔ اب تم یہ فضولیات چھوڑ دو۔ اب بھی اگر تم میری بات سے انکار کرو گے تو یاد رکھنا میں اس مرتبہ خود تمہیں گھر سے نکالوں گی۔"

ان کی آنکھوں سے برہمی چھلک رہی تھی۔ ایزی نے سختی سے لب بھینچ کر انہیں دیکھا۔

"آپ میری کمزوری سے آگاہ ہیں ماما! اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ اوکے فائن۔ کر لیں اپنی مرضی ابھی تو مجھے رقم دے دیں' شادی کے وقت نہیں بھاگوں گا مام! میری دکھتی رگ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

بات کاٹ کر تلخی سے کہتا وہ ان کے بڑھائے دس ہزار کے چیک کو اچک کر چلتا بنا۔ وہ کچھ پریشان سی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

خوش ہونے کے بجائے عجیب سی یاسیت اور رنج

[illegible] تھا۔ حوریہ کے باپ کے جاہلانہ رویے پہ [illegible] افسوس ہوا تھا' نہ کوئی رسم ادا کرنے دی [illegible] بس شادی کی تاریخ طے کر دی' انہیں [illegible] نصیبی پہ بہت رونا آ رہا تھا۔ ایزی سے [illegible] کے نزدیک تو بدنصیبی ہی تھی' مگر وہ اس [illegible] کیا سکتی تھیں۔

"معاذ کے گھر چلیں۔" اسوہ جو ان کے ساتھ [illegible] راستے میں ہی گاڑی روک کر اچانک بولی۔

"ہاں چلو دیکھتے ہیں' وہاں سے کیا ملتا ہے۔" وہ [illegible] مسکرائیں۔

"وہ اتنے جاہل اور دقیانوسی سوچ کے مالک نہیں [illegible] بلکہ معاذ کے بابا اتنی ڈیشنگ اور امپریسو [illegible] رکھتے ہیں کہ میں تو انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔"

"اچھا! تم تو معاذ سے زیادہ اس کے بابا سے متاثر لگتی [illegible]" وہ دل سے مسکرائیں۔

"[illegible] خیر' مجھے تو جس سے متاثر ہونا تھا ہو گئی۔ ان [illegible] جیسی خواتین ہی متاثر ہو سکتی ہیں۔"

[illegible] نے خفیف سی شرارت کی تھی' مگر ان کے [illegible] مسکراہٹ لمحے کے ہزارویں حصے میں [illegible] دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔

گاڑی مطلوبہ مکان کے سامنے رکی اور وہ ان کی [illegible] کسی حد تک خفا نظروں کو خاطر میں لائے بغیر [illegible] سے اتر کر اطلاعی گھنٹی بجانے لگی' وہ بھی خاصی [illegible] اس کے ہمراہ دروازے تک آ گئی تھیں۔

[illegible] اور جیسے ہر سو روشنی سی بکھر گئی۔ معاذ سفید [illegible] شلوار سوٹ میں نکھرا نکھرا سامنے تھا۔

"[illegible] سلام علیکم! انکل ہیں۔ دس از مائی مام' ان سے [illegible] ہیں۔" اسے دروازے میں اٹکے دیکھ کر اسوہ [illegible] نہیں کہتے ہوئے گویا اپنی آمد کی وجہ بیان [illegible] وہ اپنی جگہ خفت کا شکار ہو رہی تھیں۔ جانے [illegible] اس بے انتہا خوبرو سے لڑکے کی آنکھوں [illegible] ایسا کیوں لگا تھا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ کیوں کس [illegible] ملنا چاہتی ہیں۔

[illegible] نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا جو یک ٹک اسے

دیکھ رہی تھیں' پھر آہستگی سے ہٹ کر انہیں راستہ دے دیا۔

"بابا تو نماز پڑھنے گئے ہیں۔ بس آتے ہوں گے۔ آپ بیٹھیے۔"

وہ انہیں ہمراہ لیے چھوٹے سے انتہائی سادگی سے سجے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

"میں چائے لاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر ان کی نظروں کے حصار میں آیا تو جز بز ہو کر کہتا پلٹ گیا۔

"ستھیائی ہوئی ہیں والدہ بھی بیٹی کی طرح۔" اس نے تپ کر سوچا۔

"بیٹا تمہاری والدہ یا بہن نہیں ہیں گھر میں؟"

"جی نہیں۔ صرف میں اور بابا ہوتے ہیں' وہ بھی جب وہ تبلیغی دوروں پہ ہوتے ہیں تو میں تنہا رہتا ہوں۔" اس نے دروازے سے نکلنے سے قبل آہستگی سے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے دہلیز پار کر لی۔

"بابا! کچھ مہمان آئے ہیں آپ سے ملنے۔" دروازے پہ دستک کے بعد' جب اس نے دروازہ کھولا تو پہلی اطلاع یہی دی۔

"کون؟" وہ سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے بال سہلانے لگے۔

"اسوہ یاد ہے' اسی کی مام ہیں۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر خود کچن کی سمت بڑھ گیا' جبکہ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور سامنے موجود خاتون پہ نگاہ پڑتے ہی وہ پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت ہو گئے۔

اسوہ کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بھی اس پل نظر اٹھائی تھی اور جیسے زمین آسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ یہ کوئی الوژن نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی وہی حقیقت جس کی انہوں نے طویل سجدوں میں رب سے التجا کی تھی۔ یہ ثمر تھا۔ ان کی دعاؤں کا' یہ اعجاز تھا ان کی ریاضتوں کا' وہ اچانک اٹھی تھیں اور لڑکھڑا کر ان کی جانب بڑھی تھیں۔

"ہا... رون..." یہ نام ان کی زبان سے ٹوٹ کر بکھرا تھا اور اگلے ہی پل وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ان کے قدموں سے لپٹ کر بے اختیار ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

”میرا گناہ بہت بڑا تھا‘ تو پھر سزا بھی اسی حساب سے ملی تھی۔ اس گھر سے آپ کو نکال کر میں ایسے پُرسکون ہوئی تھی کہ جیسے تمام اضطراب ڈھل گیا ہو۔ یہ اضطراب نہیں تھا۔ یہ تو میری فطرت کی کمینگی تھی یا پھر میرا انتقام میں سوچتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کیا ہوگیا تھا مجھے کیوں اتنی کٹھور‘ اس قدر سفاک ہوگئی تھی کہ آپ کو ہی نہیں۔ اپنے بیٹے کو بھی اسی نفرت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ آپ صحیح کہتے تھے ہارون کہ اس گناہ میں‘ میں بھی شامل تھی۔ میں نے کیوں اخلاقیات روایات اور سب سے بڑھ کر مذہب کے بتائے راستوں سے روگردانی کی۔ کیوں تنہائی میں آپ سے ملتی رہی‘ پھر تو وہی ہوتا تھا جو ہوا‘ مگر اس کے بعد جو میں نے کیا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا تھا مجھے‘ آپ کو یاد ہے ہارون! جب آپ اس گھر سے جا رہے تھے‘ تب میرا بچہ میرا لخت جگر رو رہا تھا‘ اس کی تڑپ اور پکار تب میرا دل نہ پگھلا سکی تھی‘ مگر پھر‘ پھر قدرت نے مجھے میرے کیے کی سزا دینا شروع کردی‘ اپنے بچے کے رونے کی آواز راتوں کی نیند اڑانے لگی‘ مگر اس سے پہلے بابا میرے اس قدر سفاکانہ فیصلے پہ مجھے لعنت ملامت کرنے کے بعد مجھے چھوڑ کر عثمان کے پاس سعودیہ چلے گئے۔ ماں تھیں جتنی بھی سخت سہی‘ مگر وہ میری طرح دل کی جگہ پہ پتھر نہیں رکھ سکتی تھیں‘ سو وہ میرے پاس ہی رہیں‘ مگر میرا سکون تو کھو چکا تھا۔ کتنا تلاشا آپ کو‘ مگر آپ نہیں ملے۔ میں ہسٹریا کی مریض ہو چکی تھی‘ ڈاکٹرز نے میرے ٹھیک ہونے کی شرط یہی رکھی تھی۔ کہ میرا بچہ مجھے مل جائے‘ تب یہی ایک حل تھا جو مما نے نکالا۔ ہاں انہوں نے یتیم خانے سے دو جڑواں بچے اڈاپٹ کیے۔ ایزی اور اسوہ جنہوں نے میری ماستا کی تڑپ کو مٹایا‘ مگر اس کسک کو دور نہ کر سکے‘ جو اپنے بچے کے لیے دل میں اٹھی تھی۔ پچیس سال کم تو نہیں ہوتے۔ ہارون میں نے پچیس سال تک بھگتان بھگتا ہے۔ کیا آپ مجھے معاف کریں گے؟؟“

آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے تھے‘ وہ چونکے‘ انہیں دیکھا‘ مسکرائے اور بڑھ کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ دہلیز پہ اسی وقت قدم رکھتا معاذ ٹھٹکا تھا۔ چائے کی ٹرے اس کے مضبوط ہاتھوں میں لرزی تھی اور اس کی آنکھیں سکتے کے عالم میں کھلی رہ گئیں۔ معاذ پلٹا تھا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا‘ تب سے اس داستان الم کے سوز میں گم اسوہ سب سے پہلے چونکی اور تڑپ کر اس کے پیچھے لپکی‘ اس کے پیچھے ہی وہ دونوں بھی‘ ضویا کی حالت تو بالکل دیوانوں کی سی تھی۔

”معاذ معاذ بیٹے!“ مگر وہ ہر پکار ان سنی کرتا بیرونی دروازہ پار کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”واٹ نان سینس معاذ! یو آر ناٹ اے کڈ۔“

جس وقت اس نے تھکے ماندے شکستہ اعصاب سمیت گھر کی دہلیز پار کی‘ وہ لے بلب کی زرد روشنی میں آنگن میں ہی ٹہلتے مل گئے۔ اسے دیکھا تو لپک کر قریب آتے ہوئے خفگی بھری سرزنش کی۔ دروازہ بھی یقیناً اس کے انتظار میں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے شاکی نگاہ ان پہ ڈالی اور قدم گھسیٹتے ہوئے برآمدے میں پڑے تخت پہ گر گیا۔

”کیوں خفا ہو بھلا؟“ انہوں نے اس کا بجھا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس نے شاکی نظر ان پہ ڈالی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”میں نے آپ سے کہا تھا۔ وہ اسوہ کی مما ہیں۔“ اس نے منہ پھلا کر روٹھے پن سے کہا‘ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا اور بوجھل لہجے میں بولا۔

”پتا ہے بابا جانی! جب میں چھوٹا سا تھا نا‘ تب میں چاہتا تھا میرے بابا جانی سب سے بہادر ہوں‘ ٹارزن کی طرح۔ سپرمین کی طرح‘ لیکن پھر جب میں بابا کے قد کے برابر آیا تو میرے دل نے ایک اور خواہش ... بے شک تھی‘ جانتے ہیں وہ کیا خواہش ...

... ٹھٹک کر بوجھل پپوٹوں کو اٹھا کر انہیں ... بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ اور سن رہے ...

... خواہش تھی آپ کے مضبوط اور پختہ کردار ... میں نے آپ میں یہ خوبی پائی بھی ہے۔ ... شخصیت ہے آپ کی۔ میں نے اکثر ... کو آپ کی سمت متوجہ ہوتے ٹھٹکتے دیکھا‘ مگر ... بہت محتاط زندگی گزاری۔ اس کے باوجود کہ ... عورت کی رفاقت کے بغیر زندگی گزار رہے تھے‘ ... آج شام بابا جانی تب مجھے اتنا شاک لگا‘ جب ... اسوہ کی مما کے ہاتھ تھامے دیکھا۔“ ... کا بوجھل لہجہ بھینچ سا گیا تھا۔ ان کی مسکراہٹ ...

... اگر میں کہوں کہ وہ اسوہ کی مما نہیں تمہاری ... تمہارے اسٹرانگ بابا جانی نے کسی غیر ... نہیں تمہاری ماں کا ہاتھ ہی پکڑا تھا تو کیا تم ... بھی اپنے بابا جانی کو اس گستاخی پہ معاف ...

... کا انداز ڈرامائی نہیں تھا‘ البتہ شریر ضرور تھا‘ مگر ... حیران سا رہ گیا۔

... آپ مذاق کر رہے ہیں بابا!“ کچھ دیر بعد اس کے ... سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

... اتنا سنگین مذاق کیوں کروں گا۔“ وہ پل کے پل ... کار ہوگئے۔

... آپ نے انہیں معاف کردیا‘ اتنی زیادتی کے ... آواز مدہم ہوگیا۔

... معاف کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے۔ بیٹے! آپ ... آپ کے بابا جانی کی بہت سی لغزشوں اور ... کو معاف کردے۔“ عجز و انکساری ان کے ہر ... سے عیاں تھی۔

... نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”انہیں پتا چل گیا ... کچھ پھر بھی وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ کیا انہیں اس سب پہ پچھتاوا نہیں تھا؟؟“

اس نے عجیب سا سوال کیا‘ وہ چونکے تھے اور کاندھے اچکا دیے۔

”وہ تم سے ملنا چاہتی تھیں۔ بہت بے قرار تھیں‘ مگر تم تو جانے کہاں چلے گئے تھے۔“

”آخر آ ہی جاتا۔ آیا ہوں نا۔ انہیں عادت ہے بابا! ہمارے بغیر رہنے کی۔“ اس کا دل و دماغ تناؤ کا شکار ہونے لگا۔

”معاذ! ایسی منفی سوچ مت اپناؤ۔ بہت غلط بات ہے۔ وہ کل پھر آئیں گی۔“

انہوں نے اسے سمجھایا تھا‘ مگر وہ تنک کر بولا۔ ”مگر میں کل بھی ان سے نہیں ملوں گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ ہارون پریشان سے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

اور اس کی یہ بدگمانی‘ یہ شکایت ضویا نے پہلی بار ہی مل کر کچھ اس طرح سے دور کی تھی کہ وہ ان کی محبتوں کی شدتوں اور آنسوؤں کی برسات کے سامنے ہار سا گیا تھا۔

”تھینک گاڈ فضا کا بوجھل پن تو دور ہوا۔“

جس پل وہ بہت ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا‘ اسوہ چائے کی ٹرالی سمیت اندر آئی تھی اور اسے دیکھ کر لطیف سی چوٹ کی‘ مگر معاذ نے اس کی بات پہ کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک وہ اٹھا اور گھڑی دیکھتے ہوئے جانے کو تیار ہوگیا۔

”بابا جانی! میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔“

”بیٹا کال کرلو‘ بتا دو انہیں۔ ابھی تو جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں‘ کھانا بھی کھاؤ نا ہمارے ساتھ۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی تھیں اور معاذ ایک دم ہی بے حد ملول سا ہوگیا۔ لفظ ”ہمارے“ اس کے دل میں پھانس بن کر چبھا تھا اور یہی چبھن اس نے ہارون کے سامنے ظاہر کی تھی۔

”وہ میری ماں ہے بابا! جبکہ حق ان پہ دوسرے جتاتے ہیں۔“

اس وقت وہ انہیں وہی معصوم سا بچہ محسوس ہوا۔ جو بہت چھوٹی عمر سے ماں کی آغوش کے لیے ترستا رہا تھا اور اپنے سوالوں سے انہیں زچ کر ڈالتا تھا' یہاں تلک کہ انہیں اسے مختصر کر کے اپنی کہانی سنانا پڑی تھی اور وہ اسی آس میں دن کاٹتا بڑا ہو گیا تھا کہ مما کی بابا سے صلح ہو جائے گی اور پھر وہ سب اکٹھے رہیں گے۔

"وہ ان کی بھی ماں ہیں بیٹے! ذہن اور سوچ کو وسیع رکھنا چاہیے۔" وہ ناراضی سے انہیں تکنے لگا۔

"وہ صرف میری مما ہیں بابا! نو کمپرومائز۔ میں بالکل شراکت پسند نہیں کروں گا۔" وہ تنفر سے کہتا اٹھ کر چلا گیا۔ ہارون کچھ سوچ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہلکی بوندا باندی موسلا دھار بارش کا روپ دھار گئی تھی' جب وہ دوڑتا ہوا لان عبور کرتا اندرونی حصے کی جانب آیا۔ ہر سو خاموشی اور سناٹا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا۔

"اماں! اماں کہاں ہیں آپ؟" لاؤنج پورا ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا اور کسی شے سے الجھ کر لڑکھڑا سا گیا۔

"اُفوہ کہاں ہیں سب! اور یہ اندھیرا؟" معاً ساری لائٹیں پل بھر میں آن ہوئیں اور پورا لاؤنج روشنیوں سے بھر گیا۔ سامنے پھولوں سے سجی ٹرالی پر رکھا اس کا من پسند کیک رکھا تھا۔ اور موم بتیاں لگی تھیں۔ یہ سارا ایونٹ معاذ کے لیے بے حد حیران کن تھا۔ ٹرالی سے کچھ فاصلے پہ کھڑی اسوہ مسکراتی ہوئی داد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' اس کے حیرت زدہ چہرے پہ ساری بات سمجھ میں آتے ہی یکایک گمبھیر قسم کی سنجیدگی چھا گئی۔ تب ہی ضوبا ہاتھ میں سرخ اور گلابی پھولوں کا بالکل تازہ سجے لیے اس کی طرف بڑھی تھیں اور والہانہ انداز میں اس کی پیشانی چوم کر اس کے لمبے چوڑے وجود کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کی ناکام سی کوشش کی' اسوہ نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا تھا' ہیپی برتھ ڈے ٹو یو سے پورا لاؤنج گونجنے لگا۔ وہ لب بھینچے کسی قدر خفا نظر آ رہا تھا' اسوہ اور ضوبا کی آنکھوں میں اس پل جو خوشی کے جگنو جگمگ کر رہے تھے ان کی جھلملاہٹ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھے رہی۔

"آؤ نا بیٹا! کیک کاٹو۔" ضوبا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا' تب وہ محض ان کا دل رکھنے کی خاطر آگے بڑھ آیا۔

"کیا بات ہے بیٹا! آپ بہت سیریس ہو۔ تمہارے بابا شریک نہیں ہیں' مگر وہ اس طرح کی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے نا۔ میں تو اس لیے۔۔"

"اچھا تو میں بھی نہیں سمجھتا امی! یہ تو انگریزوں کی رسمیں ہیں جو مجھے وقت اور پیسے کے ضیاع کے ساتھ دین سے دوری کا باعث ہی لگتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"اسوہ! مجھے اس قسم کے تکلفات پسند نہیں۔" اس نے اسوہ کو مخاطب کیا' جو اسے گفٹ پیش کر رہی تھی۔ وہ دھواں ہوتا چہرہ لیے بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

"مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! تمہارے باپ نے تمہاری تربیت بہت اچھے انداز میں کی ہے' میں شاید کبھی تمہیں اتنا مکمل اور اسٹرانگ نہ بنا سکتی۔"

ضوبا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ "مجھے اپنے بابا پہ فخر ہے' انہوں نے بہت جدوجہد کی ہے میرے لیے اپنے لیے۔ آپ کو پتا ہے مجھے منزل پہ پہنچانے کی خاطر انہوں نے اپنا آرام' اپنا سکون اور خوشی سب کچھ مجھ پہ نچھاور کیا' وہ دن کو کام کرتے تھے' تو رات کو جاگ کر مجھے پڑھاتے تھے' وہ کہا کرتے تھے جو میرے پاس نہیں رہا۔ وہ مجھے دلوائیں گے' اماں وہ مجھے پولیس ڈپارٹمنٹ میں دیکھنا چاہتے تھے' مگر میں نے انکار کر دیا' پتا کیوں' اس لیے کہ یہ صرف بدنام شعبہ ہی نہیں ہے' یہاں واقعی بہت دھاندلی ہے' میرے بابا ایک ایمان دار آفیسر تھے' بہت کچھ کھو کر وہ اس پوسٹ تک پہنچے تھے' مگر ایک ذرا سی بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے بابا کو برطرف کر دیا۔"

ضوبا مجرم سی بنی اسے تکنے لگیں' کیا اگر یہ جان لے کہ اس کے بابا کی نوکری ہی نہیں زندگی کی بھی تباہی کی وجہ وہ ہیں' تو وہ انہیں معاف کر دے گا' آنٹی ہی ... سے ملے گا ان سے۔

... سوچے گئی تھیں۔

"... کے چلتا ہوں اور ہاں اپنی بیٹی سے کہیے گا مجھ پہ ... اپنے جذبات ضائع نہ کرے' یہاں دال نہیں ...۔" آخر میں وہ کچھ شرارتی سا ہوا تھا۔ ضوبا نے ... ہوئے اسے دھپ لگا دی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو رہا ہے؟" سارے گھر میں انہیں تلاش کر کے جب کچن میں جھانکا تو انہیں مصروف دیکھ کر وہیں آ گیا۔

"ارے بابا جانی! آپ کوکنگ کر رہے ہیں۔" اسے یک لخت خجالت نے گھیر لیا۔ کام سے واپسی پہ تھکن اتنی تھی کہ وہ بستر پہ ذرا دم لینے کو لیٹا تھا' مگر پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔

"سپینش آملیٹ بنا رہا ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا؟" انہوں نے انڈے توڑ کر باؤل میں ڈالتے ہوئے مصروفیت سے جواب دیا۔

"ہٹیں آپ۔ میں کرتا ہوں۔" اس نے کاندھوں سے تھام کر ہٹانا چاہا۔

"ارے یار! تم تو ایسے کانشس ہو رہے ہو جیسے میں یہ کام پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"جی!" اس نے ٹھنڈی سانس کھینچا اور پھر کسی قدر ... ہوئے لہجے میں بہت دکھ سے گویا ہوا تھا۔

"... ہاں ہمیشہ سب کچھ انوکھا ہی تو ہوتا آیا ہے' جو ... کی امائیں کرتی ہیں' وہ کام ہمارے بابا کو کرنے ...

... ابلے ہوئے آلوؤں کے باریک قتلے کاٹتے ہوئے وہ ... میں چونکا گیا' انہوں نے اس کے چہرے کے شاکی ... تاثرات کو بغور دیکھا۔ "کیا بات ہے معاذ! آج سے پہلے تو ... نے کبھی اس قسم کے شکوے' شکایات نہیں کیے۔"

"آج سے پہلے مجھے ماں کی کمی اس حد تک محسوس بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میں ماں سے واقف ہی نہیں تھا۔"

وہ کیا کہتے خاموشی سے کھڑے رہے۔

"بابا جانی آپ امی کو لے آئیں۔ میری خاطر اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔" وہ بھاری آواز میں کہتا لب کچلنے لگا' کسی معصوم سے ضدی بچے کی طرح۔

"مجھے حوصلہ ہی نہیں ہوا معاذ! میں کیسے کہتا۔ یہ بات تو شاید تمہاری ماں کو خود سوچنا چاہیے تھی' شاید یہ گھر ان کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس سے کمتر تھا اور شاید وہ مجھے اب بھی خود سے کم درجے پہ ہی سمجھتی ہے۔"

معاذ نے چونک کر انہیں دیکھا' وہ جیسے بے خیالی میں کہیں ماضی میں پہنچ گئے تھے' معاذ آہستگی سے پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! امی!" وہ اندر داخل ہوتے ہی انہیں پکارنے لگا تھا۔ ضوبا جو اسوہ کے ساتھ ایزی کی بری میں چڑھانے والے زیورات دیکھ رہی تھیں' اس کی آواز پہ بے ساختہ مسکرائیں۔ وہ بھی وہیں آ گیا۔

"امی چلیں' میرے ساتھ۔" ان کا ہاتھ پکڑ کر اسے قدموں واپس ہوا تو ضوبا بوکھلا سی گئیں۔

"مگر کہاں؟" جبکہ اسوہ بس یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی' ہلکا آسمانی رنگ کتنا جچ رہا ہے اس پہ' اسے اس رنگ کے لباس میں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"جہاں میں لے چلوں۔ چلیں گی؟" وہ اچانک ان کی جانب پلٹ کر آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "غلط جگہ پہ اتنا اچھا ڈائیلاگ بول کر مزا ہی کرکرا کر دیا۔" اسوہ موجود ہو اور آس پاس معاذ بھی پھر بھلا ممکن تھا کہ اس کی شوخی پہ بند بندھے ضوبا مسکرائی تھیں' جبکہ معاذ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے کہا تھا' مجھے بے باک لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔" اس کا

لہجہ کسی حد تک تلخ تھا۔

"میری خوش بختی کے لیے یہی کافی ہے کہ تم مجھ سے کہی باتوں کو یاد رکھے ہوئے ہو۔" اس کی چونچالی عروج پہ تھی۔

معاذ جیسے زچ سا ہو گیا۔

"بالکل چلوں گی بیٹا چلو۔" ضویا نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

"چلیں اور اس گھر سے جو لینا ہے' لے لیں' میں آپ کو ہمیشہ کے لیے لینے آیا ہوں۔"

وہ اتنا بڑا فیصلہ تن تنہا کر کے بھی بہت پُرسکون تھا' ضویا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا لوں گی جہاں جا رہی ہوں۔ وہاں بھی تو میرا سب کچھ ہے۔ تمہارے اور تمہارے بابا سمیت۔"

وہ اتنے اعتماد سے مسکرا کر گویا ہوئی تھیں کہ معاذ جو واقعی انہیں آزمانے' انہیں پرکھنے آیا تھا' ایک پل کو حیران رہ گیا۔

"اب چلیں۔" وہ بہت میٹھی مسکراہٹ سمیت اس کے وجیہہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں چلیں۔" وہ حواسوں میں لوٹا جیسے یکایک آسمانوں کی بلندیوں پہ اڑنے لگا۔

"آخر میری ماں ہیں' بابا تو بس یونہی ڈرتے رہے۔" اس کا سر یکلخت ہی فخر سے بلند ہوا۔

"مگر بام! یہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی' پھر یہ گھر' ایزی کی شادی ...؟"

جب وہ واقعی اس کے ساتھ چل دیں تو اسوہ جو اس اچانک سچویشن پہ غیر یقینی سے ساکت تھی' جیسے ایکدم سے چیخی۔

"سب کچھ ہوگا' ایزی کی شادی بھی اور تمہاری رخصتی بھی خاطر جمع رکھو۔"

انہوں نے اس کے سٹپٹائے ہوئے انداز پہ کہا۔ تب ان کی بات سے اپنی مرضی کا مطلب اخذ کرتے اس کا دل سنبھلا تھا۔

"امی! آپ کو خود یہ خیال کیوں نہیں آیا؟" راستے میں اس نے دل میں مچلتا سوال پوچھا۔ وہ مسکرائیں۔

"میں تمہارے بابا جانی کی جانب سے پیش رفت کی منتظر تھی' لیکن خیر تم تو مجھے ان سے بھی بڑھ کے ہو۔" انہوں نے بہت محبت سے کہا۔ معاذ کھل کر مسکرایا۔

"اب میں بابا جانی سے آپ کی بات بڑھا چڑھا کر پیش کروں گا۔" اس نے آنکھیں نچائیں' اور ان کی آخری بات پہ گرفت کی۔

"یعنی لگائی بجھائی کرو گے۔ پہلے ان سے ڈھنگ سے صلح تو ہونے دو۔"

وہ بے اختیار ہنسی تھیں' ان کی ہنسی میں معاذ کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"یہ تو پاگل ہے ابھی تک بچہ بنا رہتا ہے۔ آپ کو تو سمجھ داری سے کام لینا چاہیے تھا ضویا! اکیلی بچی کو چھوڑ کر چلی آئیں۔"

ہارون اندر کی کیفیات چھپائے بہت فکرمندی سے گویا ہوئے' جبکہ معاذ بہت مزے لے لے کر اسپیگھٹی کھا رہا تھا' جو اس نے ضویا سے فرمائش کر کے دیسی مسالے ڈلوا کر بنوایا تھا۔

"یعنی دوسرے معنوں میں آپ میرے اپنے گھر میں آنے پہ خفا ہو رہے ہیں۔" ان سے معافی تلافی کر لینے کے بعد وہ بہت مطمئن اور سرشار نظر آ رہی تھیں۔ ہارون ذرا سا خفیف ہوئے۔

"یہ بھلا کیوں چاہوں گا میں۔ میں تو اس بچی ...؟"

"اوہ بابا! اس بچی کی اتنی فکر کیوں ہے آپ کو۔ محترمہ تیئس سال کی ہو چکی ہیں۔" معاذ چڑ گیا۔

وہ کچن میں کسی کام سے گئیں اور واپس آئیں تو ہارون کو ایک بار پھر سوچ میں گم دیکھا تو نزدیک آ کر اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پہ رکھ دیا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اسوہ کو یہاں لانے میں کوئی حرج نہیں تھا' مگر میں باضابطہ طریقے سے اسے لانا چاہتی ہوں۔"

ہارون نے چونک کر ان کی مسکراہٹ دیکھی۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اپنے معاذ کی دلہن بنا کر۔ وہ بہت پسند کرتی ہے معاذ کو۔"

ضویا نے بہت تفاخر سے بتایا۔

"اور معاذ ...؟" ہارون ٹھٹکے تھے۔

"اس نے تو کچھ ظاہر نہیں کیا۔ بہرحال میں اس کی رائے لیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔" انہوں نے تسلی دی۔

"تھینکس!" ہارون واقعی مطمئن ہوئے تھے۔

"نو تھینکس' نو سوری۔" کچھ دیر تک یونہی شکوہ بھری نظروں سے تکتے رہنے کے بعد وہ بے تکلفانہ استحقاق سے بولی تھیں' ہارون اسرار بہت عرصے بعد بہت دل سے مسکرائے۔

☼ ☼ ☼

بہت سارے خدشات' واہمے اور خوف لیے حوریہ نے اپنے باپ کی دہلیز چھوڑی اور ایزی کے سنگ اس کے گھر رخصت ہو کر آ گئی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی پہ مہرباں ہونے کے بعد اب شاکی ہو گئی تھی۔ اعتماد' یقین' بھروسا' مان سب کچھ ہی تو بکھر گیا تھا۔ اب کیا بچا تھا ایک ٹوٹا ہوا دل اور سوختہ بدن۔ وہ ایزی پہ یقین کر لیتی' جبکہ اس کے چاہنے والے شفیق باپ نے پل میں اسے خود اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔

مہمانات اس کے بیڈ روم تک پہنچا گئی تھیں۔ ایزی کی طرف اس نے ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دل نے نہیں چاہا' حالانکہ کتنی ہی رسموں کی ادائیگی کے وقت وہ اس کے برابر ہی تو بیٹھا تھا' پتا نہیں وہ واقعی خوش تھا یا خوش نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا' بہت آرٹسٹک انداز میں پھولوں سے آرائش کی گئی تھی' مگر اس کا بوجھل اور مردہ دل کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھا۔

دھیرے دھیرے بیتتی جا رہی تھی۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہوا تب اس نے اندر قدم رکھا۔ شیروانی اتار کر صوفے پر پھینکی' پھر الماری میں کچھ کھٹ پٹ کرتا رہا' اس کے بعد اس کے پاس آ گیا۔ حوریہ کے وہی احساسات جو منجمد تھے' اب یکبارگی خوف اور وحشت کا شکار ہونے لگے۔

"یہ پیپر ہے جو آج میں بالخصوص تمہیں تمہارے اس وجود کو خراج پیش کرنے دوں گا' جانتی ہو کیوں اس لیے کہ تمہیں اپنی اصلیت پتا چل جائے' تم نے ایزی سے ٹکر لی تھی نا۔" وہ اس کا گھونگھٹ نوچ کر زبردستی چہرہ اٹھاتا' اس کی دہشت سے پھٹی آنکھوں میں اپنی سفاک بے رحم نظریں گاڑھ کر بولا' حوریہ کا دل دھڑکنا بھولنے لگا۔ "اب ایزی تمہیں بتائے گا کہ اس روز اگر تمہاری فرینڈ کی وجہ سے میں کامیاب نہ ہوا تو اسے اب میں پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔" عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس سے پہلے کہ حوریہ اس بدحواسی سے نکل کر اپنا بچاؤ کرتی' وہ تمام لائٹیں آف کرتا اس تک آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی خوش بختی پہ جتنا ناز کرتی کم تھا' اس نے جو چاہا تھا اسے مل گیا تھا۔ جس پل وہ اپنی پور پور سجائے معاذ کے پہلو میں بٹھائی گئی۔ منٹوں میں وہ اس کی بنا دی گئی۔

"آہم!" اس نے باقاعدہ کھنکار کر اس کی توجہ حاصل کی' جو آج بلیک ٹو پیس میں مردانہ وجاہت کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔

"جیت لیا نا تمہیں بہت اکڑتے تھے۔" وہ تفاخرانہ ہنسی۔

"میں نے کہا تھا میں اپنے بابا جانی کی کوئی بھی بات ٹالتا نہیں ہوں۔ یہ میرے بابا جانی کا حکم تھا' اس کے باوجود مانا کہ میں اسے ماننا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے بہت سکون سے کہہ کر بھی اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے اور اٹھ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ اسوہ گم صم بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

پُرجوش ہشاش بشاش سا معاذ اندر آیا تھا۔

"مجھے مبارک باد دیں امی! آپ کے بیٹے کو ٹیکسلا یونیورسٹی سے لیکچرر شپ آفر ہوئی ہے۔ رہائش کی سہولت بھی ہے اور گاڑی بھی۔" وہ آتے ہی ضویا سے

لپٹا تھا۔

"اللہ مبارک کرے میرے چاند!" ضوبا نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔

"چلیں جی۔ موصوف پہلے کچھ کم پراؤڈ تھے۔ رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔" اسوہ نے منہ ہی منہ بڑبڑا کر کہا اس کی یہ بڑبڑاہٹ نزدیک ہونے کی وجہ سے حوریہ نے سنی تھی اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بھابھی کسی کی خوشی پہ جلنے والوں کو کیا کہتے ہیں بھلا؟" وہ حوریہ کو مخاطب کرتا کن انکھیوں سے اسوہ کو دیکھنے لگا۔

"تمہارا سر!" وہ زور سے چیخی اور پیر پٹختی اٹھ کر چلی گئی۔

"تم نے اسے خفا کر دیا' جاؤ مناؤ۔" ضوبا نے کہا۔ وہ مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔

"ابھی یہ ذمہ داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔"

پھر ضوبا کے آنکھیں دکھانے پہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولا۔

"ابھی رخصتی نہیں ہوئی نا!"

"تو منع کرنے والے بھی تو تم تھے۔" ضوبا نے فوراً "جتایا' وہ جواباً" کاندھے اچکا کر ہنسنے لگا۔

☼ ☼ ☼

حوریہ نے اس کے کمرے کے پردے ہٹائے۔ کمرہ سمیٹنے لگی۔ کتنا پھیلاوا تھا' چائے کے خالی مگ' سگریٹ کی ڈبیاں' لائٹر' کشن جو بے ترتیب تھے' وہ کتنی ہی دیر انہی کاموں میں مصروف رہی اور اس سے لاعلم بھی کہ ایزی کب سے اسے دیکھ رہا ہے۔ کتنی عجیب لڑکی ہے۔ میری اتنی زیادتیوں پر بھی کبھی نہیں کچھ کہا۔ کوئی شکوہ نہ شکایت' نہ گلہ کیا ہے' یہ نفرت مگر نہیں۔ اس نے اپنا خیال خود ہی جھٹک دیا' کیا ہے یہ محبت ہے' اس کا دل دھڑکا اور دھڑکتا ہی چلا گیا۔

کیا یہ دل ربا سی لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہو گی۔ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی۔ اسے اس طرح سے سوچنا' اسے دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا' جبھی تو حوریہ جب اپنا کام نپٹا کر باہر جانے لگی تو ایزی نے بے اختیار اسے پکار لیا تھا۔

"جی!" وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھنے لگی' وہ اسی طرح نرمی اور آہستگی سے بھلا کب پکارتا تھا اسے۔

"کہاں جا رہی ہو' یہیں رہو میرے پاس۔" وہ دل کی خواہش پہ بند نہیں باندھ سکا۔

"آپ کے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں۔ بس آتی ہوں۔" حوریہ نے نرمی سے کہا۔

"جلدی آنا' اس لیے کہ میں ان زخموں پہ گلاب بنا کر مہکانا چاہتا ہوں' جو تمہیں مجھ سے ملے ہیں۔"

اس نے بہت آہستگی سے مسکرا کر کہا' حوریہ پہلے چونکی' اور پھر میں اس کی نگاہوں کی معنی خیز شرارت پہ جھینپ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

آسمان سیاہ گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ چھما چھم موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ فضا میں موجود گھٹن اس وقت کچھ اور بھی گہرا محسوس ہونے لگا۔ لان میں موجود تمام درخت پودے ہواؤں کی شوریدہ سری پہ ادھر اُدھر جھوم رہے تھے۔ موسم تو بہت اچھا تھا۔ اس کا اپنا ہی دل اداس تھا۔ اس نے نکاح پہ کھینچی تصویروں کو دیکھا تھا اور گم صم ہو گئی' جو اس وقت بھی سنجیدہ نہیں ہوئی تھی' جب معاذ نے متعدد بار اس پہ اپنی ناپسندیدگی جتائی تھی۔

کیا محبت کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے' کیوں زور زبردستی کی میں نے اسے پا کر نہ پانے کا احساس تو اور بھی تکلیف دہ ہو گا' وہ کل شام بھی آیا تھا۔ ایزی سے ملنے' تب وہ موجود تھی' مگر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی ایزی کے کہنے پہ وہ اس کے لیے چائے لائی تھی مگر وہ منع کر چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ باہر آئی' لیکن وہ اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ ایک وہ تھی جو اسے دیکھنے کے لیے جتن کرتی تھی۔ کیسا کٹھور تھا وہ۔ خاص طور پہ اس کے لیے' اس سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں دنیا بھر کی ترشی اور کھردرا پن شامل ہو جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو اداس بلبل کی طرح۔"

اس کی بھاری گمبھیر آواز پہ وہ جو اسے ہی سوچ رہی تھی اپنی جگہ زور سے اچھلی اور اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اداس ہو؟" اس سے کچھ فاصلے پہ بیٹھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔ اسوہ نے جواب دینا ضروری سمجھا اور لب کچل کر آنسو اندر اتارتی رہی' جو اسے دیکھتے ہی جانے کہاں سے آنکھوں میں جمع ہونے لگے تھے۔

"اس لیے کہ میں کل جا رہا ہوں یا اس لیے کہ میں تمہیں لفٹ نہیں کراتا رہا ہوں۔" اب اس نے مچلتی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ اسوہ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا' مگر آج ان نگاہوں کا رنگ انوکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر سے زیادہ نہیں دیکھ سکی۔ پلکیں حیا سے لرزی تھیں۔

"یار! میرا ارادہ تو مکمل استحقاق کے بعد تمہیں منانے کا تھا' مگر یہ بابا کا آرڈر تھا۔"

"اوہ تو تم ان کے کہنے پہ آئے ہو۔" وہ جو سب کچھ بھلا کر خوش ہو چلی تھی' چیخ کر بولی۔

"ہاں یہ تو ہے' اس لیے کہ اپنے بابا کی کوئی بات تو میں ٹالتا نہیں ہوں۔ ورنہ تم جیسی لڑکی..." وہ لب اسے چھیڑ رہا تھا' ورنہ آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

"کیا؟" اس کی پوری بات سنے بغیر چیخی۔

"تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو ابھی اور ستانے کا ارادہ تھا۔" اس نے سر کھجایا۔

"میری محبت تو دیکھ لی کچھ اپنی محبت کے بارے میں بھی بتانا ہے؟" اس نے فوراً" خبر لی۔

"اوہ یار! جب ساتھ رہیں گے تو محبت بھی ہو ہی جائے گی۔" وہ بے نیاز بنا۔

"ہاں جیسے تمہارے بابا جانی کو مام سے۔ سنا ہے' مام کو تمہارے بابا سے ایسی ہی طوفانی محبت ہو گئی تھی۔"

وہ بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگی' جہاں سنجیدگی تھی۔

"خفا ہو گئے؟" وہ ڈری۔

"خوبصورت ہونا بھی سزا ہو گئی' چڑیل کا سایہ ہو جاتا ہے جیسے مجھ پہ۔" وہ شریر ہوا اور اسوہ کی اٹکی سانس بحال ہو گئی۔

"اور جیسے بابا پہ؟" اس نے بدلہ چکایا۔

"میں امی کو بتاتا ہوں۔ تم انہیں کیا کہہ رہی ہو۔" اس نے دھمکایا ہی نہیں باقاعدہ اٹھ کر اندر کی سمت چلا گیا۔ وہ بوکھلا کر اس کے پیچھے بھاگی۔

"امی! یہ آپ کی بہو آپ کو پتا ہے کیا کہہ رہی ہے۔" اس نے اندر جاتے ہی زور سے کہا اور اس نے اتنی سرعت سے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر لجاجت سے منع کیا کہ ضوبا اور ہارون اسرار بھی معنی خیزی سے ہنس پڑے' وہ خجل سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ جب ان کی شادی کی تاریخ فائنل کر رہے تھے۔ ایزی نے بے خیالی میں سگریٹ سلگانا چاہا تھا۔ حوریہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے ٹوکا تھا اور آنکھوں میں نفی کا اشارہ کیا۔ معاذ نے دیکھا اور مصنوعی انداز میں کھانسا۔ دونوں چونکے اور خجل ہو گئے۔ یہی تھے محبتوں کے مان اور استحقاق۔ بالکل ویسے جیسے ایزی نے سگریٹ واپس رکھا تھا' جیسے ابھی مام نے بابا کی جیب سے والٹ نکال کر مطلوبہ رقم لی تھی' جیسے اس نے معاذ کو شرارت سے روکا تھا' دیر سے سہی مگر من چاہا احساس ان سب نے پا لیا تھا۔

☼

عالیہ بخاری

دیارِ شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلشاد نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ویڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا کردار حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اسے پیچھے رہ جانے والی کا بھرم سا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو، دنیا کی کالونی میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعاگو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصۂ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی امارت سے متاثر ہو کر اس کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زویا کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے جوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جارہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ نتاشا ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک نیم سرکاری کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دُوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی جوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جیسے ڈرائیور الطاف کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۶

سولہویں قسط

آپا گل کی نگاہ اظہار صاحب کے چہرے پر جم رہی تھی جن کا چہرہ تاریک پڑتا جارہا تھا۔
وہ اب تک اسی طرح ساکت کھڑے تھے اور سہارے کے لیے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔
بات جتنی بھی سخت تھی، اور واقعہ جیسا بھی تکلیف دہ تھا۔
پھر بھی!
آپا گل نے اس سے پہلے انہیں کبھی کسی بات پر اتنا شدید ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
وہ محض رنجیدہ نہیں تھے، بلکہ خوف زدہ تھے ورنہ آپا گل کے حساب سے تو انہیں اب تک سلمان کے پیچھے جا کر اسے اتنی سنانا چاہیے تھیں کہ سارے گھر والوں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔
"اور کرو اس چڑیل کی طرف داری، بولتے ہی نہیں دیتے تھے مجھے، اب دیکھ لیا نتیجہ!"
شاکرہ بیگم کو اب کس کا ڈر تھا، کھل کر ان ہی کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں۔
"میں کہتی تھی کہ سختی سے بات کرو زوبیہ سے، اتنا سر مت چڑھاؤ، اب لے گئی نا نکال کر میرے اکلوتے بیٹے کو۔ خدا غارت کرے، اس سارے خاندان کو، چار پیسے کیا ہاتھ میں آگئے، زمین پر پیر ہی نہیں رکھتے۔"

جذبات میں، وہ یہ بھول رہی تھیں کہ اس خاندان کے یہی چار پیسے، کل تک ان کے لیے بھی "وجہ تھے۔
آج بھی ان کے دیے ہوئے قیمتی تحائف کی ہر آئے گئے کے سامنے نمائش کرنا وہ کتنا ضروری سمجھتی ہیں۔
کیا ہوا ابو! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
گل سے ضبط نہیں ہوا۔ "آرام سے بیٹھ جائیں نا، کھڑے کیوں ہیں!"
کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے، وہ آگے بڑھی تھیں، مگر اظہار صاحب، بنا ان کی کسی بات کا
ے تیزی سے باہر چلے گئے۔
وازے سے لگی کھڑی زویا اور پھر جویا کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر انہوں نے نہیں دیکھا تھا، شاکرہ بیگم کے رونے
میں شدت آرہی تھی۔
ب بس بھی کر دیں، کون سی نئی بات ہو گئی ہے، کتنے دن پہلے سلمان بھائی بتا چکے تھے کہ وہ لوگ یہاں نہیں
گے، پھر بھی آپ ہیں کہ۔۔۔!"
اہٹ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے، زویا نے بات ادھوری چھوڑی۔
"س کے جانے کو کون رو رہا ہے۔" آپا گل نے خفگی سے زویا کی طرف دیکھا۔ "رونا تو اس بات کا ہے کہ ہمیں
کس بات کی سزا دے رہا ہے، جو اپنے ساتھ نہیں لے جارہا، بوڑھے ماں، باپ کو اکیلا چھوڑنا، وہ بھی جوان
وں کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے۔"
"یہاں اور کون کون سی باتوں میں انصاف ہو رہا ہے، اتنی بڑی بڑی ناانصافیاں آپ لوگوں نے بھی تو کی ہیں،
یہ کو بھی کرنے دیں۔"
ویا کہتے ہوئے کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی۔
"شاباش ہے تمہیں، بجائے ماں باپ کی تکلیف کا احساس کرنے کے، طعنے دینے کھڑی ہو گئیں، سب سمجھتی
کس کے حق میں بولا جارہا ہے۔ یہ جو تم دونوں کا گٹھ جوڑ ہے، پتا نہیں اور کیا رنگ دکھائے گا۔"
ت وہ زویا سے کر رہی تھیں، مگر نگاہ جویا پر جمی ہوئی تھی۔
ن کی نگاہوں کی تاب لانا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا تھا، جویا کا سر بھی جھکتا چلا گیا۔ مگر زویا چپ رہنے والوں میں
یا تھی۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آپا! آج اگر زوبیہ کی جگہ ربیعہ ہوتی، تو کبھی بھی یہ نوبت نہیں آسکتی تھی، مگر آپ
کو تو زوبیہ بھابھی کی دولت کے آگے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، سارے خاندان کو حقارت سے دیکھتے
تھے آپ لوگ جیسے کروڑپتی وہ کمال صاحب نہیں خود آپ ہیں، اب بھگتیے!"
"چپ ہوتی ہے زویا! یا پھر کچھ کھینچ کر ماروں یہاں سے۔"
ے فاصلے پر بیٹھی شاکرہ بیگم بلبلائیں۔
"چپ ہو جاؤں گی، لیکن ان سب کو کیسے خاموش کریں گی، جو سلمان بھائی کی شادی کے دن سے باتیں
ہیں، سارے خاندان میں مذاق بنا ہے سلمان بھائی کی شادی کا۔"
ہیں سارے ہم سے۔"
"کہا پھر ٹھیک ہے، ہونے دیں جو کچھ بھی۔"
بھرے بیگ گھسیٹے جانے کی آواز پر، زویا بے ساختہ ہی خاموش ہو گئی۔

سلمان سامان اوپر سے نیچے لا رہا تھا۔

"اتنی جلدی! سلمان تو کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ کل جائیں گے۔" آپا گل کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

"شاید اس کی بیوی اپنا سامان وغیرہ لے کر جا رہی ہے۔"

کمرے میں یک دم ہی بڑی گہری خاموشی چھائی تھی، معلوم نہیں کتنا سامان تھا۔

ایک کے بعد ایک۔

سلمان اور زوبیہ کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی شامل ہو رہی تھیں۔

زوبیہ نے اپنے گھر سے ملازم بلوائے تھے شاید، ان میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ جھانک کر سلمان کی رخصتی کے اس منظر کو دیکھ سکے۔

دکھ کا بڑا دل توڑتا احساس تھا جو ان سب نے ہی یکساں طور پر محسوس کیا تھا۔

زویا نے دیوار کی طرف منہ پھیرتے ہوئے چپکے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"میں دیکھتی ہوں جا کر، ایک بار تو اس زوبیہ کی وہ خبر لوں گی کہ یاد ہی کرے گی۔"

شاکرہ بیگم ایک آخری کوشش کے خیال سے اپنی ساری ہمت سمیٹ کر کھڑی ہونے لگی تھیں۔ اس بار حیرت انگیز طور پر آپا گل آڑے آئیں۔

"رہنے دیں امی! بے کار میں اپنی بے عزتی کروانے کی ضرورت نہیں ہے، ہونا تو وہی ہے جو وہ لوگ چاہ رہے ہیں، تو بس ہونے دیں۔"

زویا اور جویا دونوں نے آپا گل کی طرف ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔

ان کے چہرے پر بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔

غصہ، خجالت، ناکامی اور ساتھ ہی دبی دبی سی تپش۔

"آج ان کی سہی، لیکن کل ہماری بھی باری آئے گی، آپ دیکھتی جایئے۔ میں کس طرح سے اس زوبیہ کو۔۔!"

"ارے اس وقت تو سارا محلہ اس زوبیہ کا سامان جاتا دیکھ رہا ہوگا گلی میں کھڑا ہوا، اب دیکھنا، سارا دن تانتا بندھا رہے گا، پوچھ کچھ کے لیے۔"

شاکرہ چچی کا صدمہ اتنا بڑا تھا کہ وہ اس وقت آپا گل کے پلان میں بھی دلچسپی لینے کو تیار نہیں تھیں۔

"دیکھ کر، میرا بہت قیمتی سامان ہے، ذرا بھی نقصان ہوا تو تم سے ہی وصول کروں گی۔"

زوبیہ نے چلا کر کسی ملازم سے کہا تھا۔

شاکرہ بیگم نے بے ساختہ ہی ٹھنڈی سانس لی۔

اور ان کا سب سے قیمتی سامان! جس کے لیے نہ وہ کسی کو وصولی کی دھمکی دے سکتی تھیں، اور نہ ہی خود حفاظت کر سکیں۔ آنکھوں کے سامنے، دن دہاڑے ڈاکہ پڑ رہا تھا۔

انہیں بڑی شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی، باہر اب آوازیں ہلکی پڑ رہی تھیں اور پھر بہت زور سے گیٹ بند ہونے کی آواز آئی۔

ان سب نے ہی چونک کر کمرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں کوئی نہیں تھا۔

کتنی ناقابل یقین بات تھی کہ سلمان نے جاتے ہوئے انہیں خدا حافظ بھی کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

☆ ☆ ☆

...نیلی کا شیشہ پرانا سہی، مگر اس کا عکس پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا، گہرے نیلے اور سرخ ...کی کانجی ورم ساڑھی جو اس نے تائی ستارہ کے بہت سنبھال کر رکھے ہوئے قیمتی ملبوسات کے صندوق سے ...بچار کے بعد منتخب کی تھی، پہنتے ہی جیسے ساری شخصیت ہی بدل گئی تھی۔

...نے حیران نگاہوں سے خود کو دیکھتے ہوئے پلو کو اپنے ہاتھ پر لیا۔

...ساڑھی مرحومہ فیروزہ کی تھی، جو اس کے شوہر نے خاص طور پر کلکتہ سے منگوا کر دی تھی، قیمت سن کر اس ...نے دانتوں میں انگلی دبالی تھی، اب تو یقیناً "لاکھوں کی ہوگی۔

...تی تھیں کہ کانجی ورم ساڑھیوں کی اہمیت بیش قیمت زیورات سے کم نہیں ہوتی، کتنے ہی موقعے آئے ...کے دل پر صبر کا بھاری پتھر ہی دھرا رہا۔

...تماشوں، خوشی، دل لگی سے بھری اس زندگی میں سجنے سنورنے سے زیادہ اہم کام اور تھا بھی کیا، اندر سے ...روح کو خوش رنگ اور خوشبو دار پیرہن ہی کامیابی سے چھپائے رکھتا ہے۔

...بھی بنا رہتا ہے اور چار پیسے کمانے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

لیکن اس کی بدنصیبی نے تو اس کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔

...سال کی عمر سے ایکسٹرا ڈانسرز کی لائن میں کھڑی ہوئی تو ہوئی۔

...اچھے وقت، اچھی ساعت کی امید میں اس نے وقت کو کاٹا تھا، یا وقت نے اس کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ...تھا۔

...زیورات، اچھے کپڑے، ذات کا غرور، ایک ایکسٹرا کی اوقات ہی کیا تھی۔

...لائن میں لگ کر انتظار کرنا، ڈانس ڈائریکٹر کی جھڑکیاں، نچلے درجے کے لوگوں کے اور بھی نچلے مذاق ...ے بتا تھا کہ، وہ مور کے پنکھ لگا بھی لیتی تو اور بھی مضحکہ خیز لگتی، سو ساری عمر وہی کیا، جو اس کی بارہ آنے والی ...بچتا بھی تھا۔

...ریشمی کپڑے، نقلی زیورات اور سستی سستی میک اپ کلس۔

...وقت کی نامور مصنفہ اور ستارہ نواز، ستارہ جان اور موتی سی چھب دکھا کر چھپ جانے والی فیروزہ جان کے ...نگینہ کی حیثیت باندی کی سی تھی، اور اس نے ہمیشہ خود کو وہی سمجھا۔

...اب کہیں جا کر اس کے بخت کا سورج بھی چمکا تھا۔

...چاہ کے ساتھ گھوم گھوم کر اس نے خود کو آئینہ میں ہر زاویہ سے دیکھا۔

...بال پہلی بار سستے ہیر کلر اور کالی مہندی کے بجائے، کسی امپورٹڈ ہیر کلر سے رنگے ہوئے تھے، اور اس نے ...

...سب سے اچھی بیوٹیشن کو بلا کر اپنا میک اپ بھی کروایا تھا۔

...وہ بہت اچھی بہت مختلف اور کروفر والی عورت دکھنا چاہتی تھی۔

...جیسے گل نار، گل رخ۔

...سے بھی کہیں زیادہ۔

...اندر خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے وہ سب کیا، جو شخصیت کی دل کشی بڑھانے میں معاون ثابت ...

...اب نتیجہ سامنے تھا۔

"باجی! نانی کہہ رہی ہیں اگر آپ تیار ہوگئی ہیں تو۔۔۔" شاما کہتے ہوئے اندر آئی' اور پھر مارے بوکھلاہٹ کے' نانی کا پیغام بھی ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"ہائے میں مرجاؤں' یہ آپ ہیں باجی نگینہ! قسم لے لیں جو پہچانی جارہی ہوں' بالکل ایسے لگ رہی ہیں جیسے' جیسے۔۔۔!"

شاما کی کوڑھ مغزی نے کوئی فوری مثال بھی نہیں سوجھنے دی۔

نگینہ بڑی متانت سے مسکرائی۔

"چل بس' اب دیر مت کر' پہلے دن تو وقت پر پہنچنا چاہیے' بعد میں تو اگر دیر سے نہ جائے' تو ہیروئن' ہیروئن ہی نہیں لگتی' ایکسٹرا گرل لگتی ہے۔"

وہ اس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی' مگر وہ ساری دوڑ دھوپ' اب بھی پیروں تلے جل رہی تھی۔

"آپ کے نیلے نگوں والے جھمکے نکال دوں' اس کے ساتھ پہننے کے لیے؟"

شاما کہتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے نگینہ کے نقلی زیورات والے ڈبے کی طرف بڑھی۔

"پاگل ہوگئی ہے کیا' اس ساڑھی کے ساتھ وہ سو روپے والے جھمکے لٹکاؤں گی کیا' تو جا کر ذرا اماں کی الماری میں سے زیورات کا ڈبہ تو نکال کر رکھ' مدت سے ارمان تھا' ان زیورات کے شایان شان لگنے کا۔"

پلو کو پھر سے سیٹ کرتے ہوئے اس نے شاما کو ہدایت جاری کی۔

"نانی کے زیور!" شاما کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

"اور اب یہ سارے نقلی والے تو لے' لے۔ مجھے تو اب ہاتھ نہیں لگانا انہیں' اللہ نے میری مراد پوری کی ہے' اب دیکھنا کیسے جلاؤں گی ساروں کو۔" اپنی بات کہہ کر' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شاما جو بڑے سے بڑے دکھ میں اس کی ساتھی رہی تھی' اس وقت چھوٹی سی خوشی کو بھانے میں ناکام رہی تھی۔

نگینہ نے نوٹ بھی رکھ لیا۔

"تجھے کیا ہوا ہے' یقین نہیں آرہا کیا؟ سچ کہہ رہی ہوں سارے کے سارے تیرے' نقلی ہیں تو کیا ہوا' مل ملا کر تو دو چار ہزار کے بن ہی جائیں گے' ابھی تو اور بھی لے کر دوں گی تجھے۔"

وہ مکمل طور پر سخاوت کے موڈ میں تھی۔

شاما نے ملکے سے ہاتھ جوڑ کر' احسان مندی کا اظہار کیا' اور بنا کوئی لفظ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"پاگل کہیں کی!" نگینہ کی ہنسی میں بڑی کھنک تھی۔

شاما کی جان' نانی کے سیف میں رکھے زیورات کے ڈبوں میں اٹکی تھی' جن میں سے اب آدھے سے زیادہ خالی ہو چکے تھے۔

نگینہ کے حکم پر وہاں سے نکالتی تو کیا نکالتی۔

کم از کم آج تو کوئی دل دکھانے والی بات ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔

وہ بڑی پریشان سی نانی کے کمرے میں داخل ہوئی تھی' مگر وہ پہلے ہی اس مسئلے کا حل نکالے بیٹھی تھیں' سرخ اور نیلے نگوں کا ایک خوبصورت سونے کا سیٹ اسی ساڑھی کے ساتھ میچ کرتا ہوا' انہوں نے بچا کر رکھا تھا' شاما کو کمرے میں داخل ہوتے ہی نانی کی مسہری پر اس کا کھلا ہوا ڈبہ نظر آگیا تھا۔

"شکر ہے' میں تو پریشان ہی ہوگئی تھی کہ باجی نگینہ کہیں ساری الماری کھول کر نہ بیٹھ جائیں۔" شاما کو دل میں سکون حاصل ہوا۔

نانی مسکرا دیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

نگینہ کے صبح سے "جلدی جلدی" کے شور کی وجہ سے سب ہی الرٹ تھے' لیکن خود وہ ہی آخری وقت تک اپنی تیاری سے مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔

"بس اب جلدی کر نگینہ! بابا کی بھیجی ہوئی گاڑیاں کب سے آئی کھڑی ہیں۔"

"میں تو خود کب سے کہہ رہی ہوں۔"

نگینہ کا زیورات پہننے کا مرحلہ ختم ہوا تو وہ قدرے مطمئن ہوئی۔

نانی ستارہ اس کے بالکل قریب آکھڑی ہوئیں۔

"صندل کو شروع سے وقت کی پابندی اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں ادب آداب کی تلقین کرتی رہنا' یہ نہ ہو کہ آج کل کے چھچھورے طریقے اپنانا شروع کردے۔"

وہ خود ساری عمر بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کے ساتھ چلی تھیں' اور اب دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں۔

نگینہ کے ساتھ تو خیر بڑی مجبوریاں رہی تھیں' لیکن صندل کو گھرانے کی روایات کو آگے بڑھانا ہی چاہیے تھا۔ وہ کچھ ایسی ہی نصیحتیں کررہی تھیں' مگر نگینہ نے پہلے ایک آدھ فقرے کے علاوہ مجال ہے جو کچھ سنا ہو' اس کی ساری توجہ نانی ستارہ کی شخصیت پر تھی' بہت ہی ہلکے سے رنگ کا سادہ مگر دلکش سوٹ پہنے ہوئے' ہاتھوں میں بیلے کا ایک خوبصورت گجرا اور بہت نازک جیولری۔

وہ ہمیشہ اسی طرح تیار ہوتی تھیں' لیکن چہرے پر آج ہمیشہ سے زیادہ تمکنت تھی۔

ایسی تمکنت جو سامنے والے کو خود بخود ان کی عزت کرنے پر مجبور کردیتی تھی۔

اسے تو ساری عمر حسرت ہی رہی کہ وہ ان جیسی کبھی دکھائی دے۔

کانجی درم ساڑھی' سونے کا وہ بھاری سیٹ' اور محنت سے کرایا ہوا میک اپ۔ سب ہی کچھ نانی ستارہ کی شخصیت کے آگے ماند تھا۔

"کچھ بھی سہی' ہیں تو میری ماں ہی۔" نگینہ کے گرے پڑے مورال کو یہی ایک فخر ہمیشہ سہارا دیتا چلا آیا تھا۔

"اماں! وہ چوڑیاں۔" دفعتاً" ہی اسے ایک اور سنبھال کر رکھا ہوا ارمان یاد آیا۔

نانی کے ساتھ کمرے سے نکلتی ہوئی شاما بوکھلاہٹ میں گرتے گرتے بچی۔

"آج تک ہاتھ میں ہی نہیں ڈالیں' یہی سوچا تھا کہ صندل کی فلم کے مہورت پہ پہنوں گی' جا شاما نکال کر تو لا۔"

"وہ تو باجی۔۔۔!" شاما کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان چوڑیوں کی بابت کیا کہے' جو مہینوں پہلے موتی محل جیولر کے ہاں بک جاچکی ہیں۔

"اوں ہنہ!" اسے اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس ہوا' نانی تنبیہی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

شاما کو بات پوری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ نانی اپنے ہاتھ سے ایک کنگن اتار کر' نگینہ کو تھما رہی تھیں۔

"یہ ڈال لو ہاتھ میں' ایک ساتھ اتنی چیزیں پہنوگی تو کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔"

"واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اماں!"

نگینہ کے چہرے پر ہلکا سا خوف ابھرنے لگا۔ تقدیر کے اس سب سے خوشگوار موڑ پر اسے اب سب سے زیادہ نظر لگ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ حاسدوں کی بھلا کیا کمی' اور یہاں تو گھر میں ہی مخالف کیمپ کھلا ہوا تھا۔

اس کی نگاہ پچھلے دروازے سے ہوتی ہوئی اس طرف گئی جہاں آج مکمل سناٹا تھا۔

وہاں سے کسی نے بھی، آج صندل کے مہورت شارٹ کے لیے دی جانے والی اس کی دعوت کو قابل قبول نہیں سمجھا تھا۔

بیماری، مصروفیت، بہانوں کی کیا کمی تھی۔

مگر نگینہ بھی ٹھانے ہوئے تھی کہ آج خیریت کے ساتھ کام پورا ہو جانے پر وہ صندل کو ان کے ہاں سلام کروانے کے لیے ایسے ہی لے کر جائے گی جیسے گلناز، الماس کو دبئی کا ٹرپ کروانے کے بعد واپسی پر لائی تھی۔

سامنے استاد جی اور نانی، صندل کا صدقہ اتار رہے تھے۔

"اب اور کتنی دیر ہے آخر، دوبار بالی صاحب کا فون آچکا ہے نانی! وہاں کتنے لوگ انتظار کر رہے ہیں، سارے میڈیا والے آئے بیٹھے ہیں۔"

صندل میں تنک مزاجی تو فطری تھی، لیکن اس وقت ہیروئن والا غرہ بھی آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

نگینہ نے فخریہ نگاہ بیٹی پر ڈالی۔

صندل کی دل کشی میں کیا کلام تھا۔

رہی سہی کسر اس تمکنت کی تھی، جو تھوڑی بہت خوش قسمتی سے نانی ستارہ کی طرف سے اسے ملی تھی۔ وہ ایکسٹرا ڈانسر نگینہ جان کی بیٹی سے زیادہ ماضی کی معروف فنکارہ ستارہ جان کی نواسی زیادہ لگتی تھی۔

اور نگینہ اس کی اسی شناخت کو زیادہ اہمیت دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

سامنے کے آرائشی برآمدے میں سے گزرتے ہوئے نگینہ نے جھانک کر اطمینان کیا کہ بالی کی بھیجی ہوئی وہ دونوں شاندار گاڑیاں سیڑھیوں کے ساتھ ہی کھڑی ہیں۔

ابھی "کام" کا وقت یہاں شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے ہر کھڑکی اور بالکونی میں سے کوئی نہ کوئی چہرہ جھانک رہا تھا۔

نگینہ کو پتا تھا کہ وہ سب صندل کے اترنے کی منتظر ہیں، جو راتوں رات "سیلیبریٹی" بن چکی تھی۔

یہاں ساری لڑکیاں عزت و شہرت کے ایسے "معیار" کی متمنی رہتی ہیں، جو خوش قسمت ہوتی ہیں، منزل پا لیتی ہیں، ورنہ تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی یہاں کون سی کمی تھی۔

وہ... وہ بھی تو...

سر کو ہلکے سے جھٹک کر اس نے ناک میں کھڑی زود رنجی کو جھٹکا۔

صندل نے نیچے جانے والی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ نانی ستارہ کو کچھ یاد آیا۔

"یہ گیتی کہاں ہے، کیا اکیلی رک رہی ہے گھر پر، میں نے کہا بھی تھا اسے چلنے کے لیے۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"سو گئی ہے اماں! اور بختاں، سلونی ہیں یہاں پر، تھوڑی دیر میں وہ سالار بھی آجائے گا، پڑھانے کے لیے۔"

"اور وہ وہاں جا کر کرے گی بھی کیا، یوں ہی منہ بنا کر ایک طرف بیٹھی رہے گی، میڈیا والوں نے نوٹس لے لیا تو اور مصیبت۔"

صندل کو اس وقت اپنے علاوہ کسی کا بھی موضوع گفتگو بننا گوارا نہیں تھا۔

آگے پیچھے اترتے ہوئے وہ سب ہی رخصت ہوئیں تو پیچھے بڑا گہرا سناٹا رہ گیا۔

حفاظت کے لیے چھوڑی جانے والی بختاں اور سلونی، کاسنی اور سفید نیٹ کے پردوں والے آرائشی برآمدے

میں بیٹھ کر، نیچے پھیلی خوشگوار چہل پہل میں مصروف ہوئیں۔

اور خاموشی میں ڈوبے اس انتہائی پچھلے کمرے میں دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی، گیتی نے آہستگی سے اپنی آنکھوں کے کونے خشک کیے۔

کاش وہ اپنی بہن کی خوشی میں، پورے دل کے ساتھ خوش ہو سکتی، مگر وہ تو رسماً بھی ایسا کچھ نہ کر سکی، اور خود صندل نے بھی ایسا کب چاہا۔

اس کے تصور میں صندل کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ تھا۔

جینے کی سرشاری میں ڈوبا ہوا۔

کچھ پانے کی ابتدا ہمیشہ وہیں سے ہی کیوں ہوتی ہے، جہاں کوئی دوسرا اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے۔

اس نے اپنی زندگی میں چلتے ہوئے اس بھید بھرے سلسلے کو کھوجنا چاہا۔

پہلے خیام۔

اور اب صندل۔

ایک کو وہ کھو چکی تھی، اور دوسرے کو کھونے والی تھی۔

آج اسے احساس ہوا تھا، کل کو نانی اور نگینہ امی بھی اسی احساس سے گزرنے والی تھیں۔ یہی یہاں کی روایت تھی۔

سامنے کھلا آسمان ہے تو یہاں کے پرندے ہمیشہ لمبی اڑان ہی بھرتے ہیں۔

صندل بھی اب زیادہ عرصے یہاں رکنے والی نہیں تھی۔

گیتی کو اپنے اندر سے اٹھتی اس آواز پر گہرا یقین تھا۔

سالار کے آنے کی خبر پر، وہ بالوں کو سمیٹتی ہوئی، کتابیں سنبھال کر نانی کے کمرے میں چلی آئی۔

سالار نانی کے میوزک کلیکشن کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"استاد بڑے غلام علی، زہرہ بائی کلکتہ والی، سہگل، نانی کا ٹیسٹ لاجواب ہے۔" اسے دیکھ کر وہ دل کشی سے مسکرایا۔

"پتا نہیں، مجھے میوزک کی ذرا بھی سمجھ نہیں ہے، مجھے تو ان آج کل کے بینڈز وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔" وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔

"چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔" وہ روانی میں کہہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی حساسیت سے مجبور تھی۔

"طنز کر رہے ہیں؟"

"میری مجال۔" وہ ہنس پڑا۔ "ویسے تم ذرا سا مثبت نہیں سوچ سکتیں، چن چن کر دل دکھانے والے مطلب اخذ کرتی ہو، چلو کتاب اٹھاؤ۔"

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"آپ کیوں نہیں گئے، صندل کے مہورت شارٹ میں، ان سب لوگوں نے بہت اصرار کے ساتھ آپ کو اور فسر بھائی کو انوائٹ کیا تھا۔"

"فسر بھائی گئے ہیں! میڈیا کے لوگ ایسے موقعے نہیں چھوڑتے ہیں۔"

"میں آپ کا پوچھ رہی ہوں۔"

"میں!" وہ پل بھر کے لیے رکا۔ "پتا نہیں کیوں، شاید میں ابھی تک خود کو معاف نہیں کر سکا، حالانکہ دونوں

غلطیاں انجانے میں ہی سرزد ہوئیں' صندل کو افسر بھائی تک پہچانے کی بھی اور خیام کو...."
"مت نام لیں اس کا۔" کیتی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "اچھا ہوا جو وہ چلا گیا' دو چار سال اور یہاں رک جاتا تو ہم سب کی توقعات اور بھی بڑھتیں' اب کم از کم سب کی آنکھیں تو کھل گئی ہیں۔"

ان سارے دنوں میں جتنی بار بھی سالار نے دانستہ یا نادانستہ خیام کا ذکر چھیڑا' وہ اس طرح بے زاری کا اظہار کرتی دکھائی دی' پھر بھی سالار کو اس کی آنکھیں الفاظ کا ساتھ دیتی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

دل پر رکھا ہوا بوجھ اور بھی بڑھتا۔

"اور مہربانی کر کے خیام کے بارے میں کوئی بات نہیں کیجیے گا' بڑی مشکل سے انہوں نے خود پر قابو پایا ہے' یہاں اب کوئی خیام کے بارے میں بات نہیں کرتا۔" وہ اپنی کتاب کھول چکی تھی۔

"بات نہ کرنے سے بات ختم تو نہیں ہو جاتی' اور کیا خبر کل کو وہ آ ہی جائے' سب کو یہاں سے لے جانے کے لیے۔"

وہ اسے مکمل مایوسی کی نذر نہیں ہونے دے سکتا تھا' اسی لیے کسی خوشگوار امکان کا سرا تھامے رکھنا چاہتا تھا۔

کیتی کا سر ہلکے سے نفی میں ہلا۔

چائے لے کر سلونی اندر آ رہی تھی اور اس کے پیچھے بختاں تھی' اور چائے دے کر وہ دونوں باہر نہیں گئی تھیں' وہیں زراہٹ کر تائی کی مسہری کے پاس بیٹھ کر ہلکے ہلکے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

کیتی کو پتا تھا کہ اب وہ دونوں جب تک وہ پڑھے گی' یہیں بیٹھی رہیں گی۔ یہاں کے اصول قاعدے بڑے متضاد قسم کے تھے۔

بھرپور آزادی کے کھلے ڈلے مظاہرے کے ساتھ لڑکیوں کی بڑی سخت نگرانی بھی تھی۔

تائی کچھ زیادہ ہی سخت رہی تھیں۔

سب کہتے تھے کہ فیروزہ کے قصے سے انہوں نے بڑا گہرا سبق لیا تھا۔

"اب معلوم نہیں سینت سینت کر رکھی گئی صندل کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا تھا۔"

کیتی نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے سوچا' اور کاپی سالار کی طرف بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

دیوار سے ٹیک لگائے' وہ کب سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

چھوٹا سا صحن دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ اور ہوا کے نیم گرم جھونکے یہاں تک آ رہے تھے' سامنے کے کمرے میں نواب اسی گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا' جس سے سعیدہ کو سخت نفرت تھی۔

زری کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر نواب کو جگا دے' سعیدہ کب کی دونوں بچوں کو لے کر نکلی ہوئی تھی' سلائی کے کپڑے دینے کے لیے' اب اس کے آنے کا وقت ہو چکا تھا' نواب کو اب تک سوتا دیکھتی تو آتے ہی اس کا موڈ اور بھی خراب ہو جاتا' بے چین سا ہو کر اس نے پہلو بدلا اور پھر آخر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سعیدہ سے وہ سچ مچ ڈرنے لگی تھی۔

بات' بے بات وہ اس پر چلاتی' اور جو منہ میں آتا کہنے میں سیکنڈ نہ لگاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے خوش رکھے۔

حیدر آباد سے جب وہ یہاں آ رہی تھی تو چچی نے یہی نصیحت کی تھی کہ بھابھی کی بے حد خدمت کرے گی' تو وہ

بھی دل سے لگا کر رکھے گی۔

مگر نہ تو وہ خدمت سے خوش ہوتی تھی' اور نہ ہی اس کی بے بسی پر رحم کھاتی تھی۔

اس کا بس چلتا تو وہ زری کو کب کا واپس چچا' چچی کے پاس چھوڑ آئی ہوتی۔

"بھائی بھائی!"

دھیمے دھیمے پکارتے ہوئے اس نے نواب کا کندھا ہلایا۔ مگر اس پر تو موت کی سی غفلت طاری تھی' کسی کسی وقت تو اس کی نیند سے خوف آنے لگتا تھا' سعیدہ تو صاف کہتی تھی کہ کسی دن وہ یوں ہی سوتے کا سوتا ہی رہ جائے گا۔

"نواب بھائی! اٹھو نا!" خوف زدہ سی ہو کر زری نے اس بار پکارا بھی زور سے تھا' مگر وہ "اوں ہنہ" کر کے دوسری طرف کروٹ لے چکا تھا۔

"یا اللہ کیا کروں آخر!" وہ بے چارگی سے زیر لب کہتی ہوئی واپس باہر آ گئی۔

پکانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا' جو وہ پکا کر ہی رکھ دیتی' سعیدہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ واپسی میں سبزی لیتی ہوئی آئے گی۔

آٹے کے کنستر کی تہہ میں تھوڑا سا آٹا خوش قسمتی سے باقی تھا' اس نے گوندھنے کے لیے وہی نکال لیا۔

تب ہی کسی نے دروازہ زور سے بجایا۔ یہ انداز نہ سعیدہ کا تھا' اور نہ ہی کسی محلے والے کا' یہ تو کوئی اور ہی تھا۔

"پتا نہیں دروازہ کھولنا بھی چاہیے یا نہیں۔" وہ دروازے کے پاس جا کر ہی سوچ کر رکی تھی' سعیدہ کی سختی سے ممانعت تھی دروازے کے قریب بھی جانے کی پتا نہیں کیا کیا خدشات لاحق تھے اسے' دستک دوبارہ ہو رہی تھی' اور اس بار پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

زری کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

سامنے وہ جو کوئی بھی تھا' اس کے لیے تو قطعی اجنبی تھا۔

"آپ' میرا مطلب ہے جو آپ سے پہلے یہاں رہتی تھیں وہ...!" زری نے اس کے لہجے کی الجھن کو صاف محسوس کیا۔

"یہاں ہم ہی رہتے ہیں' شروع سے ہی۔" اسے لوگوں سے عام بات چیت کا موقع کم ہی ملتا تھا' سو زبان تھوڑا سا لڑکھڑا ہی گئی۔

"لیکن میں نے آپ کو پہلے یہاں نہیں دیکھا' وہ خاتون جن کے دو چھوٹے بچے ہیں' اور ان کا نام...!" اسے فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا۔

"سعیدہ!" زری بے ساختہ ہی اس کی مشکل آسان کی۔ "وہ میری بھابھی ہیں' اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کرنا چاہا' مگر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"میری بات سن لیجیے پلیز' بہت ضروری کام ہے۔"

ادھ کھلے پٹ کی اوٹ سے زری نے تھوڑا غور سے اس کی طرف دیکھا' جس کی آنکھوں کی نرمی' اس کے دل کی اچھائی کی گواہی دیتی تھی۔

"آپ کے برابر والے گھر میں جو بچہ رہتا ہے ساجد۔" اپنی بات کہتے ہوئے وہ ذرا رکا تو زری نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس آپ اس سے کہہ دیجیے گا کہ اس جمعے کو سہراب بھائی کے گیراج پر ضرور آ جائے' کہہ دیں گی نا؟" وہ شاید

اس کے رویّے سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"جی!" اتنا سا کام تو وہ کر ہی سکتی تھی۔

"بہت شکریہ' آپ اسے کہہ دیجیے گا کہ معاذ بھائی آئے تھے۔" وہ کہہ کر تیزی سے واپس کچھ آگے کھڑی اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ چکا تھا۔

"معاذ!" زری کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"تو یہ معاذ تھا۔"

دروازہ بند کر کے بعد بھی وہ وہیں کھڑی سوچ گئی۔

سعیدہ اور بتول کے درمیان جب بھی ساجد کے بارے میں کوئی بات ہوتی' معاذ کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ وہ بھی ایسے کڑے الفاظ میں کہ "انسان خود ہی دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔

وہ بھی جان چکی تھی کہ معاذ ہی ساجد کو بگاڑنے پر تلا ہوا تھا اور ایک بار چھوٹے کو سو روپے پکڑا کر گیا تھا تو سعیدہ نے نواب سے اس کے عوض کیسی کری ہوئی باتیں سنی تھیں۔

معاذ کا نام زری کے لیے اجنبی نہیں تھا' اور آج وہ خود بھی نہیں رہا تھا۔

"کتنے اچھے تو ہیں۔" اس کا سراپا نگاہوں میں گھوما تو وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"بھابھی اور بتول باجی تو یوں ہی خوامخواہ کسی کے بھی پیچھے پڑ جاتی ہیں' جیسے میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔"

معاذ کی دل کش شخصیت میں اس کی دلچسپی بڑی بے ساختہ اور فطری تھی۔

"ساجد تک پیغام ہی تو پہنچانا ہے' پہنچا دوں گی چپ چاپ۔ وہ بھی سمجھ دار ہے' کسی کو بتائے گا بھی نہیں' ورنہ سعیدہ بھابھی سے معاذ کے بارے میں کچھ کہا' تو وہ تو پہلے میرا ہی گلا دبائیں گی کہ اتنی دیر دروازے پر کھڑے ہو کر بات ہی کیوں کی۔"

تب ہی ایک بار پھر دروازہ بجنے لگا۔

یہ سعیدہ کی دستک تھی۔

"اتنی جلدی کیسے کھول دیا' کیا دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔" وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھورتی ہوئی اندر آئی۔

"وہ میں پانی پی رہی تھی بھابھی!" دیوار کے ساتھ رکھے کولر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بروقت بہانا سوجھا۔

"میرے لیے بھی لا ٹھنڈا سا' اتنی گرمی میں خواری اٹھاتی پھرتی ہوں' اور حاصل کیا....."

وہ سر سے چادر سرکاتی ہوئی اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔

پسینے میں شرابور گرمی اور تھکن سے بے حال دونوں بچے ابھی بھی اسی کے پیچھے تھے۔

اس وقت بڑی آسانی سے بچت ہو گئی تھی' زری نے شکر ادا کیا۔

پانی لے کر جب وہ اندر کمرے میں آئی تو لائٹ جا چکی تھی' اور سعیدہ بڑی بے بسی سے رینگ رینگ کر چلتے ہوئے پنکھے کو دیکھ رہی تھی۔

"اس لائٹ کو بھی ابھی جانا تھا' ذرا سے ہوش بحال ہو جاتے تو کیا ہو جاتا۔"

زری نے ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھا' اور خود سبزی کی ٹوکری لے کر واپس باہر نکل آئی۔

"خدا کرے آج شام ہی ساجد دکھائی دے جائے تو اسے معاذ کا پیغام پہنچا دوں!" اسے پھر سے معاذ کا خیال آنے

"بات کتنی نرمی سے کرتے ہیں!" اس کی روکھی پھیکی زندگی میں یہ چھوٹی سی ملاقات بھی خوشگواریت لیے آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"شش' شش۔"

مانوس سی سرگوشی پر وہ بری طرح چونکی' سامنے کچن کی کھڑکی کے دوسری طرف سے راجو اشارہ کر رہا تھا۔

روزی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں اس کے علاوہ اس وقت کوئی اور نہیں موجود تھا۔

"یہاں کیوں آ گیا' ابھی کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت کر دیں گے میری اور تیری دونوں کی۔"

کھڑکی کے قریب جا کر' وہ تیزی سے بولی۔

"کیا کروں پھر' اندر آنے پر تو سختی سے پابندی لگا دی گئی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو کبھی نہیں ہوا' اتنے سال سے یہاں کام کر رہا ہوں' اب لگتا ہے بوا عظمت نے شکایت لگائی ہے۔"

راجو جھنجلایا ہوا تھا۔

بوا جس حساب سے اس سے خفا رہتی تھیں' اس بنا پر اس کا شک ان ہی پر جاتا تھا' مگر روزی پچھلے کئی ہفتوں سے بدلی بدلی سی لگتی تھی۔ پہلے کی طرح اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے تصدیق کرنا چھوڑ چکی تھی۔

اس وقت بھی تڑپ کر فوراً "ہی کہہ اٹھی۔

"بوا عظمت کا نام مت لینا راجو! وہ جو کچھ بھی کریں گی ہماری بھلائی کے لیے ہی کریں گی' ان کے علاوہ میرا ہے بھی کون۔"

"کیوں میں مر گیا ہوں کیا؟"

"خدا نہ کرے' بس تو بوا کو مت کچھ کہا کر۔" روزی بات اس سے کر رہی تھی' مگر نگاہیں بار بار کچن کے دروازے کی طرف تھیں' جہاں سے کسی وقت بھی کوئی آ سکتا تھا۔

راجو کو اس کی یہ بے توجہی کھل تو رہی تھی' مگر مجبوری تھی۔

"مجھے ضروری بات کرنی ہے' آ کر سن جا پانچ منٹ کے لیے۔"

"ابھی اس وقت۔"

"ہاں' کیونکہ رات کی ٹرین سے تو میں جا رہا ہوں پنجاب۔ دس دن کی چھٹی پر۔"

ادھر پچھلے کمپاؤنڈ میں ملازمین کی آمدورفت جاری رہتی تھی' کوئی بھی زیادہ دیر اسے کھڑا دیکھتا تو نوٹس لیے بغیر نہ رہتا۔ سو اپنی بات کہہ کر وہ مزید نہیں رکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب روزی دس کام چھوڑ کر بھی آئے گی۔

اور وہ واقعی آ بھی گئی۔

"یہ ایک دم پنجاب جانے کی کیا سوجھی ہے تجھے' میں تو بالکل ہی تنہا ہو جاؤں گی یہاں۔" روزی کی آنکھوں میں آنسو آنا شروع ہو چکے تھے۔

"اکیلی کیوں' وہ تیری بوا عظمت تو ہیں تیرے پاس" وہ اس وقت بھی بوا کا طعنہ دینے سے باز نہ آیا۔

درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی روزی چپ چاپ اپنے آنسو صاف کیے گئی۔

بوا کا ضعیف وجود اس شکار گاہ میں آخر کب تک حفاظت کر سکتا تھا۔ اس نے بمشکل ہی راجو کو کچھ کہنے سے

ضبط کیا۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے اس کے روکھے بالوں کو بالکل ہی بے ترتیب کیے دے رہے تھے۔ نہ جانے کتنے دن سے اس نے کنگھی تک نہیں کی تھی۔ راجو نے ایک گہری نگاہ اس کے بے ترتیب حلیے پر ڈالی۔
وہی میلے سے کپڑے اداس چہرہ سنگھار کے نام پر ہاتھ میں ایک چوڑی تک نہیں۔
وہ شوخ رنگوں سے بھری لڑکی جسے اس نے پورے دل سے چاہا تھا معلوم نہیں کہاں کھو گئی تھی!
اب تو اس نے روزی سے پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔
"تھوڑے سے دنوں کی بات ہے ماموں کی طبیعت خراب ہے اماں کو لے کر جا رہا ہوں دونوں بہنوں کے رشتے بھی وہاں طے کر کے آئیں گے اسی لیے ماموں زور دے رہے ہیں آنے پر۔ سمجھا کر بات کو۔"
اپنی ذمہ داریوں کے ہلکا ہو جانے کا احساس ہی راجو کو پرجوش کیے دے رہا تھا۔ "پھر ہماری شادی میں زیادہ دن نہیں لگیں گے ادھر بہنوں کی رخصتی ہوگی اور میں نے بیگم صاحبہ سے تیرا ہاتھ مانگا۔"
راجو کو پورا یقین تھا کہ اس بار وہ اس کی اداسی دور کرنے میں سو فیصد کامیاب ہو جائے گا۔
مگر ایسا نہیں تھا۔
وہ اب بھی اتنی ہی اداس تھی۔
"جلدی واپس آ جانا راجو دس دن تو بہت ہوتے ہیں۔" اس نے کہا بھی تو یہ۔
"ارے یوں گزرتے ہیں دس دن۔" روزی کے چہرے کے سامنے اس نے چٹکی بجائی۔ "نبیل صاحب کی مہربانی ہے جو۔" وہ ذرا رکا نبیل کے نام کے ساتھ "صاحب" لگاتے ہوئے اسے ابھی بھی عجیب سا ہی لگتا تھا۔ "اصل میں مالکوں سے چھٹی ملنا آسان تھوڑی ہے یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنے اچھے لوگوں کے پاس کام کر رہے ہیں۔ شادی کے بعد بھی ہم اس گھر کو نہیں چھوڑیں گے پیچھے کوارٹر لے لیں گے بیگم صاحب سے۔"
"نہیں!" ایک جھٹکے سے روزی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ "ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے اور کبھی اس شہر میں بھی واپس نہیں آئیں وعدہ کر راجو! یہاں نہیں رہے گا کہیں اور کام ڈھونڈے گا اس شہر سے بہت دور کہیں بھی۔"
راجو کو اس کے چہرے پر پھیلا خوف اس بار اتنا نمایاں دکھائی دیا تھا کہ نظر انداز کرنا مشکل ہو رہا تھا کیا ہو گیا ہے تجھے روزی کس سے ڈر رہی ہے کھل کر کیوں نہیں بتاتی ہے مجھے کسی نے کچھ کہا ہے سچ بتا۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ بڑی فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔
اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو تحفظ کے احساس کو گہرا کرتا تھا ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اپنی ہر فکر اس کے حوالے کر دینے کو دل کرتا تھا روزی بھی شاید کہہ ہی جاتی مگر۔۔۔
"اگر کسی نے کچھ ایسا ویسا کہا ہے تجھے تو خون پی جاؤں گا زندہ نہیں چھوڑوں گا اس کو تو بتا تو سہی۔" روزی نے ایک گہرا سانس لیا۔
"کسی نے کچھ نہیں کہا بے کار میں ہی جذباتی مت ہو جایا کر۔"
"پھر یہ سب کیا ہے کیا حال بنا لیا ہے تو نے اپنا کتنی بدل گئی ہے تو شاید اندازہ ہی نہیں ہے تجھے۔"
وہ تھوڑا سا مطمئن ہوا لیکن پھر بھی اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا۔
"ایسے ہی بس اب دل نہیں چاہتا پھر وہاں کوٹھی میں بیگم صاحب کے پاس سارا دن لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے اچھا نہیں لگتا کہ سج سنور کر لوگوں کے سامنے آؤں۔"
اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا کر وہ بڑے نارمل سے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
راجو بہت غور سے اس کے الفاظ اور چہرے کے تال میل کو دیکھ رہا تھا۔

یہ الفاظ یہ انداز روزی کا نہیں تھا پھر بھی اس سمجھ داری پر اسے بڑا پیار آیا۔
"اتنی عقل آ گئی ہے تجھے چل یہ بھی شکر ہے۔" وہ کھل کر ہنس پڑا۔ "اچھا اب جا بوا آ گئی ہیں سامنے کھڑی ہیں۔" اس نے اشارہ کیا۔
اس بار روزی نے بنا کچھ کہے وہاں سے دوڑ لگائی۔

☼ ☼ ☼

سلمان کے گھر چھوڑ کر جانے کی خبر شام کے اخبار کی سی سنسنی پھیلاتی ہوئی پورے خاندان میں نشر ہوئی۔ محلے والوں کے لیے تو سارا قصہ آنکھوں دیکھا ہی تھا لیکن خاندان والوں کی "سورس آف انفارمیشن" بھی غضب کی تھی۔
بات کی تصدیق کے لیے تو فون اس رات سے ہی آنے شروع ہو چکے تھے اگلے دن سے لوگ افسوس کرنے بھی آنے لگے۔
"کیسے چلا گیا تم سب کو چھوڑ کر۔"
"اکلوتا بیٹا اور وہ بھی ایسا خود غرض۔"
"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ اتنے پیسے والے لوگوں میں رشتے جوڑ کر آخر آدمی پچھتاتا ہی ہے۔"
"کیسا جادو کر دیا اس عورت نے۔ نہ شکل نہ صورت پتا نہیں تم لوگوں نے کیا دیکھا تھا۔"
وغیرہ وغیرہ۔
وہ سب تواتر سے اسی طرح کی باتیں کرتے اور قطعی بھولے رہتے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ یہیں اسی گھر میں بیٹھ کر سلمان اور گھر والوں کی خوش قسمتی کا پہاڑا پڑھا کرتے تھے اور زوبیہ جیسی بہو مل جانے کی دعا کیا کرتے تھے۔
زخم اتنا تازہ تھا کہ اس پر نمک برداشت کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔
آپا گل اور شاکرہ بیگم دونوں کی کئی سے جم کر لڑائی ہوئی اور کچھ سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ سو اب کچھ دنوں سے آنے جانے والوں کا سلسلہ بھی موقوف تھا۔
"خس کم جہاں پاک!" شاکرہ بیگم ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھیں۔
"یہ آپ زوبیہ بھابھی کے لیے کہہ رہی ہیں۔" انہوں نے جواباً ایک کھا جانے والی نگاہ زویا پر ڈالی جو ٹیلی فون بند کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔
"کس سے بات کر رہی تھیں اتنی دیر سے؟"
"ربیعہ سے۔" مختصر سا جواب دیتے ہوئے وہ لاؤنج سے نکل رہی تھی مگر ان کے ٹوکنے پر رکنا پڑا۔
"کیا ضرورت تھی منع بھی کیا ہے کہ ان لوگوں سے راہ و رسم مت رکھا کرو مگر تمہارے اور جویا کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ بھی۔"
وہ بری طرح جھنجلا گئیں جب سے دادی نے جویا کی بابت دوبارہ کہلوایا تھا انہیں معاذ کے گھر کے کسی فرد کا نام تک گوارا نہیں رہا تھا۔
"ان ہی کی نظر کھا گئی ہے میرے گھر کو یہی سب سے بڑے دشمن ہیں ہمارے ورنہ اچھی بھلی تھی زوبیہ شادی سے پہلے کیسی خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتی تھی مجھے تو پورا یقین ہے کہ اس روز دعوت میں ان ہی کے گھر زوبیہ کو ہمارے خلاف بھڑکایا گیا ہے۔"
"ان کے ہاں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے کسی کو کہ لوگوں کو بھڑکایا جائے اور زوبیہ بھابھی تو ویسے بھی سب کچھ

اپنی پلاننگ کے حساب سے کرتی آرہی ہیں اور آگے بھی کرتی رہیں گی۔"

زویا بے نیازی سے کہتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب جانے لگی۔

"اور امی!" وہیں کھڑے کھڑے وہ ان کی طرف مڑی۔ "سارے خاندان میں یہی ایک گھر ہے جس نے سلمان بھائی کی شادی سے لے کر اب تک کوئی ایک بات بھی آپ لوگوں سے اس بارے میں نہیں کی' یہاں تک کے ربیعہ کے ٹھکرائے جانے کا گلہ تک نہیں کیا' پھر بھی آپ کا دل صاف نہیں ہوتا۔" اپنی بات کہہ کر وہ تیزی سے اوپر چڑھتی چلی گئی' وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئیں۔

"یہ زویا کی زبان کچھ زیادہ ہی چل پڑی ہے' کل سے کہہ کر کسی دن ٹھیک کرواتی ہوں۔"

وہ شاید اسی وقت آپا گل کو فون کرنے کھڑی ہو جاتیں' مگر گیٹ پر گاڑی کی آواز سن کر ارادہ موقوف کیا' اظہار صاحب آج آفس سے وقت سے پہلے واپس آئے تھے۔

"خیریت تو ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

جب سے سلمان اور زوبیہ گئے تھے' وہ بہت خاموش رہنے لگے تھے' گھر میں ہوتے تو سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتے۔

مگر اس وقت وہ سیدھے کمرے میں جانے کے بجائے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

"کیا ہوا' بتاؤ تو سہی یوں چپ کر کے کیوں بیٹھ گئے ہو' کوئی اور بات ہو گئی کیا؟"

ان کی واویلا مچانے کی عادت بہت پختہ تھی۔ اظہار صاحب نے بمشکل ہی اپنا غصہ ضبط کیا۔

"سلمان کا فون آیا تھا؟"

"نہیں۔"

"تو تم کر لیتیں۔"

"کیا تھا' مگر وہ جلدی میں تھا' زیادہ بات نہیں ہو سکی۔" وہ ان کے سوالوں سے کوئی نتیجہ تو اخذ نہیں کر سکی تھیں' لیکن پریشانی میں کمی آنے لگی تھی۔

"پیسوں کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا' تنخواہ تو مل گئی ہو گی اسے اب تک۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں کی اس نے' اور کیا پتا ابھی تنخواہ ملی ہی نہیں ہو اسے۔"

"نہیں ملی تو مانگ لے اپنے سسر سے' اسے فون کر کے کہو کہ مجھے لون کی قسط جمع کرانی ہے دو دن میں' وہ اور کچھ نہیں تو ہمیں اپنی تنخواہ میں سے پیسے تو دے سکتا ہے۔" وہ تلخ ہو رہے تھے۔

شاکرہ بیگم نے پہلی بار ان کے منہ سے "لون" کا لفظ سنا تھا' ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگیں۔

"کون سا قرضہ لے لیا تم نے' پہلے تو کوئی ذکر نہیں کیا؟"

"یہ لاکھوں روپیہ جو ابھی تم خرچ کر کے بیٹھی ہو' وہ کہیں سے تو آیا تھا' گھر پر قرضہ لیا تھا میں نے' اسی کی قسط پچھلے دو ماہ سے نہیں دے سکا ہوں۔"

"گھر گروی رکھ دیا؟" شاکرہ بیگم کو بڑا گہرا صدمہ پہنچا۔ ذرا دیر کو تو سلمان' زوبیہ' تنخواہ' کمال خاندان سب ہی کچھ کہیں پیچھے چلا گیا۔ "بینک میں اتنا پیسہ رکھا تھا' پھر تمہاری اتنی کھلی آمدنی' کوئی کمی تو نہیں تھی' جو تم نے اتنا اچھا گھر داؤ پر لگا دیا۔" ان کا دل سچ مچ بیٹھا جا رہا تھا۔

"قارون کا خزانہ بھی کم پڑتا ہے شاکرہ بیگم ایسے بے تکے خرچوں میں' یاد ہے کتنے لاکھ تو زوبیہ کو دلوائے تم نے پھر اتنا بھاری بھر کم ولیمہ' اس سے پہلے کی جانے والی شاپنگ' جسے بعد میں یوں ہی فضول قرار دے دیا تھا' نمائش کا جنون سوار تھا تم سب پر۔"

وہ غصہ میں آئے تو بولتے چلے گئے۔ "اور کلرک ہوں سرکاری محکمے میں' سارے عیش اوپر کی آمدنی سے کروائے ہیں تم لوگوں کو' وہ تو یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں' ورنہ جس دن کوئی اچھی آڈٹ ٹیم آگئی تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے' کوئی تو اچھی بات منہ سے نکال لو۔"

شاکرہ بیگم کو ان کی صاف گوئی بری لگی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیسے خرچ کرتے ہوئے وہ کب کا بھول چکی تھیں کہ ان کے شوہر کی جائز آمدنی کتنی محدود ہے' اپنے طور وہ اس درمیانہ درجے کے محکمے اور خاندان میں سب سے ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔

"کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے' انسان کو یوں ہی بنا سوچے سمجھے بھی نہیں بولنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' تم سلمان کو ذرا فون کرو ابھی' کہو آ کر مل جائے اور پیسے بھی ساتھ لیتا آئے۔"

اظہار صاحب نے کہا تو وہ بنا کچھ کہے فون کرنے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

دل بے حد بھاری ہو رہا تھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ ابھی تک اس کے سسر نے اسے کوئی تنخواہ نہیں دی ہے' اور مانگتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔" خلاف توقع وہ جلدی واپس آئی تھیں۔

"بکواس کرتا ہے۔" وہ یکدم بڑے زور سے چلائے۔ "وہ انتہائی خود غرض اور گھٹیا ثابت ہوا ہے' اس نے ہم سے جان چھڑائی ہے شاکرہ! اب ہم اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ اپنی بیوی اور سسر کی خوشنودی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔" ان کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔

"میں اس سے پھر بات کروں گی' تسلی کے ساتھ' تم اتنی ٹینشن مت لو۔ وہ کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔"

شاکرہ چچی کا لہجہ پست تھا' جیسے انہیں خود بھی اپنے کہے الفاظ پر یقین نہ ہو۔ "یا پھر میں گل سے بات کرتی ہوں' فی الحال اس سے لے لیتے ہیں' بعد میں جب سلمان دے گا تو پھر اس کو واپس کر دیں گے۔"

"نہیں دے گی وہ بھی۔" انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"وہ دونوں بہن بھائی ایک سی فطرت کے ہیں' میری بات پر یقین نہ ہو تو پوچھ کر دیکھ لو' تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔"

شاکرہ بیگم چپ چاپ ان کی شکل دیکھے گئیں۔ سلمان اور گل۔

دونوں ہی پر انہیں خود اپنے سے زیادہ بھروسہ تھا' سلمان بدل سکتا تھا' بیٹا تھا' مگر گل بیٹی تھی' نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے خود کو تسلی دینا چاہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"امی!" ربیعہ کمرے میں چائے کا کپ لیے داخل ہو رہی تھی' انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دیں۔

"کتنے گھنٹے ہو گئے ہیں' اب بس کر دیں' صبح سے مشین پر بیٹھی ہوئی ہیں۔"

چائے کا کپ ان کے قریب رکھتے ہوئے وہ پیچھے کھڑے ہو کر ان کے کندھے دبانے لگی۔

"شادی کا کام ہے' کل لازمی واپس کرنا ہے' فارغ ہو جاؤں گی تو ان شاء اللہ ایک دو دن آرام ہی کروں گی۔"

"بس ایک دو دن۔" وہ خوش ہونے کے بجائے اداس ہوئی۔ "آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ بھی دوسری عورتوں کی طرح آرام کریں' خاندان میں ملیں جلیں' شاپنگ کریں دل کھول کر۔"

"سب کچھ ہوگا' ان شاء اللہ' بس ذرا معاذ کو جاب مل جائے' پھر یہی سب کرنا ہے' جو تم کہہ رہی ہو۔" مشین میں لگے کپڑے کا دھاگہ توڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولیں۔ "آپ آگے تو آرام ہی آرام ہے۔ ایک دفعہ معاذ کو جاب مل گئی تو پھر وہ کہاں کام کرنے دے گا مجھے یا تمہارے ابا کو۔"
معاذ کی تمام لاپروائی کے باوجود گھر کے تینوں بڑے اس کی طرف سے سخت خوش فہمی کا شکار تھے۔
ربیعہ چپ چاپ ان کے کندھے دباتی رہی۔
"بہت آرام ملا' اب بس۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔
"امی! آپ کو لگتا ہے کہ معاذ جاب ڈھونڈ رہا ہے؟ کسی بھی وقت وہ کوئی ایسا ذکر نہیں کرتا' جس سے پتا چلے کہ وہ جاب کے معاملے میں کتنا سیریس ہے۔"
کوئی فائدہ نہیں تھا' پھر بھی وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔
"ڈھونڈ رہا ہے' لیکن ملے تو سہی' میرا بچہ لاپروا ضرور ہے' لیکن بے حس نہیں ہے' وقت آئے گا تو وہ ہم سب کے لیے بہت کچھ کرے گا۔"
"اظہار صاحب اتنا انتظار نہیں کریں گے' جویا کے ویسے بھی بہت رشتے آتے ہیں۔" اس کی فکرمندی برقرار تھی۔
امی خاموشی سے چائے گھونٹ گھونٹ کرکے پیتی رہیں' ربیعہ منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔
"صرف دادی کے کوشش کرنے سے کیا ہوگا' نہ تو معاذ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی آپ اور ابا ہی اظہار چچا پر کوئی زور ڈالتے ہیں۔" وہ تھوڑا سا پریشر بڑھا رہی تھی' تب ہی ایک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا کپ ایک طرف رکھا۔
"سچ بات تو یہ بیٹا! کہ میں اب اس رشتے کے حق میں ہی نہیں ہوں۔ اماں کی خوشی کی وجہ سے مخالفت بھی نہیں کر رہی' لیکن اظہار بھائی اور شاکرہ بھابھی سے تعلق جوڑنا' ایک مستقل درد سر مول لینا ہے۔ دونوں احساس برتری کے نشے میں چور ہیں' اور جہاں عزت نہ ہو' وہاں کسی محبت اور لحاظ کا بھی کیا سوال اٹھتا ہے۔"
"جویا تو بہت اچھی ہے امی۔"
"تم بھی بہت اچھی تھیں۔" انہوں نے بمشکل ہی خود کو یہ کہنے سے روکا۔
"اور پھر معاذ خود بھی تو اسے پسند کرتا ہے۔" ان کی لاتعلقی پر ربیعہ کو مایوسی ہوئی تھی۔
"پسند کرتا ہے تو ان لوگوں کے معیار کے مطابق خود کو ڈھال لے' اس کی خاطر ہم اظہار بھائی کے گھرانے کو برداشت کرنے کی کوشش کرلیں گے۔"
وہ دوبارہ مشین میں لگے کپڑے کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں' اور چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔
ربیعہ کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ اب اپنی اس دیرینہ خواہش سے دستبردار ہو چکی ہیں۔
"ہم جیسے بھی ہیں' اپنے حالات پر قانع اور شاکر ہیں' انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمیں حقارت سے دیکھیں۔"
انہیں اس روز کی اپنے گیٹ پر اظہار چچا سے مڈبھیڑ یاد تھی' اور ان کی طنزیہ مسکراہٹ اور دل توڑتے جملے بھی۔
"اس میں جویا کا کیا قصور ہے امی!" ربیعہ کی آواز نیچی تھی۔
"سزا ہمیشہ قصوروار کو نہیں ملتی ہے' کبھی کبھی انسان کو دوسروں کا کیا ہوا بھی بھگتنا پڑ جاتا ہے۔"
"لیکن اگر فرض کریں' اظہار چچا مان گئے' تو پھر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

کم از کم امید تو رکھی جا سکتی تھی۔
"وہ کبھی نہیں مانیں گے۔"
موٹر کی گھرر گھرر میں ان کی آواز دب رہی تھی۔ ربیعہ چائے کا خالی کپ اٹھا کر باہر چلی آئی۔
سامنے تیز قدموں سے چلتا ہوا معاذ اسی طرف آرہا تھا۔
"امی کمرے میں ہی ہیں نا؟" ربیعہ سے کنفرم کرتا ہوا' وہ سیدھا اندر چلا گیا' اس کے ہاتھ میں دبے چند بڑے نوٹ اسے دکھائی دے گئے تھے۔
"امی! تھوڑے پیسے دیجیے گا مجھے' آپ کو مل تو گئے ہوں گے' بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔" ربیعہ کو اس کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔
"یہ اور ان کے ضروری کام۔" وہ کوفت سے بڑبڑائی۔
آج اس نے' خلاف عادت معاذ کو نصیحت کرنے کے لیے یہاں رکنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ دادی اپنے کمرے میں جیسے اس کی منتظر تھیں۔
"اے ربیعہ! ذرا اظہار کے گھر کا نمبر تو ملا دو بیٹا! اتنے دن ہو گئے' آیا تک نہیں۔"
"نہیں ملی ہوگی فرصت' لوگوں کو بہت کام ہوتے ہیں دادی۔" وہ سخت بےزار ہو رہی تھی۔
"کام تو اتنے ہی ہیں' بس وقت میں سے برکت ختم ہوگئی' ورنہ پہلے بھی یہی چوبیں گھنٹے تھے' کام بھی ہو جاتے تھے' ملنا ملانا بھی اور سکون سے عبادت بھی کرلیتے تھے' اب تو سارا دن بھاگ دوڑ ہے بس۔"
وہ چند لمحے یوں ہی اظہار خیال کیے گئیں۔
ربیعہ کا خیال تھا کہ اسی طرح شاید ان کے ذہن سے فون والی بات اتر جائے' لیکن ایسا نہیں ہوا۔
"تم فون ملا کر دے رہی ہو یا نہیں۔" اس بار وہ خاصی خفا تھیں۔ ربیعہ کو اٹھنا ہی پڑا۔
"کیا بات کریں گی؟"
"خیر خیریت پوچھوں گی' اتنا تعلق تو رہنا ہی چاہیے' کل کو جب خیر سے معاذ کی شادی ہوگی تو...!"
"یہاں میرے اور آپ کے علاوہ کسی کو فکر نہیں ہے۔ خود معاذ کا رویہ دیکھا ہے' مجال ہے جو ذرا سیریس ہو رہا ہو۔"
وہ بے حد بددل ہو رہی تھی' امی کی ناپسندیدگی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا تھا' دادی کو سخت برا لگ جاتا تھا۔
"اظہار حتمی جواب دیں' پھر معاذ کو بتا دیں گی' تم دیکھنا وہ کتنا خوش ہوگا' جویا اسے شروع سے پسند ہے۔"
"کمال ہے' آپ یہ اندازے بھی لگا لیتی ہیں۔" دادی کی بات پر وہ ہنس پڑی۔
"کسی لڑکے لڑکی کی پسند کا اندازہ لگانا کون سا مشکل کام ہے' خود ہی ظاہر ہو جاتا ہے' تم نمبر ملاؤ۔"
ربیعہ نے اس بار بنا مزید کچھ کہے نمبر ڈائل کرکے فون دادی کو تھمایا اور خود باہر والے برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔
سامنے احاطے میں شام پوری طرح اتر چکی تھی۔ فضا میں سبزے کی مہک تھی' اور بیرونی دیوار پوری کی پوری سفید بوگن ویلیا سے تقریباً" ڈھکتی جا رہی تھی۔
"اور کچھ نہیں تو دیواروں کا اکھڑا ہوا پلستر ہی چھپا رہتا ہے۔" اس نے ان پر نگاہ جماتے ہوئے سوچا۔
گھر میں کتنے ہی کام توجہ طلب تھے۔
رنگ اڑی دیواریں۔
اپنی مدت پوری کرتا ہوا فرنیچر۔

آئے دن خراب ہوا ریفریجریٹر۔
اور بھی بہت کچھ... صرف وہی تھی جس کا دل گھر کی حالت زار پر کڑھتا تھا۔
باقی لوگ اتنے قانع تھے کہ انہیں ان سب باتوں سے کب فرق پڑنے والا تھا۔
تھوڑا سا احساس ذمہ داری اگر معاذ ہی میں ہوتا تو بھی صورت حال خاصی بہتر ہوتی، مگر وہ تو خود اپنے لیے بھی کچھ نہ کرنے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔
ایک کے بعد ایک ذہن میں کئی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔
کوئی اچھا وقت کبھی آنا بھی تھا، یا بس لمحہ لمحہ گزرتی زندگی صبر و قناعت کا پہاڑا پڑھتے ہوئے آخر کار اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائے گی۔
کبھی کبھی ساری خوش امیدی یوں ہی ہاتھ چھڑا کر بھاگ لیتی تھی، دادی پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔
"اتنی جلدی!" اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
"ہاں، وہ اظہار گھر پر نہیں تھا۔"
دادی مختصر سا جواب دیتے ہوئے تھوڑی سی شرمندہ ہوئیں، انہوں نے خود اظہار صاحب کی آواز ریسیور میں سنی تھی، مگر جو شاکرہ کہہ رہی تھیں اسے جھٹلانا بھی ناممکن تھا۔
آپا گل نے پیسوں کے معاملے میں تو حسب توقع، معذرت کرلی تھی۔
لیکن بقول خود، وہ اپنے فرائض سے غافل ہرگز نہیں تھیں، سو پچھلے ایک ہفتے میں وہ جویا کے لیے ایک کے بعد ایک تین رشتے لے کر آئی تھیں، وہ بھی بنا کسی پیشگی اطلاع کے۔
جویا گھر پر ہی ملی اور ہر بار دھرلی گئی۔
گھر آئے اچانک مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کرنی پڑی، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر ان کے الٹے سیدھے سوالوں کے جواب بھی دینے پڑے۔
ان کا طریقہ کار اب اچھی طرح سمجھ میں آرہا تھا، پہلے سے اطلاع کرتی تھیں تو جویا پہلے ہی مورچہ بند ہو کر بیٹھ جاتی تھی، یا تو کمرے سے ہی نہ نکلتی یا پھر کسی سہیلی یا کام کا بہانا بنا کر زویا کے ساتھ چل پڑتی، لیکن اب ایسا نہیں رہا تھا۔
وہ کتنا بھی جھنجلاتی، کام ان کے حسب منشاء ہی ہو جاتا۔
"مجھے تو پورا یقین ہے کہ اسی طرح کسی دن، وہ تمہارے ہاتھ میں سلامی کی رقم بھی پکڑا دیں گی کسی سے، بات پکی کام ختم۔"
زویا بڑے معتبر انداز میں اس کے سامنے بیٹھی پیشن گوئی کر رہی تھی۔
"اللہ نہ کرے۔" جویا نے بے حد برا مان کر اس کی طرف دیکھا۔
"ایسا ہی ہوگا، اور سچ پوچھو تو اس میں غلط بھی کیا ہے، بی ایس سی کے بعد، بظاہر تمہاری شادی میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، سو ہوتی ہے تو ہو جانے دو۔"
وہ اتنی بے غرضی سے کہہ رہی تھی کہ جویا کو لگا جیسے وہ کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہے۔
"اے، ہیلو!" اس نے اپنا ہاتھ زویا کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔
"یہ تم مجھے کہہ رہی ہو؟"
"ظاہر ہے یہاں اور کون ہے۔" اس کا انداز بے نیازی بدستور تھا، "پھر وہ تینوں رشتے بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھے تو شکر ہے کہ تم ان تینوں کو پسند آگئیں، ورنہ آج کل تو لڑکوں کے گھر والے لڑکوں سے زیادہ نخرے دکھاتے ہیں لڑکی

پسند کرنے میں۔"

یہ جملہ قطعی آپا گل کا تھا' جسے وہ کوٹ کر رہی تھی۔

"شرم کرو زویا! ایک آپا گل کم ہیں میرے لیے' جو تم بھی۔۔۔" پورا ہفتہ سخت ٹینشن جھیل کر اس کے اعصاب اب تھک چکے تھے۔

زویا کو لگا جیسے اب وہ رونے ہی والی ہے۔

"آپا گل تمہاری دشمن نہیں ہیں' اپنے طور پر جو کر رہی ہیں ٹھیک کر رہی ہیں' گھر کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور سلمان بھائی سے کوئی امید نہیں ہے تو کم از کم وہ تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کی کوشش تو کر رہی ہیں۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ اور اس کے لہجے میں آپا گل کے لیے کوئی طنز یا خفگی نہیں جھلک رہی تھی۔

"تو اب زویا بھی۔۔۔" جویا کا سوچ کر ہی دل بیٹھنے لگا۔

"گھر میں اول و آخر ایک ہی حمایتی دستیاب تھا' سو اب وہ بھی ہاتھ سے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔

"کسی کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' اور میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی بس۔"

"کسی سے نہیں کروگی' یا معاذ بھائی کے علاوہ کسی سے نہیں کروگی۔"

زویا کی نگاہ میں بڑی اجنبی سی چبھن تھی۔

"ٹھیک ہے' یہی سمجھ لو۔" ذرا سا رخ موڑتے ہوئے' وہ ہلکے سے بولی۔

"سمجھ لیا۔" "اب یہی بات تم معاذ بھائی کو بھی سمجھا دو' تاکہ ان کا پوائنٹ آف ویو بھی پوری طرح کلیر ہو جائے تم پر' یہ انتظار ختم تو ہو آخر۔"

جویا نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آج وہ آخر کیسی باتیں کر رہی تھی' جانتے بوجھتے بھی کہ وہ معاذ سے۔۔۔"

"بہت سی باتیں اب اچھی طرح سمجھ میں آنے لگی ہیں جویا! آپا گل کا طریقہ غلط ہو سکتا ہے' مگر وہ میرا یا تمہارا برا نہیں چاہ سکتیں' جو حالات چل رہے ہیں' ان میں اگر وہ تمہاری شادی کی فکر کر رہی ہیں تو کیا غلط ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی' لیکن ان سے کہہ دو کہ وہ میری "فکر" نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے' پھر اس سے بھی کہو' جس کی فکر میں تم گھل رہی ہو۔ تم معاذ بھائی سے ایک بار بات کیوں نہیں کرتی ہو جویا! اور کچھ نہیں تو یہ کنفیوژن تو دور ہو۔"

جوبات زویا کو بہت دن سے چبھ رہی تھی' آج صاف صاف کہنے سے خود کو نہیں روک پا رہی تھی۔

"میں کیا بات کر سکتی ہوں' میری اس سے کون سی ایسی بے تکلفی ہے۔" اپنے دفاع کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

"تم بات نہیں کر سکتی ہو' اور خود انہیں ساری زندگی خیال نہیں آئے گا' اور جو کبھی یہ نیک کام کرنے چلے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم سے ہی کریں گے۔"

جویا کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

کیسی عجیب بات کی تھی زویا نے۔

ناقابل یقین۔

ایسا کیسے ممکن تھا بھلا۔

...اس سے بات نہیں کرتا' اس کی طرف بطور خاص متوجہ بھی نہیں ہوتا' پھر بھی اپنائیت کا ایک گہرا احساس ...سے اپنے اور معاذ کے بیچ ہمیشہ ہی شدت کے ساتھ محسوس ہوا تھا۔

...احساس' اس کا یقین تھا۔

...میں تم سے چھوٹی ہوں جویا! لیکن شاید تم سے زیادہ سمجھ دار۔" زویا اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔ "معاذ ...اچھے ہیں۔ یقیناً" "لیکن کوئی ایک بات بھی کبھی ان کی طرف سے ایسی نہیں ہوئی' جو اس بات کا احساس ...انہیں بھی تمہاری پروا ہے' یہی دیکھ لو کہ اب تک وہ ایک ڈھنگ کی نوکری بھی نہیں ڈھونڈ پائے۔"

...لہجہ اب بہت نرم ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جویا کو تکلیف پہنچانے کا سبب بن رہی ہے۔

...نوکری ڈھونڈ رہا ہے زویا! لیکن اس کی قسمت میں شاید جدوجہد زیادہ لکھی گئی ہے۔"

...قسمت پر الزام رکھ دینا سب سے آسان راہ فرار ہے۔" وہ شاید معاذ کے لیے ہر رعایت ختم کر چکی تھی۔ ...آنکھوں سے دنیا کو دیکھو' صرف خواب دیکھنے سے کام نہیں چلتا' تعبیر پانے کے لیے کوشش بھی ضروری ہے ...ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب کوئی دیکھتا ہے اور تعبیر کسی اور کے حصے میں آجاتی ہے۔"

"خدا کے لیے زویا!" اس بار جویا نے اس کے آگے بے ساختہ ہی ہاتھ جوڑ دیے "ایسی باتیں تو منہ سے ...نہ۔"

...نیچے سے زور زور سے سلمان کے بولنے کی آواز پر وہ دونوں ایک ساتھ ہی چونکی تھیں۔

...خیر تو ہے' آج یہ کیسے راستہ بھول گئے۔" زویا پہلے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

...لیکن تم جتنی جلد ممکن ہو سکے' معاذ بھائی کے ارادے جاننے کی کوشش کرو' یہی تمہارے لیے بہتر ...اس نے سیڑھیاں اترنے سے پہلے' ایک بار پھر مڑ کر یاد دہانی کروائی' اور پھر تیزی سے نیچے چلی گئی۔

...بات کرے وہ معاذ سے؟" ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے آگے آکھڑا ہوا۔

...کہ وہ کب اسے اس قابل سمجھے گا کہ اپنی نظر کرم سے نوازے گا دھت"۔

...بھی بڑا توہین آمیز سا تھا۔

...حالانکہ اس نے اپنی فیلنگ کو بہت چھپا کر بھی نہیں رکھا ہوا تھا' پھر بھی اس طرح براہ راست پوچھنا' اس نے ...نفی میں سر ہلایا۔

...یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا' لیکن جو کچھ نتائج زویا ابھی ابھی اخذ کر کے گئی تھی۔ اگر سچ ثابت ہوتا تھے۔ تو پھر ...مرنے کا کون سا جواز باقی رہ جاتا تھا۔

...گم صم سی سوچے گئی۔ نیچے سے آتی آوازوں میں شدت آرہی تھی۔

...سلمان کبھی کبھی آتا تھا' اور جب بھی آتا' ایک لمبی بحث ضرور ہی بھگتا کر جاتا تھا۔

...سوالات اور جوابات کا ایک لاحاصل سلسلہ شروع ہوتا۔ اور پھر کئی دن کی خاموشی چھا جاتی' فی الحال لون کی قسط ...گھر کے کڑے بیچ کر ادا کی جا چکی تھی لیکن اب تک سب ہی جان چکے تھے کہ وہ اپنی کوئی ذمہ داری نہیں ...نہ مالی' نہ اخلاقی۔

...سب ہی والدین اولاد پر خرچ کرتے ہیں' آپ نے کون سا احسان کیا ہے' جو بار بار مجھے خرچ گنوانے کھڑی ...ہیں۔" نیچے سے اس کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

...کوئی اور وقت ہوتا تو وہ شاید اب تک اٹھ کر نیچے جا بھی چکی ہوتی' مگر زویا کے بخشے ہوئے خدشات دل پر بھاری ...طرح دھرے تھے۔

...چاہے یا نہ چاہے لیکن وقت آگیا تھا کہ معاذ کے ارادوں کے بارے میں جان ہی لیا جائے۔ جویا نے بے چینی

کے ساتھ پہلو بدلا۔

☼ ☼ ☼

کیمبرج اسکول کے احاطے میں بڑی رونق تھی۔ سارا دن دل بھر کر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ سو فضا میں مٹی کی دل فریب خوشبو بس رہی تھی' ترتیب سے رکھی کرسیاں اور چھوٹا سا خوب صورتی کے ساتھ سجایا ہوا اسٹیج ساری محنت ان ہی بچوں کی تھی جنہوں نے یہاں سے ابتدائی اور لکھنا پڑھنا سیکھ کر آج فارغ ہو چکے تھے۔

ان تھک محنت میں گزرنے والے شب و روز میں سے کچھ وقت نکال کر انہوں نے بڑی ہمت سے یہ کام مکمل کیا تھا۔ وہ سب آج بھی وہی کام کر رہے تھے' جو پہلے کر رہے تھے' ٹریفک سگنلز کے درمیان بھاگ کر اخبار اور پھول بیچنا' گیراج اور ورکشاپ میں کام کرنا' دکانوں' بار کیٹوں میں صفائی کرنا اور اسی نوعیت کے دوسرے کام۔ مگر ایک خاموش سی تبدیلی اپنا جادو جگانے لگی تھی۔

"ان بچوں کے چہروں پر فخر و اعتماد دیکھ رہے ہو ریحان؟ یاد ہے جب پہلے روز یہ لوگ آئے تھے تو کتنے گھبرا رہے تھے۔ انہیں بولنے پر مجبور کرنا پڑ رہا تھا' اپنے بارے میں بات کرنے سے بھی گھبراتے تھے اور آج دیکھو۔"

معاذ نے اپنے قریب کھڑے ریحان سے کہا تو وہ بھی ہلکے سے ہنس پڑا۔

"شکر ہے' ایک چھوٹا سا کام ہم نے بخیر و خوبی انجام دیا' اب کم از کم یہ لوگ آئندہ زندگی میں اپنے بارے میں بہتر طور پر سوچنے کے قابل تو ہوں گے' کچھ تو بہت سنجیدگی سے' آگے پرائمری تعلیم مکمل کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔" وہ سب بے حد خوش تھے۔

اپنے مختصر سے دائرہ کار میں انہوں نے آخر کچھ تو کر دکھایا ہی تھا۔

آگے امید کی لو اور بھی تیز ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

"اب دیکھو خدا کرے کچھ بات بن جائے۔ زرتاج بیگم چاہیں تو ان بچوں کو خاصی مدد دے سکتی ہیں۔ تعلیم کے حوالے سے آج کل بڑی سرگرم ہیں۔"

ریحان کی خواہش پر آج زرتاج بیگم کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا' اسے یقین تھا کہ شہرت کے شوق میں' وہ کچھ نہ کچھ ضرور ہی کر دیں گی۔ معاذ تھوڑا سا خائف تھا۔

کوٹھ جمالی والے اسکول سے جڑی داستانیں' ابا کی وجہ سے اس کے زیادہ علم میں رہی تھیں' مگر زرتاج بیگم کے پبلسٹی والے شوق سے بھی اچھی طرح واقف تھا' سو اگر اسی بہانے ان کے ہاتھ سے کوئی بھلا کام ہو سکتا تھا تو اس سے اچھی بات کیا تھی۔

"ابھی تک آئی نہیں ہیں' گھر سے تو کب کی نکل چکی ہیں۔" ریحان گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں میرا خیال ہے کہ بس۔" اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

"ساجد!" کرسیوں کی لائن کے سب سے آخری سرے کے پاس کھڑے ساجد کو اس نے بڑی محبت سے گلے لگایا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم آ گئے' اتنے عرصے میں ایک بار ملنے تک نہیں آئے' ہم سب کتنا انتظار کرتے رہے۔"

ساجد کے ہونٹوں پر ہلکی سی کپکپاہٹ ابھری۔

بھلا وہ کیسے معاذ بھائی کو بتائے کہ اگر وہ یہاں آتا تو اس کے ابا کے جنگلی دوست' معاذ بھائی کو اور کتنا نقصان پہنچا سکتے تھے۔

دل ہی دل میں اس نے اپنے ابا کی دھمکیوں کو یاد کیا اور تھوڑا سا اور سہم گیا۔

[معل]وم نہیں اس وقت بھی اس نے یہاں آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی تھی' ایسی غلطی جو معاذ کو بھائی کو نقصان پہنچا [illegible]

[ار]ے نہیں' کچھ نہیں ہوتا' مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میرا پیغام مل گیا تھا۔" معاذ اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔

[مج]ھے زری باجی نے چپکے سے بتا دیا تھا کہ آپ وہاں آئے تھے۔"

[ا]و وہ سیدھی سادی سی لڑکی یاد آئی جس کا نام بھی اسے ابھی ابھی پتا چلا تھا۔

[م]یری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دینا۔ چلو اب اپنے دوستوں سے مل لو' اور یاد رکھنا اس بار تمہیں بھی ان [کے سا]تھ ہونا ہے۔"

[سارے] بچے' ساجد کو دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو رہے تھے' معاذ انہیں وہیں چھوڑ کر آگے کی طرف آیا جہاں [ریحان] چند دوستوں کے ساتھ زرتاج بیگم کا منتظر تھا۔

[س]اجد کو تم نہ بلاتے تو اچھا ہوتا' ایک تو ویسے بھی اس کا احساس محرومی بڑھے گا اور پھر اس کے پیچھے بڑے [خطرن]اک لوگ ہیں۔" ریحان فکر مندی سے کہہ رہا تھا' اسے معاذ کا ہفتوں ہسپتال میں پڑے رہنا بالکل بھی نہیں [بھولا] تھا۔

"[م]یں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم اب بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اور دیکھنا کبھی نہ کبھی وہ بھی ہمارے ساتھ [ہوگا۔]"

"[مج]ھے نہیں لگتا۔" ریحان کی نگاہیں دور سے بھی ساجد پر ہی جمی رہی تھیں۔ "ویسے یہ لڑکا کچھ زیادہ ہی کمزور [ہو] گیا ہے معاذ! یا پھر مجھے ہی لگ رہا ہے۔"

"[یہ]اں ان بچوں میں کون تندرست ہے یار! تھوڑے سے پیسوں کے لیے بارہ چودہ گھنٹے پلوشن زدہ ماحول میں [رہ]تے ہیں' صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔"

[س]امنے زرتاج بیگم کی گاڑی آ کر رک رہی تھی' وہ دونوں ہی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے' استقبال کے لیے [کھڑ]ے ہونے والے بچوں نے جھٹ پٹ اپنی لائن بنائی' اور جن کے ذمہ اسٹیج کو سنبھالنا تھا' وہ دوڑتے ہوئے ادھر [چلے] گئے۔

[س]ب کچھ کسی سیٹ کی طرح تیار تھا۔

[ص]رف ساجد ہی تھا جو اکیلا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ تب ہی معاذ نے آواز دے کر اسے استقبالیہ میں کھڑے بچوں [کے] ساتھ آ کر کھڑا ہونے کو کہا تو وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے ساتھ آملا۔

[ز]رتاج سب کے ساتھ ملتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے نام و مقام سے واقف نہیں تھا' پھر بھی یہ [ا]ن کے لیے بھی دلچسپی کا سبب بن رہا تھا۔

[و]ہ محویت سے اس شان دار عورت کو تک رہا تھا۔ تب ہی زرتاج کے عقب میں نظر آتے چہرے پر اس کی [نگاہ] پڑی۔

"[معا]ذ بھائی!" اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ سب نے بخوبی سنی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

سدرۃ سحر عمران

اونچی نیچی پگڈنڈیوں پہ سج سج کر قدم رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اطراف کے کھلیانوں میں تندہی سے کپاس چننے میں مصروف محنت کش عورتوں کو دیکھتی اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ تپتے سورج کے تلخ سائبان میں زندگی کی حرارت کا سامان کرتی عورتیں راز و نیاز سے بے نیاز سرعت سے کام نبٹانے میں جتی ہوئی تھیں۔ ان دنوں بھوک اور مفلسی کا احساس سوا ہو جاتا تھا۔ اس لیے زیادہ کی طلب وقتی طور پر اپنی ذات سے بھی غافل سا کر دیتی تھی۔ اس نے منہ ہی منہ میں شکر کا کلمہ پڑھا کہ کسی نے اس کی موجودگی کو محسوس نہ کیا تھا، ورنہ سلونے رخساروں پہ چھلکتی سرخی تو اپنے افسانے کی گواہی خود دی تھی۔ مٹھی میں دبے اس مختصر سے کاغذ کو متاعِ جاں کی طرح سمیٹتے ہوئے اس نے اوڑھنی کو ہوا کے زور پہ اڑنے سے بچایا تھا۔

"محبت اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے میراں! اس کے بنا تو زندگی ایک تاریک صحرا کی طرح ہے۔ میں نے زندگی کو بہت پرکھا ہے۔ بڑا حسن دیکھا ہے شہر میں۔ گاؤں میں پر محبت پہلی واری دیکھی ہے۔ تو تو سراپا محبت ہے۔ ایک اچھے بھلے انسان کو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھلا مجھے کہاں چین آتا تھا کہیں اور اب تو تیری محبت نے ایسا باندھا ہے کہ یہاں سے جانے کو کہیں دل ہی نہیں کرتا۔ حالانکہ ارشد چاچو کب سے بلا رہے ہیں مجھے اپنے پاس۔ پر تو ہے نا یہاں، وہاں تو بس یا ہیں اور تنہائی ہے۔"

شدید ملال تھا اس کے لہجے میں۔ وہ جو سراپا محبت تھی۔ اس کی یاسیت زدہ باتوں پر اس سے زبان اداس ہو گئی، یہ بھی نہ بتا سکی کہ میں نے بھی تو تجھ سے سیکھا ہے یہ لفظ "محبت"

ورنہ اپنے تین کمروں کے مختصر سے مکان میں سیلن زدہ دیواروں پر خواب تراشتے ہوئے کب سوچا تھا کہ کبھی یہ دل بھی طلب گار محبت ہو جائے گا۔ اپنے سات عدد بہن بھائیوں کی فرمائشیں پوری کرتے ان کے لاڈ پیار اٹھاتے، دمے کی مریض ماں کی خدمت میں ہلکان غصہ ور باپ کی جھڑکیاں کھاتے، کب دھڑکنوں کے سرتال پہ توجہ دی تھی۔ کب اتنی فرصت ملی کہ دھندلے آئینے میں اپنے نقوش کی خوب صورتی جانچتی پھرے؟ کب غزال آنکھوں کی ساحری کا شعور تھا۔ کب گھنی زلفوں کو محنت سے سنوارا تھا۔ وہ جو اس کے ایک ایک نقش پہ دیوان لکھنے کا دعوا کرتا تھا، اسے کیا خبر تھی کہ بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔ آگہی کے در وا ہو جائیں تو تلخیاں دکھوں کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ سچائی اشک بن جاتی ہے۔ راز منکشف ہو جائے تو اپنے آپ سے خوف آنے لگتا ہے۔

ہاں... کتنی عظیم نعمت ہے بے خبری۔

اس کے قدموں کی رفتار میں تیزی آئی تھی۔ کرم بخش ڈیرے سے آنے والا تھا یا شاید آ بھی چکا ہو۔ خوف کی ایک تیز لہر ریڑھ کی ہڈی سے سرسراتی ہوئی زرد پتے کی طرح کانپتے دل تک آئی تھی۔ آج سر شام سے کس قدر دور محسوس ہو رہی تھی ورنہ عام دنوں میں وہ چھ سات منٹ میں وہاں پہنچ جاتی تھی۔ پتا نہیں جب کہیں جلد پہنچنے کی جلدی ہو تو زمین پیچھے کیوں کھسکنے لگتی ہے۔

"خیر تو ہے سائیں سے! اتنی جلدی میں کیوں ہو؟" گلی کے نکڑ پہ بیٹھے غلام اصغر نے عادت کے مطابق تشویش سے پوچھا تھا اور وہ ان سنی کرتی اپنے سبز دروازے والے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ ڈیوڑھی میں نائکل کھڑی تھی۔ دل بے ساختہ ہول گیا۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔ ابا کب سے آئے بیٹھے ہیں۔" چھوٹی زہرہ اس کی منتظر تھی جیسے۔ اسے دیکھتے ہی چولہے کے پاس سے اٹھ گئی۔

"وہ بس..." اس سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر وہ آگ سلگانے لگی۔ زہرہ لسی بنانے میں مگن ہو گئی تھی۔ پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"ماچس میں آخری تیلی بچی ہے بس۔" اس نے بات اٹھا کر سامنے رکھی۔ ذرا سی دیر مزید ہو جاتی تو ابا کا غضب اس پر نازل ہوتا تھا۔ وہ جانے کیوں باقی اولاد کی نسبت اس سے خار زیادہ کھاتا تھا۔

"یہ کیا ہے میراں؟" زہرہ کے ہاتھ میں وہ سفید کاغذ تھا جو انجانے میں اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا تھا۔ وہ کھول کر عبارت دیکھ رہی تھی۔

اپنا ساتھ دے یا قید تنہائی دے

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی شاعری لکھی تھی۔" اس نے کاغذ آگ میں جھونک دیا۔

سینے سے بھی آگ کے شعلے نکلنے لگے تھے۔ محبت کے اس کھیل میں کسی کو ہمراز بنانا اسے منظور نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے دل کو بڑا سمجھایا ہے میراں! پر یہ کوئی بیل کوئی جواز سننے پر راضی نہیں ہوتا۔ محبت کوئی سوچ سمجھ کر تھوڑی کی جاتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ کتابوں میں بہت پڑھا اس کے بارے میں۔ اب خود پر بیتی ہے تو دل چاہتا ہے سارا کرب، بے تابی اور درد کاغذ پر اتار دوں۔"

گھاس کے تنکے کو بے دردی سے نوچتے ہوئے اس نے نارنجی آسمان کی زرد شعاعوں میں اس کا سلونا چہرہ بہت غور سے دیکھا۔ سورج کی زردی اس کے رخساروں پر چھا گئی تھی۔

"اماں کہتی ہے ارشد چاچو کی فضیلہ تیرے بچپن کی منگ ہے۔" کچھ دیر پہلے ہی اس نے ایک اور راز عیاں کیا تھا اس پر۔ وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی۔

"تو اب... اب کیا ہو گا بدال؟"

"ہونا کیا ہے۔ میں نے تو اماں کو صاف کہہ دیا ہے کہ شادی میں نے اپنی مرضی کی کرنی ہے۔" وہ پھر سے گھاس نوچنے لگا۔

"بھلے سے چاچو کے بڑے احسان ہیں ہم پہ۔ ابا کے مرنے کے بعد ہماری آدھی ذمہ داری اٹھائی۔ آپا کا بیاہ کیا۔ مجھے اپنے ساتھ شہر لے گیا مگر اس کے احسانوں کے بدلے زندگی بھر کا سودا کیسے کر لوں میراں! تو خود ہی بتا یہ ممکن ہے کیا؟" وہ کیا کہتی اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ہجر اور جدائی کہتے کسے ہیں۔

"جب تجھے خبر تھی کہ تیری منگنی ہو چکی ہے تو تو

میری طرف کیوں آیا ابدال؟" میراں نے ناراضی سے کہا۔

"میں خود سے تھوڑی آیا ہوں تیری یہ کالی آنکھیں کھینچ لائی ہیں مجھے تیری طرف۔" اس میں بھی وہی قصوروار تھی۔

"اور پھر مجھے تو خود چند ہفتے پہلے پتا چلا ہے کہ فضیلہ میری منگیتر ہے۔ وہ سبز مرچ جس سے لمحہ بھر نہیں بنتی میری' جنگلی بلی ہے۔ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔ مجھے نہیں پسند ایسی لڑکیاں۔ مجھے تو دھیمے مزاج کی سنجیدہ مزاج لڑکیاں پسند ہیں میراں! بالکل تیری طرح۔" اور وہ اپنی تعریف پر خوش بھی نہ ہو سکی۔

"خیر تو پریشان نہ ہو میں نے اماں سے کہا تو ہے کہ وہ چاچی سے بات کریں' احمد بھی تو ہے اس کا جوڑ بھی بنتا ہے فضیلہ کے ساتھ۔"

"تو کیا تیری چاچی مان جائے گی۔" میراں نے دھیرے سے پوچھا۔

"اب ماننا تو پڑے گا نا اور میرا خیال ہے فضیلہ بھی میرا ساتھ دے گی۔"

"اور میرے ابا ان سے کون بات کرے گا ابدال! وہ تو مجھے زندہ گاڑ دیں گے اگر کچھ بھنک بھی پڑ گئی۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"او کچھ نہیں ہوتا یار! ساری دنیا محبت کرتی ہے۔ ہم نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کر لیا۔"

"مگر ابدال!" وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے لگی مگر ابدال پھر سے وہ خواب دوہرانے لگا تھا جو ان دونوں نے نیلے کے سائے میں بیٹھ کر بنے تھے۔ ان دونوں کا ٹاکرا یہیں ہوا تھا۔

وہ اسکول سے واپس آرہی تھی جب محبت کی سبز کونپل نے اس کے دل کی سرزمین کا انتخاب کیا۔ ساری سکھیاں خوش گپیوں میں مشغول اس سے آگے نکل گئی تھیں اور وہ میڈم نور جہاں کی ڈانٹ پر اداس تھی۔ اسے ریاضی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی اور میڈم نور جہاں کے پیریڈ میں وہ ہمیشہ کھڑی ہوتی۔ پتا نہیں وہ حساب میں اتنی کوری کیوں تھی؟ آج تو میڈم کی سخت سست سنانے پر اس کے آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔ یہی نمی آنکھوں کا کاجل پھیلا کر انہیں سحر انگیز بنا گئی تھی اور شہر سے واپس آتا ابدال حسن وہیں پر پتھر ہو گیا تھا۔ وہ تو اپنے دکھ پر اشک بہاتی گھر کی طرف بڑھ گئی تھی مگر ابدال حسن کے پاؤں اسی راستے پر آپڑے۔ وہ ہر روز اس کا رستہ تکتا۔ بس دیکھتا رہتا' کچھ کہتا نہیں تھا مگر محبت کی سوندھی مہک اس کے احساس کو جگانے لگی تھی۔ پھر وہ بھی اس راستے پر اس کی ہم سفر ہو گئی۔

کتنی حیران ہوئی تھی وہ پہلے پہل "محبت" کو جان کر۔

اور اب تو محبت جان بن گئی تھی۔ پھر آٹھویں کے سالانہ امتحان ہوئے اور وہ اگلے درجے میں آگئی۔ نویں میں داخلے کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ ابا نے انکار کر دیا اور اس نے کتابیں طاق میں سجا دیں۔ اسے کون سا تکرار کا ہنر آتا تھا۔ تین سالوں سے وہ بس "محبت" پڑھ رہی تھی' باقی ساری دنیا کے نصاب سے اسے چنداں دلچسپی نہ رہی تھی۔

ابدال شہر کے کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ ماں' بہن اور چھوٹا بھائی یہیں گاؤں میں تھے اور وہ اپنے چاچو کے پاس چلا گیا تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی جس سے اتنی آمدن ہو جاتی کہ گھر چلتا رہے۔ تین بہنوں میں سے دو کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر سہرا سجانے سے پہلے ماں چھوٹی کے ہاتھ بھی پیلے کرنا چاہتی تھی۔ اسے کون سا جلدی تھی شادی کی بس میراں کو اپنے نام سے منسوب کرنا چاہتا تھا اور جب اماں سے جھجکتے ہوئے دل کی بات کہی تو انہوں نے بتا دیا کہ ارشد چاچو کو اگر ان سے عقیدت اور محبت ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کا ہونے والا داماد ہے۔ دگرنہ فی زمانہ لوگ اتنی ہمدردی اور سخاوت کے متحمل نہیں ہوتے۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ اماں ایک ایک احسان دہراتی رہی تھی کہ وہ نمک حرامی نہ کر جائے۔ دل کو سمجھانا مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔

وہ جب بھی میراں سے جدائی کا خیال ذہن میں لاتا روح نکلتی محسوس ہوتی۔ بچھڑنے کا خیال بھی روح فرسا تھا۔ خود میراں کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ دونوں نے بارہا وفا نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ پُرامید تھے کہ تقدیر پر دعا غالب آئے گی۔

"ہم ان خاندانی رسموں' روایتوں اور ذات پات کے فرق کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیں گے میراں!" ابدال نے نم مٹی کی کوکھ میں ایک عزم رکھا تھا۔ وہ اس کے رخسار کو تھپتھپا کر ہولے سے ہنس دی۔

"واہ رے..... خوش گمان محبت!"

☼ ☼ ☼

صراحی کے گلے میں کلیوں کا ہار پہناتے ہوئے اس نے بہت دنوں بعد ماں کی آنکھوں میں زندگی کی رمق دیکھی تھی۔ چارپائی پہ تکیوں سے کمر ٹکائے وہ سفید چادر پر سرخ پھول کاڑھ رہی تھی۔ بس یہی شوق ان کی بے زار اور بیمار زندگی کا۔

"اماں! ایسی چادر مجھے بھی بنا کر دو نا!" زہرہ کتابیں سمیٹ کر اس کے پاس آکر لیٹ گئی۔

"جب تیری باری آئے گی تو تیرے لیے بھی کاڑھ دوں گی' ابھی تو میں اپنی میراں کے جہیز کی تیاری کر رہی ہوں۔" میراں دھاگے کو گرہ لگانا بھول گئی۔

"میراں کا جہیز۔ کیا میراں کی شادی ہو رہی ہے اماں؟" زہرہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ وہ بجائے شرمانے کے ٹکر ٹکر اماں کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"ہاں نا..... تیرے ابا نے ہاں کہہ دی ہے ناصرہ آپا کو۔ وہ لوگ جمعہ کو آئیں گے بات پکی کرنے۔"

"ناصرہ پھوپھو..... مگر ان کا بیٹا..... اماں! انیس بھائی کے ساتھ....." اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں..... ایک اسی سے تو جوڑ بنتا ہے میراں کا۔ کیا ہوا! جو ایک ٹانگ سے محروم ہے۔ اللہ کے کام ہیں یہ۔ ہم کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔ پالی دینا میراں!" حلق میں نمکین آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا تھا۔ وہ کون سا دل سے راضی تھی اپنی ہیرے جیسی بیٹی کے نصیب پھوڑنے کے لیے۔ مگر کریم بخش شروع سے اپنی من مانی کرتا آیا تھا۔ اس کے بیمار وجود سے اسے کہاں دلچسپی تھی۔ بس خود ہی فیصلہ کر کے مہر لگا دیتا اور وہ بے بسی سے تماشا دیکھتی رہتی۔

"اماں..... کیا ناصرہ پھوپھو نے ایسا کہا۔ آپ نے ابا سے بات تو کرنا تھی اماں! میراں کے لیے وہ ہی رہ گیا ہے۔" زہرہ کو فکر لگ گئی۔ اور وہ کمرے میں چلی آئی۔ پتا نہیں کیوں رونا آئے جا رہا تھا۔

"تیرے ابا نے پہلے کبھی کوئی صلاح مشورہ کیا ہے مجھ سے۔"

"مگر اماں! یہ تو ظلم ہے جتنا ابا کا حق ہے ہم پر' اتنا آپ کا بھی ہے۔ آپ ابا سے بات کریں۔ پہلے کی بات اور تھی مگر یہ تو زندگی بھر کا فیصلہ ہے۔ کہاں پریوں جیسی بہن میراں اور کہاں وہ انیس بھائی۔ پانچ جماعتیں بھی نہیں پڑھا۔ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ دو سال پہلے تک تو پھوپھو اس کی منگنی' ناصرہ پھوپھو کے سسرالیوں میں کرنا چاہتی تھیں کہ کھاتے پیتے لوگ ہیں جی بھر کر جہیز دیں گے بیٹی کو۔" زہرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تیرے ابا بس فیصلہ سنا کر چلے گئے ہیں مجھے۔ جمعہ کو آئیں گے وہ لوگ۔" اماں کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اماں..... اماں..... میں خود....." وہ چپ سی ہو گئی۔ اتنی جرات تو کسی میں بھی نہیں تھی کہ کریم بخش کے جلال کو آواز دیتے۔

"ایک بار تو ابا سے بات کریں پلیز اماں!"

"تاکہ جو رہا سہا بھرم ہے وہ بھی جاتا رہے۔ اسے باپ ہو کر خود کوئی احساس نہیں ہے تو پھر میری بات کیوں سنے گا وہ۔"

"اماں..... ابھی تین بیٹیاں اور ہیں آپ کی۔ ابا پھر سب کے ساتھ ہی....." وہ دہل گئی۔

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے زہرہ!"

"ہمارے تو تینوں بھائی بھی چھوٹے ہیں۔ کوئی ابا کو صحیح غلط بھی نہیں بتا سکتا اور پھوپھو کا مزاج' اماں! اپنی

وہ بڑی بہووں کو کس طرح کھینچ کر رکھا ہے انھوں نے۔ یہاں آتی ہیں تو دو دن برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی نکتہ چینی والی طبیعت، میراں پوری زندگی کیسے گزارا کرے گی ان کے ساتھ؟" زہرہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کیا تیرے ابا کو نہیں پتا بہن کے مزاج کا۔ خود کی اس سے بنتی نہیں ہے اور بیٹی....."

"اماں! آپ تو اپنی خوشی سے جہیز بنانے لگی ہیں جیسے۔" اس نے شکوہ کیا۔

"بیٹی کو وداع تو کرنا ہے زہرہ! ایک ماں کی خوشی تو پوری کرنا ہے نا۔"

"جب بیٹی کے دل کی پروا نہیں کسی کو تو ارمان کیا اماں! میراں کچھ کہے گی نہیں اماں! لیکن اس کے ساتھ یہ ظلم میں برداشت نہیں کروں گی۔"

اٹھارہ سالہ زہرہ اپنی بہن کے مقابلے میں قدرے بے خوف اور نڈر تھی۔ اماں کے سامنے سے اٹھ کر وہ کمرے میں آئی، جہاں مسہری سے پشت ٹکائے میراں نیر بہانے میں مصروف تھی۔

"آنسو کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتے میراں...! حق بات کہنے کے لیے زبان کھولنا پڑتی ہے۔ تم تو اللہ میاں کی گائے ہو۔ جس نے جو کہا جو سنایا چپ چاپ سن لیا۔ ویسے تو بڑے مذہبی اور دین دار لوگ بنتے ہیں ہمارے بڑے۔ جہاں شریعت کی بات آئے وہاں اپنی مرضیاں یاد آجاتی ہیں۔" وہ کتابیں پٹخ کر اپنا غصہ ان پر نکال رہی تھی۔

"تمہیں پتا تو ہے ابا کا۔ ایک فرمائش کرنے کی تو جرات نہیں ہے ہم میں اور تم....."

"تو محبت کرنے سے پہلے بھی یہ سوچ لینا تھا۔"

"زہرہ!" اشک پلکوں پہ اٹکے رہ گئے تھے۔ وہ ششدر تھی۔ جو راز خود سے بھی چھپایا تھا اس کی خبر زہرہ کو کیسے ہو گئی۔

"ننھی کاکی نہیں ہوں میں۔ آنکھیں کھلی رکھتی ہوں۔ پرسوں میں نے تمہیں ابدال حسن کے ساتھ دیکھا تھا نہر کے پاس۔ جب میں اور پارو خالہ کی طرف جارہی تھیں۔"

"زہرہ!" اس نے آگے بڑھ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس خاموش ہو جاؤ پلیز...!"

"میرے خاموش ہونے سے تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ جاتی ہے تو ٹھیک ہے میں اپنے لب سی لیتی ہوں، مگر میراں جو تم کرتی ہو وہ غلط ہے۔ صحیح طریقہ جو ہے اس پر عمل کرو۔ ابدال حسن سے کہو اپنے ماں باپ کو بھیجے۔" وہ اس کے سامنے آبیٹھی۔

"زہرہ!" آنسو پھر سے بہنے لگے۔ "مجھے بھی پتا ہے ہمارا طریقہ غلط ہے لیکن ہم بے بس ہو جاتے ہیں اور صحیح طریقہ... ابدال حسن خود کسی سے بندھا ہوا ہے۔"

"کیا تمہیں شروع سے ہی یہ بات پتا ہے۔" زہرہ نے بے تاثر چہرے سے پوچھا۔

"نہیں... پرسوں بتایا تھا اس نے۔"

"کیا وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا؟"

"چھوڑ بھی دے مگر ابا... برادری کا مسئلہ....."

"تم اسے کہو تو سہی کہ وہ اپنی ماں کو بھیجے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ احتجاج کا حق سب کو ہے میراں! اور حق کے ساتھ دینا انسانیت ہے۔ میں ہر ممکن تمہارا ساتھ دوں گی۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔ میراں اس کے کاندھے سے آلگی۔

☆ ☆ ☆

"ناصرہ پھوپھو کے دیور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" وہ بدھ کی اداس شام تھی، جب ولید نے آکر اطلاع دی۔ ابا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے اس کا دل سینے میں سکڑ کر سمٹا۔

"خاصی چوٹیں آئی ہیں۔"

وہ تفصیلات بتا رہا تھا۔ کریم بخش کچھ دیر ہی ... گیا تھا۔ انہیں ناصرہ کے دیور سے ذاتی دشمنی نہ تھی لیکن یہ ہوا کہ اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے رسم وغیرہ کا معاملہ ٹل گیا تھا کہ ابھی تو ابدال حسن اپنی بات ... نہ کرپایا تھا۔ وہ تو پہلے بھی کبھی کبھار ہی نکلتے تھے اب تو

... سے زائد ہو گیا تھا۔ ابدال حسن شہر میں ہی تھا۔ ... طرح کے واہمے اور خدشات دل کو سہماتے ... اسے محبت پہ یقین تو تھا مگر تقدیر سے خائف تھی۔ وقتی طور پر کریم بخش کی توجہ بھی اس کے ... ہٹ گئی تھی۔

"ابدال حسن آج کل گاؤں آیا ہوا ہے میراں!" وہ ... میں کپڑے بھگو رہی تھی جب بازار سے واپسی پر ... نے اسے اطلاع دی۔ وہ سب نئے کپڑوں کے ... دیکھنے لگی تھیں۔ زہرہ ساتھ والی ارم باجی کے ... بازار جاتی تھی۔ اسے تو ہجوم سے ویسے ہی ... وحشت ہوتی تھی۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔

"میں روبینہ سے مل کے آتی ہوں۔ اس کی تاریخ رکھنی تھی آج کل میں۔" وہ اماں کو اطلاع دے کر ناشر کے ساتھ نکل آئی۔

ناشر کو گلی کے نکڑ پر ہی بندر کا تماشا دیکھنے کو مل گیا ... وہ ہاتھ چھڑا گیا۔ ابدال حسن کے گھر کے دروازے ... ان کی چھوٹی بہن پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ وہ ... آج دوسری بار ان کے گھر آئی تھی۔ رقیہ صحن میں ... بھی دال چن رہی تھی۔

"السلام علیکم خالہ!" اس نے دھیمے سے سلام کیا تھا۔ بسمہ جلدی سے کرسی اٹھا لائی۔

"وعلیکم السلام..." رقیہ کے لبوں پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔ ابدال حسن بھی اپنی ماں پر گیا تھا اسی کی طرح ہر وقت لبوں پر مسکان سجائے رکھتا۔ رقیہ اپنے بیٹے کی پسند سے آگاہ تھی۔ اسے خود بھی کامنی سے سراپے والی کم گو میراں پسند تھی مگر ایک طرف بیٹے کی محبت تھی تو دوسری طرف دیور کا مان... فضیلہ ... تو لڑکی تھی، وہ کیسے اس کی آنکھ سے سپنے چرا لیتی۔ ... کی طبیعت میں بچپنا تھا مگر خمیر اس کا بھی محبت کی ... سے اٹھایا گیا تھا۔

"خالہ! مجھے تو مل ہی نہیں رہی یہ۔ بسمہ کی بچی ..." وہ ہاتھ میں گلابی شلوار اٹھائے کمرے سے باہر ... تھی اور پھر اس پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"یہ فضیلہ ہے میری بھتیجی۔ ابدال کے چچا کی بیٹی۔" رقیہ نے تعارف کروایا تھا۔

"اور یہ میراں ہیں... ہے نا!" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے سلام دعا کرنے لگی۔

میراں بھونچکی رہ گئی۔ فضیلہ قدرے بھاری جسامت کی گلابی رنگت کی حامل انیس بیس سال کی دوشیزہ تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت اسے پرکشش بنا رہی تھی۔

"ایک خوب صورت خدوخال کی مالک لڑکی ابدال حسن کی منگیتر تھی اور وہ پھر بھی میری طرف آنکلا۔ ان کا بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ لڑکی کسی کا بھی خواب ہو سکتی تھی تو پھر ابدال حسن کا کیوں نہیں؟"

وہ اب اس کے سامنے بیٹھی خوش دلی سے اس کی پسند ناپسند اور مشاغل وغیرہ پوچھ رہی تھی۔ بسمہ چائے بنانے لگی تھی اور رقیہ کو دال چڑھانا تھی۔ دونوں باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"مجھے یقین تھا کہ ابدال کی پسند ایسی ہی ہوگی۔ اسے شروع سے ہی سوبر، میچور اور کم گو لڑکیاں پسند ہیں۔ مجھے تو کہتا ہے تمہاری بیٹری کبھی ڈاؤن بھی ہوتی ہے۔ ہر وقت زبان چارج رہتی ہے لڑکیوں کو زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی تو ان کے درمیان "حوالہ" بھی متعارف تھا۔

"میں ضد کرکے آئی ہوں ابدال کے ساتھ، مجھے لے کر نہیں آرہا تھا۔ ابا سے سفارش لگوائی تب مانا۔ مجھے بس تم سے ملنے کا شوق تھا۔ ایک بار ملنا چاہتی تھی تم سے۔ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ابدال کو واقعی ویسی لڑکی مل گئی ہے جیسی وہ چاہتا تھا۔ ویسے ہے شروع سے ہی لکی۔ جو چاہتا ہے پالیتا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے باتیں کر رہی تھی۔

"تم بھی تو کچھ بولو نا! کب سے میں ہی بولے جارہی ہوں۔ ابدال بھی کیا سوچے گا کہ کب سے اپنی ہانکے جارہی ہوں اور اس کی "مہمان" کو موقع ہی نہ دیا۔"

ابدال حسن کی بائیک اندر داخل ہوئی تھی۔ میراں کو یوں لگا کہ جیسے وہ غلط وقت پر آگئی ہے۔ اسے ندامت کا احساس ہونے لگا۔

"تم کب کے گئے ہو... یہ وقت ہے آنے کا' مجھے واپس بھی جانا تھا۔"

"صبح چلی جانا۔ ہروقت جلدی نہ مچائے رکھا کرو۔" وہ سامان اتارنے لگا۔

"تو اور کیا تمہاری طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہا کروں۔ ہر کام میں دیر نہیں کرتے ابدال! وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔"

"اچھا... مس فلسفی!" ایک گہری نگاہ سیاہ چادر کے ہالے میں مقید میراں پر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ جانے کے لیے اٹھی۔

"اتنی جلدی۔ ابھی تو میں نے تم سے باتیں بھی نہیں کیں۔ بسمہ کی بچی! چائے بنا رہی ہو یا پائے۔"

"میں پھر آجاؤں گی۔ بلکہ تم میرے گھر آجانا۔"

"میں تو آؤں گی خالہ کے ساتھ ابدال کا رشتہ ڈالنے۔ تم بس اپنے ابا کو منا کر رکھنا۔" وہ بے تکلفی سے ہر بات کہے جا رہی تھی وہ ٹھیک سے حیران بھی نہ ہو پائی۔

"تم یقیناً میری باتیں سن کر حیران ہی ہو رہی ہو۔ مگر کیا کروں مجھے گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتی۔ یہ ابدال تو ایک دم گھونچو ہے۔ دل کی بات بتانے میں ہفتہ لگا دیا۔ میں جان تو گئی تھی کہ یہ کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے۔ پھر بھی منتظر رہی کہ خود بات کرے مگر یہ بھی نہ 1960ء کا ہیرو... یہ محبت وحبت کا چکر میری سمجھ میں نہیں آتا' لیکن دل والوں کی قدر بہت کرتی ہوں۔ مجھے کون سا عشق وشق تھا ابدال سے۔ میں نے کہا' نو پرابلم! محبت پر کسی کا زور کہاں... جو تمہاری خوشی وہ میری۔ ویسے بھی میں نے بہت سارا پڑھنا ہے ابھی' ہاں بس ایک بار ابدال کی پسند دیکھنا ضرور چاہتی تھی۔ تم واقعی اس قابل ہو کہ تمہیں چاہا جائے۔" وہ اس کا رخسار تھپتھپا کر اٹھ گئی۔

"میں بسمہ کو دیکھوں... آج کی تاریخ میں اس کی چائے بن جاتی ہے کہ نہیں۔"

میراں اپنی جگہ گم صم بیٹھی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کہتے ہیں جہاں مایوسیوں کے گھنیرے بادل حالات کی دھوپ میں سرسرائیں' وہیں قدرت معجزہ دکھاتی ہے۔ ابدال حسن نے تو اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا اور اس نے اپنے سخت گیر باپ کا دل موم کرنے کے لیے اپنے مشکل کشا اور حاجت روا رب کی ذات سے لو لگائی تھی۔

جس روز ابدال حسن کا رشتہ آیا۔ کریم بخش نے پہلی بار سوچا کہ میراں اس کی بیٹی' اس کے وجود کا حصہ ہے۔ اس نے صفاچٹ انکار نہ کیا تھا۔ میراں تو رہی ایک طرف زہرہ اور اس کی ماں کو کریم بخش سے اتنی "نرمی" کی بھی امید نہ تھی۔ ساکت جھیل کے کائی جمے کناروں پر پہلا پتھر پڑا تھا۔

ناصرہ پھوپھو کو خبر ہوئی تھی خوب واویلا کیا۔ وہ تو یہ طے کیے بیٹھی تھی کہ میراں انیس کی ہی دلہن بنے گی۔ بھلا میراں جیسی صابر و شاکر بہو کہاں ملنی تھی۔ بھائی نے تو کبھی بیوی کو اہمیت نہ دی تھی اولاد کو کہاں دیتا؟ اس گمان میں دہلیز پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میراں تو میرے انیس کی ہی دلہن بنے گی۔ میں صاف کہے دیتی ہوں کریم بخش! تو زبان دے چکا ہے مجھے۔ یہ شہر کے لونڈے لپاڑے ان کا کوئی آگا نہ پیچھا..."

"افضال' سلیم بھائی کا جاننے والا تھا۔ بہت اچھا گھرانہ ہے۔ سلیم بھائی نے خود گارنٹی دی ہے اور پوری چودہ جماعتیں پاس ہے۔ اپنی دکان ہے الیکٹرونکس کی شہر میں... لڑکا بھی بہت شریف۔"

"ہاں ہاں! میرے انیس میں تو اب عیب ہی نظر آئیں گے... وہ تو بدمعاش ہے کوئی۔"

ناصرہ تو بھرے پیالے کی طرح چھلک گئیں۔ پھر جو شروع ہوئیں تو شام تک بڑبڑاتی ہی رہیں۔

"کبھی اس دہلیز پر قدم نہ رکھوں گی اگر مجھے نامراد لوٹایا۔" صاف دھمکی تھی اماں کا دل ہولتا رہا۔ میراں کونے میں دبکی خدا کے حضور سجدہ ریز تھی۔

"میں کا بھی ہو ہی جائے گا آپا! میں کہیں بات چلاتا"

"آج تو کریم بخش کے اطوار ہی حیران کن تھے۔"

"میں بھرپائی تمہاری ہمدردیوں سے۔ کتنی سبکی کا کرنا پڑے گا مجھے انیس کے ابا اور اپنے سسرال کے سامنے کہ بڑی بڑھکیں مارتی تھی کہ بھائی بلا چوں چرا کیے لاج رکھ لی۔ یہ ضرور اس کمینی کی بہت ہے کوئی۔" روئے سخن بھاوج کی طرف مڑ گیا تھا۔

"آپا! بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں یہ رشتہ گنوانا نہیں چاہتا۔"

"تو یہ زہرہ بھی تو ہے۔ اس کا کردے۔" نئی راہ سجھائی۔ زہرہ نے دہل کر ابا کی طرف دیکھا اعتبار بھی آتے آتے آتا ہے۔

"انہوں نے میراں کی ہی بات ڈالی ہے اور زہرہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ پڑھ رہی ہے۔ اس کا تو داخلہ بھی کرانا ہے شہر جا کر۔" زہرہ پر تو شادی مرگ طاری ہو گئی۔

"یہ واقعی ہمارے ہی ابا ہیں۔" ثمو نے سرگوشی میں اماں سے پوچھا۔

"بڑا بدنصیب ہوں آپا! اللہ نے اتنی نیک فرماں بردار بیوی دی اولاد دی اور کبھی قدر نہ کر سکا۔" وہ تاسف سے سر ہلاتے کہہ رہا تھا۔ ناصرہ کو پتنگے لگ گئے۔

"ہاں جی بڑی جلدی خیال آگیا' ضرور اس کلموہی نے کوئی تعویذ گنڈا کروا دیا ہے۔ میرا بھائی میری بات نہیں موڑ سکتا' ہائے اللہ! یہ دن بھی دیکھنا تھا۔" وہ رونے لگی تھی کریم بخش پیالی زمین پر رکھ کر اٹھ گیا۔

"آپا! دیر تو واقعی ہو گئی مگر اتنی بھی دیر نہیں ہوئی اور پھر نصیب کی بات ہے ساری۔ جہاں میری دھی کے نصیب جڑے ہیں۔ بڑا ہی بخت آور قدم ہے افضال کے گھر والوں کا۔ مجھے پہلی واری اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نصیبوں کے کھیل ہیں سارے۔" وہ کہتے ہوئے ڈیوڑھی پار کر گیا۔ ناصرہ بھی تن فن کرتی اس کے پیچھے ہی چلی گئی تھی۔ مختصر سے آنگن میں بہت سالوں بعد چاندنی چٹکی تھی۔ سب باہر اکٹھے ہو گئے۔

"یہ ابا کو کیا ہو گیا ہے بھئی۔ یہ ہمارے ابا تو نہیں لگ رہے۔" زہرہ نے ہی بات شروع کی۔

"ہاں اماں! تو نے سچ مچ تو تعویذ نہیں کروا دیے۔" عبید نے آنکھ کا کونا دبا کر معاذ کو دیکھا وہ حلق پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

"چل ہٹ بدتمیز... شرم نہیں آتی ماں سے مخول کرتے۔" وہ جھینپ گئی۔

"سچ اماں! مجھے بھی شک ہو رہا ہے پھوپھو کے تعویذوں کا الٹا اثر ہو گیا ہے۔" وہ سب مل کر ہنس رہے تھے۔ گھٹے گھٹے سے ماحول میں آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ گدلی فضاؤں میں سے کثافت چھٹ رہی تھی۔ وہ بھی ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتی باہر چلی آئی۔

"واہ بھئی آپا! یہ تو معجزہ ہی ہو گیا۔ ابا نے پھوپھو کو صاف انکار کر دیا۔ قسم سے سواد آگیا۔"

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ کوشش تو کرنی چاہیے بندے کو... پہلے ہی ہمت ہار کر بیٹھ جاؤ تو قسمت خاک ساتھ دے گی۔" زہرہ کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"بڑی بانصیب ہے میری بچی!" اماں نے اس کا سر اپنے کندھوں سے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"واقعی! اپنے بخت آور ہونے کا تو مجھے آج یقین آیا ہے اماں! اور یہ سب محبت کا کرشمہ ہے۔ ابدال حسن کی محبت نے مجھ سے پتھر کو انمول ہیرا بنا دیا۔"

اسے ابدال حسن کی محبت پر فخر ہو رہا تھا۔ اور سچ ہے کہ ہر محبت کا انجام جدائی نہیں ہوتا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

ناولٹ

رُخسانہ نگار عدنان

کسی چیز کے ٹوٹنے کی زوردار آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔

آنکھ تو خیر اپنے معمول کے وقت یعنی فجر کے وقت بھی کھلی تھی مگر شیطان نے کچھ ایسے دلبرانہ انداز میں تھپکیاں دیں کہ پھر کہاں کی نماز کہاں کی جاگنگ۔

''لگتا ہے پھر اس شریفاں نے کچھ توڑ دیا ہے۔'' میں نے جھنجلاتے ہوئے گردن ذرا سی گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دس بج چکے تھے۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''ہوں آجاؤ کون ہے؟'' میں ذرا سا اٹھتے ہوئے بولا۔

''سلام صاب! میں فرزند۔!'' اس نے پہلے اپنے خرگوش جیسے لمبے دودھیا دانتوں سمیت منہ دروازے کے دراز سے اندر سے داخل کیا اور پھر خود اندر آ گیا اور مجھے اس کے انداز سے ''فوراً'' پتا چل گیا کہ فرزند صاحب کیوں تشریف لائے ہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آ... اٹھے نہیں صاب؟'' بس ٹھی ٹھی کرنے کی کسر تھی' ورنہ اس کے دانتوں کی نمائش سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ ابھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے گا۔

''اٹھ گئے فرزند صاحب حکم؟'' میں باقاعدہ ٹانگیں لٹکا کر سلیپر اڑسنے لگا۔

''توبہ میری اللہ توبہ۔ جو آپ کو حکم دوں۔ بس ایک عرض ہے حضور!'' وہ لہجے میں کچھ عاجزی بھرتے ہوئے دو قدم مزید آگے بڑھا۔

اور مجھے اس کی ''عرض'' کے بارے میں بھی علم تھا۔

''ہاں بولو۔'' میں نے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سستی سے کہا۔

''حضور... یہ بدبخت شریفاں... حضور گھر کی دشمن ہے پوری' کچن کے برتن اور دوسری چیزیں کچھ بھی اس نامراد کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں۔ لے کر قیمتی سب سے مہنگے والے ڈنر سیٹ کی بڑی پلیٹ... ایک نہیں حضور دو توڑ ڈالیں۔ حضور کیا اوّل درجے کی چینی تھی اور کیا زبردست ڈیزائن... اور جو سیٹ برباد ہوا وہ علیحدہ... حضور بڈھی کھوسٹ کو کچھ نظر نہ آوے اس کی تنخواہ سے پلیٹوں کے پیسے کاٹیں اور فارغ کریں اس سردرد کو۔'' فرزند میرے ڈھیلے ڈھالے انداز اور یکسو ہو کر سننے سے شہہ پا کر بولتا چلا گیا۔

''دیکھو فرزند! ہمارے مذہب میں ہے کہ ٹوٹنے والی چیزوں کا غم نہ کرو ہماری طرح ان کی بھی عمر مقرر ہے اور...''

''پر صاب ہر روز' ہر وقت' جب گھر میں دھنادھن ہوتی رہے تو کیا تب بھی شکوہ نہ کریں۔ چیزیں ساتھ

رہیں یا انسان۔ جی الفت تو ہو ہی جاتی ہے ان کا جانا تھوڑا سہی غم تکلیف تو دیتا ہے۔"

"صحیح کہا فرزند تم نے اور تم نے خود ہی جواب بھی دے دیا کہ چیزیں ہوں یا انسان ساتھ رہیں' الفت تو ہو ہی جاتی ہے۔ اب بے چاری شریفاں کو ادھر کام کرتے ڈیڑھ سال ہونے کو آیا۔ اب اسے باہر جاکر ایک دم سے نوکری سے جواب دے دوں۔" پھر میں نے بڑی چالاکی سے ساری گوٹ فرزند کے خانے میں ڈال دیں وہ کچھ لاجواب سا ہو کر سر کھجانے لگا۔

"وہ تو صحیح بات ہے صاحب! پر آپ اس کا کچھ سوچو۔"

"اچھا بھئی کچھ کرتے ہیں تم ناشتہ لگواؤ۔ میں باتھ لے کر آتا ہوں پھر بات کریں گے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے اسے تسلی دی تو وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

میں فریش ہو کر ڈائننگ روم میں آیا تو ناشتہ لگ چکا تھا۔

جہازی سائز ڈائننگ ٹیبل کے ایک حصے میں ناشتے میں دنیا جہان کی چیزیں موجود تھیں باقی ٹیبل ویران تھی۔

کرسی سنبھال کر بیٹھتے بیٹھتے ہی میرا جی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ فرزند نے گرم گرم سلائس اور پھولا ہوا دو اقسام کا آملیٹ میرے آگے رکھا۔

"صاب پراٹھا لیں گے ساتھ؟" اس نے اپنے مخصوص محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

میں اسے کیسے بتاتا۔ اس لمحے میرا دل کس چیز کو چاہ رہا ہے۔ خوا مخواہ ہی آنکھوں کے گوشے نم سے ہو گئے۔

"پہلے آپ جوس لے لیں' میں چائے بعد میں لاؤں گا۔" وہ مستعدی سے اورنج جوس میرے گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا اور میں خالی نظروں سے تیزی سے بھرتے گلاس کو دیکھتا رہا۔

"کیا کسی بھی چیز کو "بھرنا" اتنا آسان ہوتا ہے۔ جس تیزی سے یہ گلاس بھر گیا۔" میں نے لبالب بھرے اورنج جوس کے گلاس کو دیکھ کر رشک سے سوچا۔

"نہیں جگہیں چیزوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی جلدی نہیں "بھرا" جاسکتا فقط انسانوں سے بھرنا ہو تو کچھ مشکل نہیں مگر محبت سے بھرنا شاید ناممکن!" میں نے خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

میرے لیے میز پر موجود ہر چیز بے ذائقہ بے رنگ ہو چکی تھی۔

"یہ وہی لذت کام و دہن کا سامان تھا جس کے لیے ایک ایک نوالے پانے کے لیے خدائی خوار ہوتی پھر رہی ہے۔" میں نے ناشتے کے لوازمات کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"دور کیوں جایئے کبھی میں بھی۔" میرے اندر کوئی ہولے سے ہنسا۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے شاندار پر آسائش لگژری ڈائننگ ہال کو دیکھا۔

اور یہ سجا سجایا کمرہ مجھے ایک دم سے خالی لگا۔ بالکل خالی! ویران اجڑا ہوا۔ ایسی زور آور کیفیت تھی جس نے میرے پورے وجود کو جکڑ لیا۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" میں نے وحشت سے اپنا سر ہاتھوں میں لے کر زور سے جھٹکا۔

ہاں جس گھر میں محبت نہ ہو وہ گھر خالی ہی ہوا کرتے ہیں۔ ویرانوں کی طرح وہاں اداسی اور وحشتوں کے آسیب بسیرا کرنے لگتے ہیں' مجھے اپنے اندر سے ہی جواب بھی مل گیا تھا کہ مجھے یہ گھر خالی کیوں لگنے لگا ہے؟

"صاب! پراٹھا گرما گرم۔" فرزند نے بھاپ اڑاتا خوشبودار پراٹھا میرے سامنے رکھ دیا۔

"صاب! کچھ لے کیوں نہیں رہے؟" اسے یکدم

میز کے اسی طرح بھرے ہونے کا احساس ہوا۔

"فرزند! دل نہیں چاہ رہا۔ طبیعت بوجھل سی رہی ہے۔ تم بس مجھے ایک کپ چائے بنا کر ادھر دو۔" میں کسی بھی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

بارہ تیرہ سال کی عمر کے لڑکے نے اسٹیل کے گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کر میرے سامنے رکھا اور مڑ کر جانے لگا۔

"سنو کیا نام ہے تمہارا۔" میں نے بے اختیار سا اسے پکار اٹھا۔

"ناصر جی!" اس نے مختصراً کہا۔

"تم پڑھتے نہیں ہو؟"

اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

"سارا دن ادھر ڈیوٹی دیتا ہوں اور رات کو گھر جاتا ہوں۔" اس نے کچھ بے چین سی نظروں سے آوازیں دیتے ہوٹل کے مالک کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

"نشہ....." اس نے پھر مختصراً کہا اور میرے اگلے سوال سے بیشتر ہی وہاں سے چل دیا۔

یقیناً" اس کے دو چار اور بہن بھائی ہوں گے ماں ہوگی گھر کا کرایہ' بجلی کا بل اور سب سے بڑھ کر پیٹ کے ایندھن کا انتظام!

"یا خدا' ان سب غریبوں کی کہانیاں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ روٹی سے شروع ہو کر روٹی پر ختم ہونے والی!" میں نے بے بسی سے سوچا اور ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

وہ لڑکا اب پھرتی سے ہال میں بچھی میزوں کے درمیان گرم گرم روٹیاں سرو کرتا پھر رہا تھا۔

اگر فرزند مجھے یہاں اس پسماندہ علاقے کے ہوٹل میں بیٹھے نان چنے کے ساتھ اسٹیل کے اس پرانے سے گلاس میں پانی پیتا دیکھ لے تو یقیناً بے ہوش ہو جائے۔

میں کھانا کھانے کے بعد بھی بہت دیر وہاں بیٹھا رہا اور یونہی بے مقصد اس نوعمر لڑکے کو بڑی مستعدی اور ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی نبھاتے دیکھتا رہا۔

بیچ میں ایک بار وہ میری میز پر بھی آیا مزید کچھ منگوانے کا پوچھنے کے لیے۔

"تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟" میں نے اس کے آنے کو غنیمت سمجھتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں صاب!" اس نے عجلت میں جواب دیا اور دوسری طرف مڑ گیا۔

ان سب محنت کش نوعمر لڑکوں کی صورتوں میں اپنا چہرہ بڑا واضح دکھائی دیتا تھا۔

محض چند سال بیشتر میں بھی تو ان کی طرح اپنے کمزور وجود پر محنت کی ڈھال تانے خود کو زندگی سے منوانے کے لیے کیسی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

وہ دور بیت گیا تھا مگر چپکے سے کہیں اندر ہی چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور جب بھی اس طرح کے لڑکے مجھے دکھائی دیتے وہ مشقت بھرا وقت مجسم ہو کر میرے سامنے آجاتا۔

ان میں اور مجھ میں بس اتنا فرق ہے کہ انہیں کولہو کے بیل کی طرح اسی دائرے میں آنکھوں پر مشقت کی پٹی باندھے گھومتے ہوئے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، ہوتا بھی ہے تو صرف اپنے کنبے کو دو وقت کی روٹی بہم پہنچانے تک کی اہمیت کا احساس۔ جبکہ مجھے اس مشقت اور محنت کے ساتھ چھپی ذلت بھرے احساس سے چھٹکارا پانے کی لگن بھی تھی۔

"کبھی پڑھنے کو دل چاہے یا کسی باعزت نوکری کو تو اس پتے پر چلے آنا۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے اسے ایک ہینڈسم ٹپ اور اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

اور یہ میری عادت تھی۔ اس طرح کے کسی بھی لڑکے کو دیکھ کر اسے یہ آفر کرنا۔

اور ایسی آفرز کے جواب میں عموماً" جتنے بھی لڑکے بعد میں مجھ سے رابطہ کرتے وہ صرف موٹی سی مالی مدد

کے چکر میں رابطہ کرتے اور جب میں ان سے پڑھنے اور شام کو کوئی پارٹ ٹائم جاب کے لیے کہتا تو وہ دوبارہ میرے پاس آنے کی کم ہی زحمت کیا کرتے تھے۔ سوائے تین چار کے۔

"ہاں یہ تین چار لڑکے نعمان' وحید' آصف اور جاوید میری تمام زندگی کا حاصل تھے۔"

آج وہ میری حوصلہ افزائی اور مناسب مالی مدد کے ذریعے پڑھ بھی رہے تھے اور اپنے گھر والوں کا بوجھ بھی اٹھا رہے تھے جب میں ان چاروں سے ملتا ہوں تو مجھے ان میں اپنا چہرہ بہت روشن' بہت پُر امید نظر آتا ہے۔

سہ پہر کی دھوپ اب پیلی پڑتی ہوئی سرمئی شام میں بدل رہی تھی جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔

شاید وہ لڑکا کل مجھ سے ملنے آئے اور میری بات سمجھ کر آمادہ ہو جائے اور میری کامیابی کا فگر پانچ ہو جائے۔

مجھے اگلی آس بھری صبح کا شدت سے انتظار تھا اور صبح جس دہشت کے عالم میں میں گھر سے نکلا تھا اس کی کیفیت میرے دماغ سے یکسر محو ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح بے حد تازہ دم اور روشن تھی۔ کل جس طرح میرا دل بوجھل اور دہشت زدہ ہو رہا تھا آج اس بات کا نشان بھی نہیں تھا۔

صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں حسب معمول جاگنگ کے لیے گیا ناشتہ بھی اپنی روٹین کے مطابق کیا۔ فرزند اور شریفاں کے درمیان ہونے والے نئے تنازعے کو اخبار دیکھتے ہوئے غائب دماغی سے سنتا رہا اور چائے کا خالی کپ لے کر ہشاش بشاش سا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

آج میری تازگی کا واحد سبب "مصروفیت" تھا۔

"صاب! ایک بات بولوں!" فرزند میرا بریف کیس پکڑے گاڑی تک آیا تھا۔

"ہوں کہو۔" میں بیٹھنے سے قبل شیشے کو تھام کر بولا۔ "صاب آپ شادی کرلیں۔ مکمل فیملی۔ گھر۔ پھر آپ کو گھر بہت اچھا لگنے لگے گا۔" اس نے بریف کیس اندر رکھتے ہوئے ذرا ڈرتے ہوئے انداز میں کہا اور میرے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر واپس مڑ گیا۔

"کیا فرزند کو بھی پتا چل گیا ہے کہ یہ سامان سے بھرا پرا گھر مجھے خالی آسیب زدہ ویرانہ لگنے لگا ہے؟"

میں فرزند کے اندازے پر حیران سا تھا۔

"شادی' فیملی' گھر۔" کتنے متضاد الفاظ ہیں اور ان تینوں کی میرے ساتھ میچنگ...... کتنی ناممکن سی بات ہے۔ شادی کا مطلب...... عورت کا ساتھ' عورت کی محبت اور عورت......" میرا حلق کڑوا ہو گیا۔

میں عورت ذات سے خائف نہیں کہ مجھے جنم دینے والی ایک عورت ہی تھی اور دنیا میں میری پسندیدہ ہستی...... جس کے جانے کے بعد اس کا خلا آج تک میرے اندر سے پُر نہیں ہو سکا مگر مجھے زندگی کی ذلتوں سے روشناس کرانے والی بھی تو ایک عورت تھی۔

ایسی عورت جس نے مجھے اس صنف سے ہی نفرت کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

میں تلخی سے سوچ رہا تھا۔

میں نے ایک تنہا زندگی گزاری تھی بے حد تنہا۔ صرف میں اور میری محنت اور بس۔ کوئی دوست کوئی عزیز کوئی ہمراز اور سب سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ بھی تو نہیں۔ سوائے اس فرزند کے۔

میں نے سر جھٹک کر ان لایعنی سوچوں سے پیچھا چھڑایا اور کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی زندگی کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اپنے چیمبر کی طرف جاتے ہوئے زیدی صاحب کے کیبن کے سامنے آ گیا۔

میرے سیاہ بوٹوں کے پاس دھانی رنگ کا آنچل کیبن کے کونے سے نکلتا ہوا پنکھے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

میں لمحہ بھر کو ٹھٹک سا گیا۔

اور ذرا کھنکار کر آگے ہوا۔

"گڈ مارننگ سر!" زیدی صاحب بے ساختہ اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولے تو دوسری چیئر جس کی دروازے کی طرف پشت تھی اس پر بیٹھی لڑکی بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھانی آنچل اسی کے کندھوں سے ڈھلک کر کیبن سے نکلا جا رہا تھا۔

"گڈ مارننگ سر!" اس کی مہین سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی مناسب قد کی عام سے خدوخال والی لڑکی تھی جس کا رنگ بہت صاف تھا اور جسم چھریرا کچھ جھینپی جھینپی سی کھڑی تھی۔

"زیدی صاحب! آپ پلیز ذرا میرے آفس میں آیئے۔ اے کے بلڈرز کی فائل لے کر۔" میں نے لڑکی پر سرسری سی نظر ڈالی اور زیدی صاحب سے کہہ کر باہر نکل آیا۔

"یہ لڑکی کوئی نیو اپائنٹ منٹ ہے آپ کے آفس میں؟" زیدی صاحب فائل لے کر جانے لگے تو میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"جی سر! آپ کو یاد نہیں پچھلے دنوں ہم نے کمپیوٹر سیکشن کی ایک خالی سیٹ کے لیے ایڈ دیا تھا۔ آپ انٹرویو والے دن میٹنگ میں تھے۔"

"اوکے' ٹھیک ہے آپ جائیں۔" میں نے زیدی صاحب کے تفصیلی جواب پر کہا اور اپنے آگے رکھی فائل کھول کر دیکھنے لگا۔

اس عام سی لڑکی میں کچھ خاص بات تھی' کیا؟

فائل کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی مجھے بار بار یہی بات تنگ کرتی تھی۔

"آخر کیا خاص بات ہو سکتی ہے اتنے عام سے چہرے پر۔" میں نے جھلا کر فائل بند کرتے ہوئے خود سے کہا۔ "وہی سیاہ گہری آنکھیں ______ وہی گندمی سے ذرا صاف رنگت' مناسب ناک' قدرے بھرے بھرے ہونٹ' ناک...... ناک کے عین درمیان میں وہ سیاہ تل' میں اسے سوچتے ہوئے یکدم چونکا۔

"ہاں یہی بات تھی وہ شاید جس نے اس عام سے چہرے کو خاص بنا رکھا ہے۔"

اس ناک کے تل نے اس کی اچھی خاصی چائینز ناک کو انوکھی سی اٹھان دے رکھی تھی۔ دیکھنے والی نظر اس کی چپٹی ناک پر ٹھہرنے کے بجائے سیدھی اس سیاہ تل پر جاکر رکتی تھی۔

شاید یہی وجہ ہو میں نے مطمئن سا ہو کر پھر سے فائل کھول لی مگر میرے اندر ابھی بھی کوئی پن سی گڑی تھی۔

میرا چونکنا محض اس تل ہی وجہ سے نہیں تھا۔

تو پھر کس سبب سے تھا؟ تمام دن آفس میں مختلف کاموں کے دوران مصروفیت میں بھی یہ سوال میرے اندر سر اٹھاتا رہا جسے میں سر جھٹک کر بھلانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر کامیاب بھی ہوگیا۔ مگر رات کو جب سونے کے لیے لیٹا تو چھم سے وہ سیاہ تل والی ناک اور عام سی صورت والی لڑکی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیا مصیبت ہے؟" میں نے جھنجلا کر کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلی صبح اٹھتے ہی پہلا خیال مجھے یہی آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چھوڑو یار کیا بات کرتے ہو۔ تم تو ہوتا چھڑے چھانٹ جب جہاں منہ اٹھایا چل دیے۔ ہم سے پوچھو گھر سے اندر باہر آنے جانے کے لیے بھی بیگم پوری انکوائری ٹیم کی طرح جرح کرتی ہے۔ تم اچھے ہو تمہیں دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے۔"

احسن میرے اچھے کاروباری دوستوں میں سے تھا۔ آج کل ان کی کمپنی کے ساتھ بھی ہمارا ایک پروجیکٹ چل رہا تھا اور پچھلی میٹنگ پلس ڈنر میں وہ آ نہیں سکا تھا۔ آج اس سے فون پر بات ہوئی تو میں نے کہہ ڈالا۔ تو وہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ اور تو میں جو آج صبح سے ہی فرزند کے مشورے پر مسلسل کام کی مصروفیت کے دوران بھی غور کرتا رہا تھا ایک دم سے پیچھے ہٹنے لگا۔

"کیا شادی ایسی پابند کردینے والی چیز ہے؟" میں لمحہ بھر بعد یونہی پوچھ بیٹھا۔

"ایسی ویسی البتہ تم کرلو۔" وہ بے دھڑک بولا۔

"کیوں میں کیوں کرلوں؟"

"دو بار تمہارے گھر ڈنر پر انوائٹ تھا تو میری بیگم کو مسلسل یہ شک رہا چونکہ تم کنوارے ہو تو یقیناً ایسی ویسی سرگرمیوں میں ملوث ہوں گے سو مجھے بھی "خراب" کروگے۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے جھنجلا کر فون بند کردیا۔

"جی عائشہ نام ہے میرا۔" وہ کسی کام سے اندر آئی تو میرے پوچھنے پر بتانے لگی۔

"پہلی بار جاب کررہی ہیں؟" میں نے پنکھے کی ہوا سے بکھرتے پیپرز کو پیپر کلپ لگاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ اس سے پہلے دو جگہ کی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"کہاں؟"

"ایک وہاب سنز میں صرف تین دن اور "لی سروز" میں دو ہفتے۔"

میں خفیف سا مسکرا دیا۔

اس کی ناک کے عین بیچ وہ سیاہ تل کیسا روشن تھا پھر وہی خیال مجھے چبھنے لگا میں اسے دیکھ رہا تھا بے خیالی میں۔

وہ کچھ نروس ہو کر اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔" میں نے کہہ کر رخ پھیرلیا۔

"سر.... ! سر.... ! اف یو ڈونٹ مائنڈ ایک بات پوچھوں۔" وہ وہیں کھڑی تھی اور کچھ ہکلاتے ہوئے ڈرے سہمے انداز میں بولی۔

"ہوں بولیے۔" وہ شاید میری اتنی سنجیدہ ہوجانے والی صورت سے خائف ہوئی تھی۔

"سر آپ.... آپ کا.... میرا مطلب ہے آپ کا نام سرہارون ہے۔ آپ کا پورا نام.... آپ کی فیملی۔"

"واٹ؟" مجھے جیسے اس کی آخری بات پر زبردست جھٹکا لگا تھا۔

میری دھاڑ سے ہی وہ فٹ بھر اچھل گئی تھی۔

"وہاٹ ڈو یو مین؟" میں اب باقاعدہ اسے گھور رہا تھا۔

"نتھنگ سر.... آئی ایم سوری ایکسٹریملی سوری۔" وہ جلدی جلدی معذرت کرتی وہاں سے چلی گئی۔

"یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان سے دو باتیں کرو تو پھیلنے لگتی ہیں یعنی ان کو میرا فیملی ڈیٹا چاہیے تاکہ.... یہ آگے تک سوچ سکیں یعنی کہ...." میرا دماغ جیسے کھول رہا تھا۔ حالانکہ شکل سے وہ ایسی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ پر شکلوں کا جتنا دھوکا مجھے ہوچکا تھا اب تو میں نے شکلوں پر اعتبار کرنا ہی ختم کردیا تھا۔

مگر اگلے دن دو ایسے واقعات اوپر تلے ہوئے جس سے مجھے لگا یا تو وہ لڑکی بہت گھاگ اور شاطر ہے یا حد درجہ بے وقوف۔

ڈرائیور صبح مجھے آفس لے کر آیا اور پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کرکے میرا بریف کیس ہاتھ میں لیے میرے آگے جارہا تھا۔ میں اپنے سیل پر آنے والی مسڈ کال چیک کررہا تھا جب وہ اچانک کھلے گیٹ سے اندر آتے ہوئے میرے پاس رکی۔

"السلام علیکم سر۔ گڈ مارننگ.... سر آپ اوپر جارہے ہیں نا آفس؟"

اس نے پیچھے سے آکر ایک تو اتنا اچانک سلام اور گڈ مارننگ اکٹھے کہا پھر اگلا سوال.... ظاہر ہے میں آفس ہی جارہا تھا۔

میں نے ذرا سی گردن ترچھی کرکے اسے دیکھا۔

وہ کم از کم آفس آنے کے لیے شاید تیار ہو کر نہیں آئی تھی یا سی کلر تھا شاید وہ کہ مجھے رنگوں کی کچھ ایسی پہچان نہیں یا شاید گہرا گلابی مگر شکن آلود اور اس کے بالوں کی بکھری لٹیں پیچھے لگے کلپ یا پھر کیچر سے نکل نکل کر چہرے کے اطراف میں پڑی تھیں۔ لگتا تھا اس نے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"سر! آپ پلیز یہ میری اپلیکیشن.... پلیز زیدی صاحب کو دے دیں۔ میں اپنی امی کو اسپتال لے کر جارہی ہوں۔ وہ باہر رکشے میں ہیں پلیز۔" اس نے میرے جواب کا مزید انتظار کیے بغیر عجلت میں کہا اور ہاتھ میں پکڑا کاغذ زبردستی میرے ہاتھ میں دے کر تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھا۔

"احمق لڑکی میں اس کا چپڑاسی لگا ہوں جو اس کی چھٹی کی درخواستیں جمع کراتا پھروں۔" جانے مجھے کیوں اتنا غصہ آیا۔

میں نے بے اختیار وہ کاغذ پڑھے بغیر دو ٹکڑے کرکے راستے میں اچھال دیا۔

"ابھی ملازمت پر آئے دو دن نہیں ہوئے اور باس کو اس نے چپڑاسی کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کردیا ہے۔ ان جیسی لڑکیاں جاب بھی محض ہابی کے طور پر کرتی ہیں آج زیدی صاحب سے بات کرتا ہوں۔" لفٹ میں کھڑے کھڑے میں نے عائشہ کو جاب سے فارغ کردینے کا پختہ فیصلہ کرلیا۔

مگر آفس میں دس اور بکھیڑے میرے منتظر تھے اور اتنی مصروفیت میں میں یکسر بھول گیا کہ مجھے زیدی صاحب سے بات کرنی ہے بلکہ انہوں نے کام کے دوران ایک بار عائشہ کے نہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے کچھ تشویش کا اظہار کیا۔

"یہ آپ نے کس قسم کی لڑکی کو اپائنٹ کیا ہے۔"

مجھے اس کی بات پر اپنا غصہ یاد آگیا۔

"بہت ضرورت مند ہے سر! اگرچہ تعلیم اور تجربہ دونوں کم تھے مگر...."

زیدی صاحب بات کرتے کرتے رکے۔

"اور سر! ایک بات اور...."

"جی کہیے۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"وہ غفار صاحب ہیں نا! ایڈمن میں انہیں آج صبح ہارٹ اٹیک ہوگیا آج اگر آپ مجھے تھوڑا جلدی جانے کی اجازت دیں تو میں گھر جانے سے پہلے ان کی عیادت

کرتا جاؤں۔"

غفار صاحب میرے اسٹاف کے بہت ایماندار اور محنتی شخص تھے۔ مجھے ان کے ہارٹ اٹیک کا سن کر تکلیف ہوئی۔

"زیدی صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" میں نے ذرا توقف سے کہا تو زیدی صاحب کا چہرہ کھل سا گیا۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک درمیانے درجے کا اسپتال تھا جہاں صفائی کا نظام بھی ناقص تھا اور اسٹاف بھی خاصا غیر ذمہ دار۔۔۔

غفار صاحب کی حالت اب قدرے بہتر تھی مگر ابھی بھی وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے اور کمرے کی حالت دیکھ کر کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ آئی سی یو ہے۔

میں تھوڑی دیر بیٹھ کر پھولوں کا بکے اور سفید لفافے میں کچھ رقم غفار صاحب کے سرہانے رکھ کر نکل آیا۔

زیدی صاحب ابھی وہیں بیٹھے تھے۔ میں اسپتال کی حالت دیکھتا باہر کی طرف جارہا تھا جب اچانک برآمدے کے موڑ پر مجھے عائشہ مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں نسخہ تھا۔ شاید وہ دوائیاں لینے جارہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

"تو واقعی اس کی والدہ بیمار ہیں۔" میں نے اسپتال میں اس کی موجودگی پر کچھ ہمدردی سے سوچا۔

"سر آپ یہاں۔۔۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"ہاں وہ ہمارے ایک اسٹاف ممبر ادھر ایڈمٹ تھے۔ ان کی عیادت کو آیا تھا۔ آپ کی مدر یہاں ایڈمٹ ہیں؟"

"یس۔۔۔ سر۔۔۔!"

"میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ آئی مین ان کی خیریت پوچھنے کے لیے۔"

"نن۔۔۔ نہیں سر۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے، ابھی وہ ہوش میں نہیں۔" وہ یکدم گھبرا گئی۔

"کیا حالت زیادہ خراب ہے۔"

"نو سر۔۔۔ ٹھیک ہیں۔ سو رہی ہیں۔" وہ فوراً سے پیشتر بیان بدل کر بولی۔

"مگر ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، وہ بے ہوش ہیں۔"

"نو سر! پہلے تھیں۔ اب تو بہتر ہے مگر سو رہی ہیں۔" وہ صاف مجھے ٹرخا رہی تھی۔

"او کے پھر میں چلتا ہوں۔ آپ ان کو میری طرف سے پوچھ لیجیے گا اور اگر میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بلا جھجک کہہ دیجیے گا۔ خدا حافظ۔" میں کہہ کر جانے لگا۔

"سر پلیز۔۔۔" وہ میرے سامنے آتے ہوئے بولی۔ "آپ نے شاید مائنڈ کیا ہے۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں اگر وہ سو رہی ہیں تو انہیں آرام کرنے دیں۔ اس میں مائنڈ کرنے والی کون سی بات ہے۔" میں خلاف طبیعت برا مانے بغیر بولا۔ شاید اس کی اسپتال میں موجودگی نے میرے دل کو نرم کردیا تھا۔

"سر۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اگر آپ برا نہ مانیں۔" وہ اس دن کی طرح کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔

"جی پوچھیے۔" میں ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

"شاید آپ برا مان جائیں گے۔" وہ بڑبڑائی۔

"او کے سر! پھر بات کریں گے۔ میں ذرا یہ میڈیسن لے آؤں۔ امی اکیلی ہیں ادھر۔"

وہ یک دم معذرت کرکے آگے بڑھ گئی اور میں اس کے عجیب و غریب رویے کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

وہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی پھر اس نے اپنی امی سے بھی مجھے ملنے نہیں دیا۔ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے یا تو یہ لڑکی۔۔۔ کوئی سائیکی پرابلم ہے اس کے ساتھ یا پھر کوئی چکر۔۔۔ کیا چکر ہو سکتا ہے۔" میں خود ہی سوال اٹھاتا اور خود ہی نفی کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"زیدی صاحب! مس عائشہ آئی ہیں؟" اگلے دن

میں نے زیدی صاحب سے پوچھا۔

"تو سر! ان کی مدر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اس لیے۔"

"اچھا!"

"اسی اسپتال میں سر! جہاں غفار صاحب ایڈمٹ ہیں۔ میں کل عائشہ کی مدر کو بھی دیکھنے گیا تھا۔ بے چاری خاصی بیمار ہیں اور عائشہ۔۔۔ اس کی تو حالت دیکھی نہیں جاتی۔ سب ہی کچھ اسے ہی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی مدر بیٹی کی طرف سے بہت فکر مند ہو رہی تھیں۔ کافی دیر مجھ سے اس کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔" زیدی صاحب متاسف لہجے میں کہہ رہے تھے۔

اور میں! میری کچھ عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

اس نے کل زیدی صاحب کو اپنی مدر سے ملوا دیا اور میں نے کہا تو صاف ٹال گئی کہ وہ سو رہی ہیں۔

"کل آپ کس وقت گئے تھے ان سے ملنے؟" میں نے دل کی کھولن دبا کر نارمل لہجے میں پوچھا۔

"اسی وقت۔ آپ کے غفار صاحب کے پاس سے اٹھ آنے کے دس بارہ منٹ بعد میں بھی اٹھ گیا تھا۔ باہر نکلتے ہی مجھے عائشہ مل گئی۔ میڈیسن لے کر آ رہی تھی اسٹور سے۔۔ میں نے کہا آپ کی مدر کی عیادت کر لوں تو بے چاری بہت شکر گزار ہو رہی تھی۔" زیدی صاحب فائلیں اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"آخر اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟" یہ سوال رات تک میرے دماغ میں کسی ہتھوڑے کی طرح بجتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اگلا پورا ہفتہ وہ آفس نہیں آئی۔

آٹھویں روز وہ آفس میں موجود تھی۔

میرے پاس اس وقت احسن بیٹھا تھا جب وہ گیارہ بجے کے قریب کچھ پیپرز پر میرے سائن لینے کے لیے آئی۔

وہ پہلے کی نسبت مجھے خاصی کمزور اور بجھی بجھی سی لگی۔

براؤن یا گرے بجھے ہوئے رنگ کی شلوار قمیص کے ساتھ بلیک دوپٹہ اس کے چہرے کی سوگواری کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ میک اپ سے بالکل بے نیاز صاف رنگت والا سادہ سا چہرہ اور اس کی ناک کے بیچوں بیچ بڑی شان سے چمکتا وہ سیاہ تل۔۔۔

"السلام علیکم سر۔!" مجھے وہ سلام کر چکی تھی۔ سائن کرتے ہوئے میں نے سنا تھا اب وہ دوسرا سلام احسن کو کر رہی تھی۔

"کیسی ہیں مس عائشہ آپ؟" وہ بھی خوش دلی سے بولا۔

"فائن سر۔"

"اودھر ایڈجسٹ ہونے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نو سر۔!" اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

وہ مجھ سے پیپر لے کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

"تم جانتے ہو اسے؟" اس کے باہر جاتے ہی میں نے احسن سے پوچھا۔

"ارے یہ یہاں جاب کرنے سے پہلے سال بھر شجاع انکل کے آفس میں رہی ہے۔ اچھا خاصا سیٹ تھی اور اچھا سیلری پیکیج بھی لے رہی تھی پھر جانے کیوں بغیر کسی وجہ کے ادھر ریزائن کر کے ادھر آ گئی۔" وہ کہہ رہا تھا اور میں کچھ حیران سا سن رہا تھا۔

"اور اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ یہ انکل شجاع کا آفس بغیر کسی وجہ کے کیوں چھوڑ کر آ گئی۔" وہ مطمئن سے انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟ کیوں؟" میں قطعاً "نہ سمجھ سکا۔

"دیکھو نا یار! کہاں وہ انکل شجاع جیسا بڈھا کھوسٹ ایک دم چڑچڑے اور سڑیل مزاج کا باس اور کہاں تم جیسا ینگ اسمارٹ ہینڈسم گڈ لکنگ اور سب سے بڑھ کر بالکل "فارغ البال" باس۔ اب بولو تمہارا پیکیج زیادہ اٹریکٹو ہے یا بے چارے شجاع انکل کا۔" وہ جتانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"شٹ اپ یار کیا فضول ہانک رہے ہو۔" میں جز بز سا ہو کر یہی کہہ سکا۔ "ارے بڑی گھاگ ہوتی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔۔۔ ایک آفس سے دوسرے آفس ایک باس سے دوسرے باس تک کا سفر بڑی سہولت اور بہتر سے بہتر پیکیج کے چکر میں بڑے آرام سے کر لیتی ہیں۔۔" وہ گھٹیا پن سے کہہ رہا تھا۔ میری سوچ ایسی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

"لگتا ہے آج تمہارا کام کا موڈ نہیں، مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے فارغ ہو تو چلو باقی پھر اس رستے میں نکال لینا۔" مجھے سر شجاع ہی سے ایک ضروری کام یاد آ گیا سو اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اور اگلی شام مجھے لگا اس کی ساری پیشن گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گئی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"صاب! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" میں لیپ ٹاپ کھولے مصروف تھا جب فرزند نے آ کر مجھے اطلاع دی۔

"کون ہے؟ اس وقت ایسے موسم میں کون آ گیا۔" میں سستی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

باہر موسم کے تیور اچھے نہیں تھے۔۔ دوپہر بھر میں اکٹھے ہونے والے بادل اب شام گئے گھٹائیں بن چکے تھے جو کسی بھی لمحے برس سکتی تھیں۔

"ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے جی۔ چائے لے آؤں؟" وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے۔۔۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

"ہاں لے آؤ۔" میں سر ہلاتا ڈرائنگ روم میں آ گیا اور سامنے کمرے کے بیچوں بیچ دودھیا روشنی میں کھڑی عائشہ کو دیکھ کر میں لمحہ بھر کو ساکت سا ہو گیا۔

"آپ۔۔۔ یہاں؟" میری حیرت میں ناگواری کا عنصر غالب تھا۔

"السلام علیکم سر۔۔۔ سوری آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے۔" وہ سبز رنگ کے لباس میں تھی اور یہ رنگ اس کی صاف رنگت پر خوب کھل رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ مجھے قطعاً "اچھی" نہیں لگی۔

کچھ احسن کی باتیں دماغ میں گردش کرنے لگیں۔

"ایسی لڑکیوں کا سفر۔۔۔ بہتر سے بہتر باس۔۔۔ بہتر سے بہترین پیکیج کی طرف کتنی سہولت سے طے ہوتا ہے۔" میں بدقت اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھا۔

"کوئی ضروری کام تھا آپ کو تو صبح ورکنگ ڈے ہی تھا۔"

میں نے صاف جتاتے ہوئے کہا کہ مجھے اس کا یوں گھر تک چلے آنا اچھا نہیں لگا۔

"سوری سر۔۔۔ مگر کام مجھے پرسنل نوعیت کا تھا۔" وہ ابھی تک کھڑی تھی اور میرے رویے سے قدرے نروس بھی ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا۔

اب مجھے فرزند کے خوامخواہ نکوسے دانتوں کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"جی کہیے۔" میں رکھائی سے بولا۔

باہر لمحہ بہ لمحہ موسم کے تیور بدل رہے تھے۔ بادل گرجنے لگے تھے۔

"سر! میری والدہ بہت بیمار ہیں۔" اس کی آواز میں نمی سی تھی۔

"اوہ!" میں سمجھ گیا۔ اسے مالی مدد کی ضرورت تھی۔

"یہ بات اس روز آپ مجھے اسپتال میں بھی بتا سکتی تھیں یا آفس میں زیدی صاحب سے کہہ دیتیں اس طرح کے کاموں کے لیے الگ سے اکاؤنٹ موجود ہے۔"

وہ میری بات سن کر تیزی سے پلکیں جھپکنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں شاید کپکپا رہی تھیں جو وہ انہیں بار بار مروڑ رہی تھی۔

"نو سر! یہ بات نہیں ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولی۔

"تو کیا بات ہے، صاف کہیے۔" ڈرائنگ روم میں دودھیا روشنی تھی جو مرکزی فانوس سے چھن چھن کر آ رہی تھی مگر باہر اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"سر! میری مدر… ڈاکٹرز کہتے ہیں وہ شاید چند ہفتے یا چند دن…. انہیں کینسر ہے اور آخری اسٹیج پر ہے۔" وہ بے دردی سے ہونٹ کاٹتی آنسو پیتی بڑے حوصلے سے کہہ رہی تھی۔

ایک پل کو مجھے اپنے رویے پر بے حد ندامت ہوئی۔

"ان کے پاس شاید زیادہ وقت نہیں ہے۔" اس نے لمحہ بھر کو جھکی پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پانیوں سے لبالب تھیں۔

"اور مجھے آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

اس نے رک رک کر بات مکمل کی تھی۔

"مجھ سے مگر کیوں؟" میں حیرت سے بولا۔

"یہ آپ ان سے ملیں گے تو جان جائیں گے۔" وہ ایک قدم میری طرف بڑھی۔

اسی وقت فرزند چائے کے ساتھ لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا اندر لے آیا۔

وہ خاموشی سے فرزند کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔

"مگر میں ان سے کیوں ملوں۔ اس روز میں نے خود آپ سے ریکوئسٹ کی تھی کہ میں ان کی عیادت کرلوں تو آپ نے صاف مجھے ٹال دیا تھا اور بعد میں زیدی صاحب…."

میں منافق کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ سو دل میں باتیں رکھ کر ان کو کینہ نہیں بناتا تھا اس لیے صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

"آپ ان سے ملیں گے تو میرے ٹالنے کی وجہ بھی جان جائیں گے۔ یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے، کل شام میں آپ کا انتظار کروں گی۔" اس نے چھوٹی سی چٹ میرے آگے کی، جسے میں نے پڑھے بغیر مٹھی میں بند کرلیا۔

"بس اتنا یاد رکھیے گا سر! میری ماں کے پاس وقت کم ہے اور…. آپ سے ملے بغیر وہ اس دنیا سے جانا نہیں چاہتیں۔"

تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں کتنی دیر حیران و ساکت کھڑا رہ گیا۔

باہر زور سے بادل گرجے تو مجھے خیال آیا باہر موسم کتنا خوف ناک ہو رہا ہے اور وہ عجیب سی لڑکی ایسے موسم میں اکیلی کہاں جائے گی۔

میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

"صاب! باہر تو وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔" فرزند تھوڑی دیر میں واپس آکر بولا۔

تیز ہواؤں کے ساتھ موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو چکی تھیں۔

"یاد آیا۔ وہ رکشے میں آئی تھیں اور ان کے اندر آنے پر وہ رکشہ باہر ہی کھڑا رہا تھا۔ اسی میں گئی ہوں گی۔" فرزند جاتے جاتے واپس پلٹ کر بتانے لگا۔

یہ موسم اور اس طرح کی لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی بارش مجھے ہمیشہ ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا کرتی تھی۔

ہر بار یہ موسم مجھے اس ظالم رات کی یاد دلا دیتا تھا جب تقدیر کی طرح یہ موسم بھی میرا دشمن بن چکا تھا۔

برسوں پہلے کی اس رات کا ایک ایک منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ مجھے یاد آتا چلا گیا۔

مجھے علاقہ ڈھونڈنے میں تو کوئی خاص دشواری نہ ہوئی مگر گھر ڈھونڈنے میں بہت وقت لگا۔

گھر کیا تھا شاید ایک کمرے پر مشتمل تھا جس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور دوسری طرف شاید باتھ روم تھا۔

دستک دینے سے پہلے میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا کہ شاید میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔

میں نے ابھی دستک دینے کے لیے دروازے پر ہاتھ ہی رکھا تھا کہ دروازہ فوراً کھل گیا۔

وہ کل والے لباس میں اپنا روشن چہرہ اور ناک پر چمکتا تل لیے کھڑی تھی۔

"آیئے پلیز۔" اس نے سلام کرتے ہوئے مجھے راستہ دیا۔

"یقیناً گھر ڈھونڈنے میں آپ کو خاصی دشواری ہوئی ہوگی۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے آہستگی سے

بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چوتھے قدم پر کمرے کا دروازہ تھا جس پر معمولی جالی کا سفید پردہ لہرا رہا تھا۔

"سر! ایک منٹ۔" وہ دروازے سے دو قدم پر ہی رک کر بولی۔ "سر آپ سے ایک التجا ہے۔"

"جی کہیے۔" میں اب اس کی باتوں سے کافی متجسس ہو چکا تھا اور جلد از جلد اس سسپنس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

"سر! صرف اتنا یاد رکھیے گا۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی طاقت ور اور با اختیار کیوں نہ ہو قدرت نے اسے ایک مقررہ ٹائم لمٹ دے رکھا ہوتا ہے کہ اس کی طاقت اور اختیار کی حد اس ٹائم تک ہے۔ اس مقررہ ٹائم لمٹ کے گزرتے ہی قدرت اس سے ساری طاقت، سارا اختیار چھین کر اسے بے بس اور لاچار بنا دیتی ہے اور اگر اس نے اپنے ٹائم لمٹ میں طاقت اور اختیار کے گھمنڈ میں لوگوں کے حقوق کو پامال کیا ہوگا تو پھر اس کی بے بسی و لاچاری بہت قابل رحم ہوگی۔"

میں اس کی بات سن تو رہا تھا مگر سمجھ کم ہی رہا تھا جانے وہ کس حوالے کے پس منظر میں بات کر رہی تھی۔

"سر! صرف اتنا یاد رکھیے گا کہ میری ماں کے پاس تھوڑے سے دن ہیں وہ بھی اس نے قدرت سے رو رو کر مانگے ہیں۔ صرف آپ سے معافی مانگنے کے لیے کہ اس کی طاقت، ٹائم لمٹ گزرتے ہی اسے بے حد قابل رحم بنا چکی ہے پلیز۔" وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اس نے اندر جا کر کمرے کی لائٹ جلائی اور مجھے اندر بلانے لگی۔

"امی! اٹھیے۔ دیکھیے کون آیا ہے آپ سے ملنے۔ ہارون جاوید۔ ہارون بھائی آئے ہیں۔"

کمرے میں مجھے اکلوتے بیڈ پر حرکت سی ہوئی۔ اور عائشہ کے آخری جملے نے کسی بچھو کے ڈنک کی طرح مجھے کاٹا تھا۔

"میں نے سامنے بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھی اس عورت کو دیکھا جو کسی بھی زندہ وجود کا محض سایہ ہی لگ رہی تھی۔ اتنی کمزور اور مدقوق کہ بغور دیکھنے پر بھی معلوم پڑ لی تھی۔

اور اس کے باوجود میں اسے پہلی نظر میں پہچان چکا تھا۔

"وہ۔ وہ تھی جس نے مجھے عورت ذات سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

✲ ✲ ✲

میں ہارون جاوید اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ابا میرے بچپن میں ہی جب میں تین چار سال کا تھا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں دنیا سے گزر گئے۔ میرے ذہن میں ان کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں ہاں جس کو میں نے ابا کہا اور ابا سمجھا اور اس نام کے ساتھ جس کا تصور میرے دماغ پر ابھرتا تھا وہ میرے باپ کا سگا بھائی میرا چچا ہاشم تھا۔

"ہاشم چچا نے ابا کے بعد مجھے یوں اپنی محبت بھری چھاؤں میں سمیٹا کہ میں ایک عرصے تک لوگوں کے بتا دینے کے باوجود انہیں ہی ابا سمجھتا رہا اور ماں نے بھی مجھے یہی سمجھایا۔ یہی بتایا کہ "ہارون! یہی تمہارے ابا ہیں۔ ہمیشہ ان کو اپنے باپ کا سا رتبہ اور عزت دینا۔"

شاید میری ماں کو علم تھا کہ اس نے اتنی جلدی اس دنیا سے چلے جانا ہے اس لیے بار بار یہ نصیحت میرے کانوں میں اتارتی رہتی تھی۔

چچا ابا کے گھر ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔

ماں لوگوں کے کپڑے سی کر مقدور بھر چچا ابا کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ اس گھر میں ہمارے لیے محبت، تحفظ تھا مگر اس احساس کے ساتھ دن رات کچوکے دینے والا ایک دھیما دھیما سا ذلت بھرا احساس بھی تھا۔

وہ تھی چچی امی کی نفرت!

انہیں مجھ سے میری ماں سے بے تحاشا نفرت تھی۔

ہم ان کی بلا شرکت غیرے حکومت میں حصہ بٹورنے جو چلے آئے تھے۔ وہ بھی بغیر دعوت کے ابا کی وفات سے پہلے ہم ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ ابا کی وفات کے بعد چچا ابا نے بیچ کی دیوار گرا کر دونوں گھروں کو ایک کر دیا تھا۔

بس یہیں سے چچی کی نفرت کا دور شروع ہو گیا۔ وہ برملا کہتی تھیں کہ اس دو ٹکے کے چھوکرے کا وجود کل کو ان کے بچوں کا حق غصب کرنے کا باعث بنے گا۔

چچا ابا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

دونوں بیٹے ماں کا پرتو تھے۔ غصیلے اور بد مزاج جبکہ عائشہ چچا ابا کے مزاج و شکل کی جیتی جاگتی فوٹو کاپی تھی۔

سوائے اس کی ناک کا وہ ذرا سا تل جسے میں "دیکھو عشو! چوہا تمہاری ناک پر پوٹی کر گیا ہے۔" کہہ کر چھیڑا کرتا تھا جس پر وہ پہلے لڑتی پھر گھنٹوں رویا کرتی تھی اور ہر بار ماں مجھے خوب ڈانٹا کرتی۔

اور مجھے یاد ہے ماں اکثر چچا ابا سے کہا کرتی تھی "بھائی! یہ عشو تو میری بہو ہے۔ میری امانت ہے آپ کے پاس۔ چند سالوں کے لیے اور چچا ابا "ہاں ہاں کیوں نہیں۔" کہہ کر زور سے سر ہلا دیا کرتے تھے۔

اس وقت میں نہ "امانت" کا مفہوم سمجھتا تھا نہ ماں کی باتوں کا۔

پر شاید ماں کو بھی علم تھا اس کی زندگی تھوڑی ہے سو وہ دو چار دنوں بعد چچا ابا کو یہ والی بات یاد دلانا نہ بھولتی۔ اور ایسے میں چچی امی کچن میں برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتیں بچوں کو بلاوجہ مارنے لگتیں کوسنے لگتیں اور ماں کچھ شرمندہ کچھ خوف زدہ سی منظر سے ہٹ جاتی۔

ان دنوں مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا تھا نہ چچی امی سے نہ ان کے غصے سے۔

میرے آگے میری ماں کی مضبوط ڈھال جو تھی۔

"تم نے خوب پڑھنا ہے ہارون! تمہارے ابا کا خواب تھا کہ وہ تمہیں بہت پڑھائیں گے مگر زندگی نے انہیں مہلت ہی نہ دی۔" ماں اکثر جب میں پڑھ رہا ہوتا۔ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور حسرت بھرے انداز میں مجھ سے کہتی۔

مجھے خود بھی پڑھنے کا شوق تھا اور ذہن بھی بہت اچھا تھا میں دوسری جماعت میں تھا۔ جب ایک رات اچانک ماں چھت سے سوکھے کپڑے اتارنے گئی موسم خراب ہو رہا تھا۔ سب گھر والے سونے کے لیے لیٹ چکے تھے اور کپڑوں کے ڈھیر کے پیچھے سے ماں صحیح طور پر قدم نہ رکھ سکی اور آٹھ زینوں سے یوں لڑھکتی ہوئی نیچے آئی کہ اس کے منہ سے ایک آخری زوردار چیخ نکلی۔

وہ سارے کپڑوں کا ڈھیر اس پر پڑا تھا اور سر کے نیچے سے خون کی نہر سی نکلی چلی آ رہی تھی۔

ہسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ماں نے آخری دو تین سانسیں لیں اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ وہ رات۔ وہ سیاہ گرجتی برستی رات۔ پھر اگلے اٹھارہ سالوں کے لیے میری زندگی میں ٹھہر گئی۔

چچا ابا کی شفقت مجھ پر کچھ اور بھی بڑھ گئی مگر چچی امی کی نفرت ان کے غصے میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

میں صرف اس وقت امان میں ہوتا تھا جب چچا ابا گھر میں ہوتے تھے۔ ان کے گھر سے باہر جاتے ہی میں چچی امی اور ان کے دونوں سر چڑھے بیٹوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتا۔

صرف وہ چھوٹی سی عشو تھی، میری ماں کی چچا ابا کے پاس امانت، جو ایسی عتاب کی گھڑی میں میرے آگے کمزور سی ڈھال بننے کی کوشش کرتی اور اکثر چچی امی کے دو تین ہاتھ بھی کھا جایا کرتی۔

"یہ گھر میرے بیٹوں کا ہے۔ یہ چھوٹا ابھی چھوٹا ہے۔ تم ابھی سے اپنے بچوں کے نام کر دو۔ کل کو کوئی آفت کھڑی کر دے گا۔" چچی امی، چچا ابا سے کہہ رہی تھیں۔

"کلثوم بی بی! یہ گھر ہارون اور ہمارے بچوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔" چچا ابا تحمل سے بولے۔ اور چچی

ای غصے میں بولتی چلی گئیں۔

"ماں باپ مر گئے اور گٹھڑی ہمارے سر دھر گئے ہم نے کیا یہاں یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ پالو پھر پڑھاؤ لکھاؤ اور کل کو جائیداد کا حصے دار بھی بناؤ۔ میں کہتی ہوں آج ابھی یہ فیصلہ کردیا یہ اس گھر میں رہے گا یا میں اور میرے بچے۔" چچی شدید غصے میں تھیں۔

"یہ رہے گا اس گھر میں اور میرے بچے بھی۔ تمہارا جو دل کرتا ہے کرلو۔" چچا ابا نے انہیں چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تو چچی کتنی دیر غصے کی شدت سے بول ہی نہ سکیں۔

"تو پھر ہاشم! تم لکھ لو۔ اس گھر میں صرف میں اور میرے بچے رہیں گے' یہ نہیں رہے گا۔ میں اپنے بچوں کے حصے کا اسے ایک لقمہ تو کیا ایک انچ زمین بھی نہیں دوں گی۔" انہوں نے بڑے دبنگ لہجے میں چچا ابا کا چیلنج قبول کیا تھا اور پھر انہوں نے سچ کر دکھایا۔

اس دن سے میرا اس گھر میں رزق سکڑتے سکڑتے باسی ٹکڑوں پر آگیا۔ وہ بھی عائشہ چھپا کر مجھے دے دیا کرتی ورنہ چچی تو شاید مجھے زہر بھی دینا نہ پسند کرتیں۔

چچا ابا شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ کیسی طوفانی رات تھی' جیسے اس طوفان میں سب کچھ اڑا لے جائے گی۔ مجھ سے ایک معمولی سا شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا اور چچی کو ایک ٹھوس بہانہ مل گیا۔

چچی نے یاسر اور وسیم نے مل کر مجھے اتنا مارا کہ میرے منہ اور سر سے لہو رسنے لگا۔

"نکل یہاں سے' جان چھوڑ ہماری۔ میں تجھے ایک پل کے لیے اس گھر میں نہیں برداشت کرسکتی۔ تو یہاں رہے گا تو میرے بچوں کے حصے کا رزق تیرے پیٹ کا دوزخ بھرتا رہے گا۔ میرے بچوں کے حصے کی محبت ان کا باپ ساری تجھ پر لٹاتا رہے گا اور کل کو اس سانپ کو پال پوس کر اس گھر کا مختار کل بنادے گا۔ میں اس سنپولیے کا سر ابھی کیوں نہ کچل دوں۔ نکل۔۔۔ نکل یہاں سے۔"

ان کے ہاتھ میں جلتی لکڑی تھی اور میرا کمزور وجود۔ وسیم اور یاسر کے ٹھڈے اور اوپر گرجتا برستا آسمان۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔ نہ مارو۔۔۔ اسے امی بھائی۔۔۔ پلیز ابا کو آنے دو۔ ہارون بھائی کو نہ مارو۔" وہ پاگلوں کی طرح کبھی ماں سے لپٹ کر اس کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتی اور کبھی دونوں بھائیوں کے ساتھ۔۔۔ اور وہ ہر بار اسے دھکا دے کر پیچھے کردیتے۔

"چچی امی۔۔۔ چچی امی میں کہاں جاؤں گا۔ باہر بارش ہے اور سردی بھی پلیز مجھے رات۔۔۔ بس ایک رات رہنے دیں۔ میں صبح چلا جاؤں گا۔ چچا ابا کے آنے سے پہلے اللہ کے لیے مجھے مت مارو۔"

ایک نو سالہ بچے کی کمزور فریاد۔۔۔ آخری ضرب میرے سر میں لگی اور میں نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت مرنے کے لیے بارش کے طوفان میں چھلانگ لگادی۔ اور اندھا دھند اس اندھیری سڑک پر دوڑتا چلا گیا اور دل میں قسم کھائی کہ ادھر اب کبھی نہیں آؤں گا۔

اس رات مجھے کوئی رحمت کا فرشتہ کس بڑی گاڑی کا مالک نہیں ٹکرایا تھا بلکہ ایک مفلوک الحال گدڑی پوش فقیر تھا جو مجھے اپنے ساتھ لگا کر اپنی ٹپکتی بہتی چھوٹی سی کٹیا میں لے گیا تھا۔ جہاں اس نے مجھ سے بن پوچھے میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ دودھ کا گرم پیالہ دیا اور میرے آنسو پونچھ کر مجھے لٹا دیا۔ میں سسکیوں سے رو رہا تھا اور وہ میرا سر تھپک رہا تھا۔

"سب آزمائشیں ہیں۔ سب امتحان' جو سمجھ گیا وہ پار لگ گیا جس نے جی کا روگ بنالیا۔ وہ ڈوب گیا۔ سوجا دو گھڑی کو۔ سب بھول کر سوجا۔"

وہ مجھے تھپکتے ہوئے کہے جارہا تھا اور میں ذرا دیر بعد چوٹوں سے اٹھنے والی ٹیسوں سے بے خبر سوچکا تھا۔

"دو راستے ہیں تیری زندگی میں۔۔۔ مٹی اور سونا۔۔۔ مٹی میں مل کر مٹی بن جا۔۔۔ یا مٹی کو سونا بنا دے۔" اس نے اگلی صبح مجھے چائے کے ساتھ روکھی روٹی دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ صرف جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنا ہے تو یہ کاسہ پڑا ہے' پکڑ اور میرے ساتھ چل۔ شہر میں بھکاری بہت' پر دینے والے بھی بے شمار ہیں۔ تجھے بھی تیرے حصے کی بھیک مل جائے گی۔

نہیں تو دوسرا راستہ۔۔۔ شہر میں جگہ جگہ جیب کتروں اور ڈاکے ڈالنے والوں کی تربیت گاہیں ہیں۔ وہاں لے چلتا ہوں تجھے چند دنوں میں "ہنرمند" کردیں گے تیسرا راستہ۔"

وہ رک کر اپنی میلی سی کھچڑی نما سینے تک جھاڑیوں کی مانند بکھری داڑھی میں کھجاتے ہوئے بولا۔

"تیسرا راستہ لمبا طویل ترین اور بہت صبر آزما۔۔۔ جس کے اختتام پر عزت ہی عزت' رزق ہی رزق کہ شہر بھر کے بھکاریوں میں بانٹے اور کمی نہ آئے۔ محنت کا راستہ' صبر اور جانفشانی کا راستہ۔ ایمان داری اور جفاکشی کا راستہ۔۔۔ علم اور عمل کا رستہ۔ عمر تیری چھوٹی ہے' پر شعور تیرا بلوغت کی ڈیوڑھی پر کھڑا ہے کہ میرا رب سائیں جن کو بن ماں باپ کا بناتا ہے' ان کے اندر عجب طرح کی روشنی بھر دیتا ہے۔ ایسی روشنی جو ہر اندھیرے رستے کو اجال سکتی ہے۔ چاہے تو آزما کر دیکھ لے۔ لوگ یتیموں مسکینوں کو حقیر جانتے ہیں۔ دھکے دیتے ہیں۔ رذیل جانتے ہیں اور ذرا سی دیر کے لیے یہ نہیں سوچتے وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہمیں کس مقصد کے لیے یتیم بناتا ہے۔ چنے ہوئے ہوتے ہیں یہ سب یتیم مسکین' میرے مولا کی خاص محبت سے چنے ہوئے' یہ ایسی قابل نفرت دھتکارنے والی مخلوق ہوتے تو کیا وہ اپنے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم پیدا کرتا۔۔۔ ہرگز نہیں بات صرف سمجھ کی ہے۔ برائی کسی میں بھی نہیں۔ صرف انتخاب کا فیصلہ گڑبڑ مچاتا ہے۔۔۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ دوسرا کاسہ چھوڑے جارہا ہوں۔ دل چاہے تو پہلا راستہ اختیار کرلینا۔ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے صرف عزت نفس کو قتل کرکے دو وقت کا رزق۔۔۔ دوسرا رستہ اپنانا چاہے تو شام تک میرا یہاں انتظار کریو۔۔۔" وہ رکا "اور اگر تو نے تیسرا راستہ اختیار کیا تو۔" اس نے مصافحہ کے لیے میرے سامنے اپنا میلا کچیلا بھدا سیاہ ہاتھ بڑھایا۔

"تیری میری یہ آخری ملاقات ہے۔ چلتا ہوں۔"

وہ اپنی رنگ برنگی بدبودار گدڑی سنبھالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہ میری اس گدڑی پوش سے پہلی اور آخری ملاقات تھی کیونکہ میں نے تیسرا راستہ اپنایا تھا۔

ایک لمبا طویل ترین صبر آزما مشقتوں سے بھرا۔۔۔ سیلف میڈ مین کا راستہ اور آج میں وہ کچھ ہوں۔

وہ ہڈیوں کا پنجر اس رات کی شقی القلب عورت چچی امی تھیں۔ جو مجھ سے کچھ بھی کہے بغیر اپنے استخوانی ہاتھ میرے آگے باندھے بس زارو قطار روئے جارہی تھیں۔

اور مجھے۔۔۔ مجھ پر بہت پہلے یہ منکشف ہوچکا تھا کہ ایسا لمحہ میری زندگی میں آئے گا اور میں پہلے سے طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

"مجھے کم از کم اس عورت کو معاف نہیں کرنا۔ ہرگز نہیں۔"

میں اپنے پہلے سے سوچے ہوئے فیصلے کے تحت جھٹکے سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔

"ہارون۔۔۔ ہارون۔۔۔ بھائی۔۔۔ سہیں" وہ اس رات کی طرح میرے پیچھے روہانسی ہوکر لپکی تھی۔

اور میرا پہلے سے سوچا ہوا فیصلہ جیسے ریت کی دیوار بن گیا اور میرے قدموں میں بچھتا چلا گیا۔

صرف ایک لمحہ۔۔۔ جیسے دعا کی قبولیت کا ایک لمحہ ہوتا ہے' اسی طرح انسانوں کے قوی ترین فیصلوں کو بدل جانے کے لیے بھی صرف ایک لمحہ چاہیے ہوتا ہے۔

اور میرا قوی ترین فیصلہ اس ساحر لمحے میں بدل چکا تھا۔ میں مڑا اور اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے اور لب کچھ بولنے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے۔

"میں گاڑی دروازے پہ لے کر آرہا ہوں۔ تم چچی امی کو باہر تک لے کر آؤ انہیں ابھی میں اپنے گھر لے

کر جاؤں گا اور پھر ہسپتال۔"
یہ میں بولا تھا یا میرے اندر سے کوئی اور۔۔۔
بول چکنے کے بعد بھی میں کتنی دیر بے یقینی کی سی حالت میں کھڑا رہا۔

☼ ☼ ☼

"شام کو جلدی گھر آجایئے گا۔ امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔"
وہ خوب صورت شاید نہیں بلکہ یقیناً" تیز گلابی رنگ کے سوٹ میں ہم رنگ لپ اسٹک لگائے بڑے استحقاق بھرے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی (عائشہ میری زندگی میں کیا آئی۔ مجھے رنگوں کی پہچان بھی ہوگئی۔)
"آپ کہتی ہیں تو میں جانا ہی نہیں۔" میں رومانٹک انداز میں اس کی طرف کھسکتے ہوئے بولا۔
اس نے ہنستے ہوئے مجھے پرے دھکیلا۔
"بس زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔" وہ میرے ساتھ پورچ تک آئی اور گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اسے ہاتھ ہلایا اور وہ گیٹ بند ہونے تک وہیں کھڑی مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔
میرا گھر ہی نہیں میرا دل بھی محبتوں سے لبالب بھر گیا تھا۔
دل کشادہ کرنے سے 'معاف کر دینے سے۔ محبتوں سے دلوں کو تسخیر کر لینے سے ویران آسیب زدہ گھر کیسے آباد ہو جاتے ہیں۔
یاسر اور وسیم نے وہ گھر جس کے لیے چچی امی نے برسوں پہلے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا۔ انہوں نے باہر جانے سکے لیے اس گھر کو بیچ ڈالا۔ چچا ابا اس غم سے جو بستر سے لگے تو اٹھ نہ سکے۔
"ابا ہر روز صبح اٹھتے اور دکان پر جانے سے پہلے گھر آنے سے پہلے دو تین گھنٹے آپ کی تلاش میں سارے شہر میں پھرا کرتے تھے اور اپنی موت کے آخری لمحات میں انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آپ کو تلاش کر کے ایک بار ان کے لیے اور امی کے لیے ضرور

معافی مانگ لوں۔"
"عشو بیٹی! اس دنیا کی معافی آسان ہے۔ اس دنیا میں معافی ناممکن۔" وہ پہروں رویا کرتے تھے۔ ان کے آنسوؤں نے میرے دل میں زخم بنا دیے تھے۔
اور سر شجاع کے پاس جاب کے دوران ہی میں نے آپ کو ان کے آفس میں دیکھا۔ مجھے شک گزرا اور مکمل نام جاننے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا۔
اسی لیے سر شجاع کی جاب چھوڑ کر میں نے آپ کا آفس جوائن کیا مگر آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کس طرح سے اپنی ماں کے گناہ کی معافی مانگتی۔۔۔
اور میں جو دل میں سوچتا تھا کہ کبھی اس عورت کو معاف نہیں کروں گا' ایک لمحہ کے آگے ہار گیا تھا۔ رہا سہا اس کے قول نے مجھے پسپا کر ڈالا کہ "ہاشم بھائی! عشو میری امانت ہے آپ کے پاس۔"
صرف ایک معافی کے بدلے مجھے کتنے فائدے ملے تھے۔ لیکن صرف نظر لگ جانے کے ڈر سے ان فائدوں کو نہیں گنتا۔
مجھے خدا نے اس لمبے طویل صبر آزما راستے کے انتخاب پر کیسا خوب صورت انعام دیا تھا۔ پھر میری طاقت میرا اختیار بھی تو ایک ٹائم تک میرا تھا اور اگر میں اس ٹائم لمحٹ میں خدا کے بندوں کے حقوق پہچاننے کے بجائے پامال کرنا شروع کر دیتا تو پھر اس ٹائم لمحٹ کے گزر جانے کے بعد یقیناً" میری بے بسی و لاچاری قابل رحم ہونا تھی اور یہ سراسر نقصان کا سودا تھا۔
ایک معافی کے عوض میں نے کیسے نفع کا سودا کیا۔ آپ بھی اس بات کو مانتے ہیں نا۔

مریم ماہ منیر

زندگی خوبصورت ہے

"تمہیں پتا ہے کہ زندگی..." صائمہ ابھی اپنا فقرہ مکمل بھی نہ کرپائی تھی' مائرہ بول اٹھی۔

"خدا کے لیے اب تم ہر سال کی طرح' وہی گھسا پٹا جملہ دُہرانے نہ بیٹھ جانا۔" مائرہ کے انداز میں تنبیہہ تھی۔ صائمہ اس کے بیڈ پر براجمان ہوچکی تھی۔

"سچ تو سچ ہی ہے نا! کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟" وہ بھری دوپہر اس کے کمرے میں ہاتھوں میں ہیپی برتھ ڈے کا کارڈ لیے موجود تھی۔

"مجھے سچ سے انکار نہیں... لیکن..." مائرہ نے اس کے ہاتھ سے کارڈ پکڑ لیا۔

"لیکن کیا؟" جواب میں صائمہ' مائرہ کو ٹوک کر بولی' کیونکہ اسے علم تھا کہ وش کارڈ کھولتے ہی مائرہ کا موڈ ہر سال کی طرح آف ہوجائے گا۔

"تمہارے اس جملے سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔" مائرہ کارڈ کھول کر ایک نظر اس پر لکھی تحریر پر ڈالتے ہوئے قدرے چڑ کر بولی۔

"کیوں مائرہ! یہ بھی تو سچ ہی ہے نا!" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا تو پھر کیا سچ ہے؟" سوالیہ انداز میں صائمہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو تم کہنا چاہتی ہو اور پچھلے کئی سالوں سے مجھ سے کہتی آرہی ہو۔" وہ کارڈ پلٹ کر اس کے اندر لکھی تحریر صائمہ کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں! تو وہ سچ ہی تو ہے نا! زندگی خوبصورت ہے۔" ایک نظر کارڈ پر ڈال کر وہ قدرے مسکرائی۔

"نہیں۔ زندگی بدصورت ہے' کم از کم میرے لیے تو... اور اب تم اس کی وجہ مجھ سے نہ پوچھنا۔" مائرہ قدرے الجھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے یاسیت عیاں تھی۔

"اس "نہ" پوچھنے کی وجہ؟" صائمہ نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"کیونکہ... کیونکہ... زندگی بدصورت ہے۔ میرے لیے۔" پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

"اور اب مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ زندگی خوبصورت ہے۔" صائمہ کی نگاہیں اب بھی اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"پھر بحث..." مائرہ جھنجلا کر بولی۔

"بحث نہیں' حقیقت... محض حقیقت۔" صائمہ کا انداز وہی تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مائرہ کے قریب آتے ہوئے بولی۔ جواب میں مائرہ خاموش ہوگئی تھی۔ لب بھینچے خاموش' کتنے ہی پل اس خاموشی کی نذر ہوگئے تھے۔

صائمہ جانتی تھی۔ اسے علم تھا۔ مائرہ کی زندگی کا ایک ایک دکھ۔ ایک ایک لمحہ جو اس نے خوشی کی آس میں کاٹا تھا۔ اس امید پر گزارا کہ کیا پتا اگلے لمحے زندگی کا کوئی پل اس کے نام خوشیاں لے آئے۔ اس اگلے پل کی آس میں کتنے ہی پل وہ گزار آئی تھی' زندگی کتنے ہی پل... ان گنت... لاتعداد...

"تمہیں تو پتا ہے نا! تمہیں تو علم ہے نا؟" کمرے کی خاموش فضا میں مائرہ کی آواز ابھری تھی اور صائمہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات کی نفی نہیں کرپائی کہ اگر اس وقت اس کی بات سے انکار کرتی تو وہ جھوٹ کے زمرے میں آتا اور وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن خوبصورت زندگی کی امید بھی توڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اس امید کے سہارے مائرہ کو زندگی کی خوشیوں کی تلاش میں آگے بڑھنے پر اکساتی تھی۔ جبھی تو ہر سال کے آغاز پر اس کی سالگرہ کے موقع پر "زندگی خوبصورت ہے" پر کارڈ پر لکھی تحریر اس کے نام کرتی تھی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ تمہیں تو علم ہے نا! تمہیں تو اس بات سے انکار نہیں ہے نا؟" اس مرتبہ۔۔۔ نظروں میں سوال لیے ایک جتانے والے انداز میں مائرہ نے صائمہ کی جانب دیکھا۔

کیا تھا اس کی نظروں میں' ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ مائرہ کے کندھے پر رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن زبان چپ تھی۔۔ بہت گہری چپ' ایک جامد خاموشی۔

☼ ☼ ☼

بچپن ہی میں مائرہ کے ماں' باپ کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ پھپھو کے گھر پرورش پائی' مائرہ کے حصے میں نفرت کے لاتعداد موسم چلے آئے۔ جنہیں شمار کرنا بھی چاہتی تو مائرہ کو گنتی ہی بھول جاتی تھی' پھر جب اسکول جانے کی عمر آئی تو اس کے حصے میں پرائیویٹ اسکول کے بجائے گورنمنٹ اسکول آیا تھا۔

اس کی پھوپھو کا کہنا تھا۔ "میری تو بہت خواہش تھی کہ میرے بچوں کے ساتھ اس کا بھی داخلہ اچھے اسکول میں ہوتا۔ لیکن پڑھائی میں اس کا ذہن نہیں چلتا تو اسے گورنمنٹ اسکول میں ہی بڑی مشکل سے داخلہ ملا ہے۔"

گھر میں ہر آئے گئے کو اس کی پھپھو کا یہ جواب اس کے ذہن کو سوچنے کے کام میں الجھا دیتا۔ آخر پھپھو نے ان انکل کو ایسا کیوں کہا؟ میرا ایڈمیشن تو اسکول کے پرنسپل نے ٹیسٹ لے کر کیا ہے اور اس میں میری فرسٹ پوزیشن تھی۔"

اس کی پھپھو کے مطابق اس کا کام نہ کرنے والا ذہن اسے بچپن ہی سے بہت سے کام کرنے سکھا گیا تھا۔ اور سب سے بڑا کام تھا' خاموشی۔۔۔ ہر بات کے جواب میں خاموشی۔۔۔ ہر سوال کے جواب میں چپ۔۔۔ ہر جبر کے جواب میں گہری سرد آہ۔

اس نے خود کو کتابوں کی دنیا میں مگن کر لیا تھا۔ ایک خول۔۔۔ ایک حصار' جس میں اس نے خود کو قید کر لیا اور اس حصار کو توڑنے والی صائمہ کی ذات تھی۔

کب؟ کیسے؟ کس طرح سے؟ کس انداز سے؟ اس نے مائرہ کے گرد بنے حصار کو توڑا تھا۔ اکیلے پن کا حصار جسے اس نے کتابوں کی دنیا کا نام دیا تھا اور پھر بچپن سے لے کر جوانی تک اس حصار کو کوئی اور نہیں توڑ پایا تھا۔ ہاں کوشش کی تھی' لیکن کوئی کامیاب نہیں ہو پایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے زندگی کے ہر رخ کو منفی انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ذہن کی تبدیلی کو روکنے کی کوشش میں صائمہ اس کی بچپن کی سہیلی بھی کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

"زندگی میں کچھ نہیں رکھا۔ نفرت ہے مجھے۔"

"زندگی میں بہت کچھ باقی ہے۔"

"اس سے کہیں کم۔۔۔ بہت ہی کم جو میں نے کھویا ہے۔" ایک دن کالج پوائنٹ سے واپسی کے راستے اس نے صائمہ سے کہا تھا' لہجے کی تلخی نے صائمہ کو چونکا دیا تھا۔

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو' اور تم نے تو ایسے کہا ہے جیسے کہ میں بھی تمہاری زندگی کی بے رونقی کا حصہ ہوں۔" قدرے منہ بناتے ہوئے مصنوعی ناگواری لہجے میں سموئے صائمہ بولی۔

"یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ تم ہی تو ہو جس نے مجھے زندگی میں جینا سکھایا ہے۔ مجھے میرے اکیلے پن کو دور کرنے میں مدد کی ہے۔ اس اکیلے پن کو جو بچپن میں میرے ماں' باپ کی موت کی صورت مجھے ملا۔ پھر اس دنیا کے رویوں نے میرے حصے۔۔۔ میرے نام وہ اکیلا پن کیا۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم نے یہ فضول بات کیسے سوچ لی۔" مائرہ خفگی سے بولی۔

"اسی طرح جیسے تم نے اس زندگی کے بارے میں سوچا اور مائرہ! جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے تو میں بھی اسی دنیا کا حصہ ہوں۔ کیا وہ تمام لوگ جنہوں نے تمہاری حق تلفی کی۔۔۔ زندگی کے بے رنگ ہونے کا احساس دلایا۔ زندگی سے نفرت کرنا سکھایا' کیا میرا شمار

ان میں سے ہے؟"

"نہیں۔۔۔ تم ایسی نہیں ہو۔ اس دنیا سے مختلف۔۔۔ از کم میرے لیے تم بہت اچھی ہو۔" مدھم سی راہٹ مائرہ کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

"ے جیسے اور بھی اس دنیا میں بہت ہیں' جو ے لیے اچھے ہیں اور تمہیں ان کا احساس ۔" صائمہ کے لہجے میں گہرائی تھی۔

"مثلاً" کوئی ایک نام لو۔۔۔ میری پھپھو۔۔۔ ان کی اولاد' میرے ماں' باپ کا کوئی ایک رشتہ دار۔۔۔ کوئی ۔" مائرہ جھنجلا ہی تو پڑی۔ ماتھے پر ناگواری سے ابھر آئے۔

"سر ضیاء۔" بے ساختہ ہی صائمہ کی زبان سے ۔۔لا تھا۔ جواب میں وہ خاموش ہو گئی تھی۔

دل میں ایک لفظ سرگوشی کی مانند ابھرا۔ "شاید۔" ۔روہیں اسی لمحے اسی دل کے کسی ایک گوشے میں دفن ہو گیا۔

وہ اردو لیکچرر سر ضیاء کی نظروں میں اپنے لیے ۔ندگی کی رمق دیکھ چکی تھی۔ لیکن کتنے ہی عرصے ۔ وہ دل ہی دل میں اس بات کو جھٹلاتی آ رہی تھی کہ ۔ل ایگزامز کے بعد ہی سر ضیاء نے اس کو شادی کے لیے پروپوز کیا تھا۔

وہ حیران ہوئی تھی۔ اس بات کا اس نے صائمہ سے ۔ی ذکر کیا تو کم و بیش وہ بھی اسی کی طرح حیران ہوئی۔

"کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے۔۔۔ شادی۔۔۔" صائمہ لاپروائی سے

"دماغ خراب ہے۔" مائرہ نے گھورا۔

"بالکل ٹھیک ہے' کوئی شک۔"

"شک نہیں یقین۔۔۔" اپنے الفاظ پر زور دیتے ۔ے مائرہ بولی۔ "لیکن تم نے سر کو کیا کہا؟" چند لمحے ۔ف کے بعد صائمہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" جواب آیا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔ یعنی کہ تمہیں پروپوز کیا۔۔۔ اور تم یعنی کہ تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ واپس چلی آئیں۔"

"نہیں' میں نہیں مان سکتی۔" اس کی بات پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے صائمہ بولی۔

جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی تھی۔

"وہ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟" قدرے اس کے قریب ہوتے ہوئے صائمہ نے نہایت رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"کون؟"

"سر ضیاء' کہیں ان کا سر تو نہیں پھاڑ آئیں۔" آنکھوں میں شرارت کی لیے اس نے پوچھا کہ اس کا جواب سن کر مائرہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"نہیں کیا ہے کہ اگر شادی کرنی ہی ہے تو گھر والوں کی مرضی سے۔"

"کیا؟ گھر والوں کی مرضی سے۔" صائمہ قدرے حیرت سے چونکی۔

"ہونہہ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نے ٹھیک کہا نا؟"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے؟" سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ انہیں کیا اعتراض ہوتا ہے۔"

"لیکن تم خود ہی تو۔۔۔ مائرہ! کیا تمہیں نہیں پتا۔۔۔ اور پھر۔۔۔"

"مجھے امید ہے کہ پھپھو اس مرتبہ ایسا نہیں کریں گی۔۔۔ اور اس مرتبہ زندگی مجھے ناامید نہیں کرے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" صائمہ کے دل سے دعا نکلی تھی۔

لیکن درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا۔ سر ضیاء کی والدہ کو سختی سے انکار کر دیا گیا تھا' الزام بھی مائرہ ہی کے سر آیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر سے کہہ اٹھی۔

"زندگی ہے ہی بدصورت۔"

اس وقت بھی اس کے کمرے میں موجود صائمہ اسے ہیپی برتھ ڈے کارڈ کے ساتھ وش کرنے آئی تھی۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد صائمہ واپس چلی گئی۔ وہ نہ صرف اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ اسکول میٹ تھی، بلکہ ان کی ہمسایہ بھی تھی۔ اسی لیے اس کی زندگی کے ups and downs سے اچھی طرح واقف تھی۔

صائمہ کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک مائرہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ حال میں رہتے ہوئے کتنی ہی دیر ماضی کے ڈھیروں واقعے جو اس کی اپنی زندگی سے جڑے تھے۔ جنہیں وہ اب تک فراموش نہیں کر سکی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ دہرا رہی تھی۔ اور اس کی ماضی کی اس فلم کا still بٹن جیسے سر ضیاء تک آکر رک سا گیا تھا۔ یک دم ہی اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔ اور پھر کئی آنسو اس کی پلکوں کی باڑھ توڑے رخساروں کو بھگو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

شام وہ واک کے لیے معمول کے مطابق پارک چلی آئی تھی۔ آج اس کے ساتھ صائمہ نہیں تھی۔

واکنگ ٹریک پر چلتے ہوئے وہ پارک کے درمیان تھی گھاس پر اتر آئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کا دھیان پھر سے صائمہ کی جانب چلا گیا تھا۔

"میرا انتظار کر رہی ہو گی واک پر آنے کے لیے۔ ہمیشہ تو میں ہی اسے گھر سے لیتی ہوں۔ اب اسے کیا پتا کہ آج میں اس کی کوئی بھی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس لیے اسے بتا بتائے ہی چلی آئی۔ اکیلے۔"

سوچتے ہوئے اس نے سامنے جھولوں پر کھیلتے بچوں کی جانب نظر کی۔

"اکیلے۔ کیا یہ اکیلا پن ختم ہو سکتا ہے میری زندگی سے۔" ایک یاسیت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی اور اس نے جوتے کی نوک سے گھاس پر زور سے پاؤں مارا۔

ایک گہری سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہو کر پارک کی فضا میں مدغم ہو گئی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ سامنے پارک میں کھیلتے بچوں پر سے ڈوبتے سورج کی شعاعوں کی شفق لالی پر اس کی نظریں جم ہی تو گئی تھیں۔ دل سے اک آواز ابھری تھی۔

"کتنا حسین منظر ہے۔ قدرت کا شاہکار۔" اور پھر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر وہ قدم بڑھاتی واکنگ ٹریک پر چلی آئی۔

"کیا فائدہ اس حسین موسم کا؟ ہو سکتا ہے کہ زندگی حسین نظر آنے کی بجائے واقعی اس وقت پارک میں موجود کسی شخص کے لیے حقیقت میں حسین ہو۔ درحقیقت میرے لیے اس زندگی کا کوئی ایک بھی حسین لمحہ میرے لیے نہیں ہے۔ اور یہ بات جانتے ہوئے بھی میں صائمہ کو نہیں بتا سکتی کہ مجھے بھی زندگی خوبصورت لگتی ہے.... ایسا محسوس بھی ہوتا ہے، لیکن زندگی کے تلخ تجربوں اور رویوں نے اس احساس پر زخم کے کھرنڈ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے، کبھی کبھی میرا بھی دل کرتا ہے میں بھی زندگی کو خوبصورت کہوں، اسی طرح جیسے میرا دل گواہی دیتا ہے، لیکن میری زبان، میری آنکھیں ساتھ نہیں دے پاتیں۔"

آنکھوں کے سامنے چھائی آنسوؤں کی دبیز تہہ اس احساس پر ایک دھند کی سی کیفیت طاری کر دی ہے۔

"کیا کروں؟ کیا کروں میں؟" ایک سرگوشی کے انداز میں زیر لب اس نے کہا تھا۔ بلکہ اس کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

"وہی جو اب ابھی کر رہی ہیں۔"

"جی۔" اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی تھی۔ اور وہ اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"واک۔ آپ کو واک ہی کرنا چاہیے۔ لیکن کیا

آپ کو ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی اور اندھیرا بھی پھیل رہا ہے۔ پھر آج اکیلی بھی آئی ہیں۔"

وہ جو کوئی بھی تھا اسے دیکھتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا آپ رک کیوں گئیں؟ چلیں نا۔ ویسے بھی چلنا بہت ضروری ہے اور زندگی میں چلنا تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ درست سمت... درست وقت۔" ذو معنی لہجے میں وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"کیسے پتا چلے کہ کون سی سمت درست ہے اور کون سا وقت آپ کے لیے اچھا۔" بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ابھرا تھا۔

ساتھ چلتے وجود کے قدم قدرے آہستہ ہوئے تھے اور اس نے چہرہ مائرہ کی جانب موڑا۔

"دل جو کہے... ایمانداری سے اٹھا قدم... محنت سے کیا کام، آپ کی زندگی کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں۔ کوئی جانے یا نہ جانے۔ کوئی آپ کی محنت کو مانے یا نہ مانے۔ ایمانداری سے اٹھے قدم کو کوئی لاکھ روکنے کی کوشش کرے، لیکن خدا کی ذات سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔" وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔

"کچھ سمجھ آئی یا نہیں۔ یا پھر جو سمجھ تھی وہ بھی گئی؟" وہ مسکرایا۔

"ہوں۔ مجھے تو جتنی سمجھ آئی ہے وہ تو آئی ہی ہے۔ لیکن سر ضیاء لگتا ہے آپ کو میری پھپھو کی بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی یا پھر آپ کی امی نے آپ کو بتائی ہی نہیں۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"نہیں، مجھے علم ہے، لیکن شاید آپ کو علم نہیں کہ آپ کی پھپھو کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور آج آپ کے کہے کے مطابق آپ کے گھر والوں کی مرضی سے میں یہاں آیا ہوں اور مائرہ! میں آپ سے ایک مرتبہ پھر سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ مجھے اپنی زندگی میں ہم قدم دیکھنا چاہتی ہیں۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پارک سے باہر نکل آئے تھے اور سڑک کے ساتھ چلتے فٹ پاتھ پر سر ضیاء کی بات سنتے ہی مائرہ کے قدم تھم گئے تھے۔

"کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ کی پھپھو کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور میری یہاں موجودگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ میری امی اس وقت آپ کی پھپھو کے پاس بیٹھی ہیں اور مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔ آپ کی سہیلی... عزیز از جان دوست آپ کے انتظار میں آپ کے گھر تک چلی آئیں تو امی اور میں آپ کی پھپھو کے پاس بیٹھے تھے۔ وہیں سے پتا چلا کہ آپ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اور اسی نے مجھے آپ کا یہاں واک پر آنے کا بتایا۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہوا؟" زیر لب ادا ہوا تھا۔

"اب ایک دم سے تو ساری باتیں نہیں بتا سکتا، کچھ تو سسپنس بھی رکھنا ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ کو تنگ کرنے کے لیے۔"

"کیا میں ہی ملی ہوں تنگ کرنے کو...؟"

"نہیں اور بھی تھیں، لیکن انہیں تنگ کرنے میں اتنا مزا نہیں آتا، جتنا کہ آپ کو۔" وہ ہنسا تھا۔

"سر!" تنبیہی انداز میں کہا گیا۔

"کیا سر کا دم چھلا ہٹ نہیں سکتا۔"

جواب میں وہ خاموش ہو گئی۔ ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھو لیا تھا۔

"کیا اب بھی آپ کو زندگی خوبصورت نظر نہیں آتی؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے اردگرد کے ماحول پر ڈالی۔ سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں۔ فٹ پاتھ پر چلتے لوگ۔ پارک میں کھیلتے بچے۔ زندگی سے بھرپور گہما گہمی کے بیچ میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا وجود۔

"زندگی خوبصورت ہے۔" بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔ اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس بات کی گواہی اس کی زبان نے بھی دی تھی۔

☼

اُسے آواز دینا ہے

اُسے آواز دینا ہے
اُسے ہنس کے بُلانا ہے
اگرچہ اب ہمارے درمیاں دیوار حائل ہے
ہے میرا راستہ کچھ اور اُس کی اور منزل ہے
اُسے آگے نکلنا ہے
مجھے پل پل ٹھہرنا ہے
مگر گزرے زمانوں میں
ہمارے درد و غم بھی ایک تھے خوشیاں بھی سانجھی تھیں
ہماری زندگی کا خواب نامہ ایک جیسا تھا
الگ کردار تھے دونوں فسانہ ایک جیسا تھا
سو اُس ٹوٹے تعلق کے حوالے سے
گلہ ہرگز نہیں کرنا
نہ اب حرفِ شکایت لب پہ لانا ہے
اگر وہ اتفاقاً راستے میں مل بھی جائے تو
اُسے آواز دینا ہے
اُسے ہنس کے بلانا ہے

طالب انصاری

مجھے کمال کی دُھن ہے کمال کر دوں گا
نظر ملاؤ گے جب عرضِ حال کر دوں گا

وہ دل ہو، دل کی دُعا ہو کہ حرف چاہت کا
تمہیں جو دوں گا بہت دیکھ بھال کر دوں گا

ہے عاجزوں کی محبت میں یہ صفت تو ضرور
تمہارے چہرے کو نخوت سے لال کر دوں گا

فریفتگی بڑی نایاب چیز ہوتی ہے
میں اس چمک سے تمہیں مالا مال کر دوں گا

اِدھر سے گزریں اگر گردشیں زمانے کی
قسم خدا کی طبیعت بحال کر دوں گا

بہت سوال نہ کر مجھ سے داورِ محشر
کہ میں بھی کوئی اَدق سا سوال کر دوں گا

فنا پذیر نہیں آدمی کا حسنِ عدم
جسے جنوں گا اسے لازوال کر دوں گا

عبدالحمید عدم

وہ مرے پاس ہے کیا پاس بلاؤں اس کو
دل میں رہتا ہے کہاں ڈھونڈنے جاؤں اس کو

آج پھر پہلی ملاقات سے آغاز کروں
آج پھر دُور سے ہی دیکھ کے آؤں اس کو

قید کر لوں اسے آنکھوں کے نہاں خانوں میں
چاہتا ہوں کہ کسی سے نہ ملاؤں اس کو

چلنا چاہے تو رکھے پاؤں مرے سینے پر
بیٹھنا چاہے تو آنکھوں میں بٹھاؤں اس کو

وہ مجھے اتنا سُبک اتنا سُبک لگتا ہے
کبھی گر جائے تو پلکوں سے اُٹھاؤں اس کو

یہ میرا دل مرا دُشمن مرا دیوانہ دل
چاہتا ہے کہ سب ہی زخم دِکھاؤں اس کو

شہزاد احمد

وہ سبز رنگ حکایت بحال کی جائے
مکالمے کی روایت بحال کی جائے

ہمارا حال نہ پوچھو، بس اک گزارش ہے
ہماری خاک سے نسبت بحال کی جائے

یہ میرا دل، یہ مرا نامراد وحشی دل
یہ کہہ رہا ہے کہ وحشت بحال کی جائے

ہر ایک ضابطہ منسوخ ہو علی زریون
زمیں پہ صرف محبت بحال کی جائے

علی زریون

[illegible]

[illegible]

محبت،

ہوسٹل میں رہنے والے بیٹے نے باپ کو خط میں لکھا۔
"تین مہینے سے آپ نے مجھے پیسے نہیں بھیجے۔ میں آپ کو کئی خط لکھ چکا ہوں۔ آپ تو کہتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے بڑی محبت ہے۔ تین مہینے سے آپ نے مجھے خرچے کے لیے پیسے ہی نہیں بھیجے۔ یہ کس قسم کی محبت ہے؟"
باپ نے جوابی خط میں لکھا۔
"بیٹا! یہ وہ محبت ہے جو اپنے اظہار کے لیے پیسوں کی محتاج نہیں ہے!"

فراخ دلی،

گھر کی مالکن نئی متوقع ملازمہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہاں ملازمت کرنا اس کے لیے بہت آسان ہوگا اور اس گھر میں وہ خوش رہ سکے گی۔ اپنے گھر کی بہت سی خوبیاں گنوانے کے بعد مالکن بولی۔
"اور... یہاں بچے بھی نہیں ہیں جو تمہیں تنگ کریں۔"
"ارے بیگم صاحبہ! بچوں سے میں تنگ نہیں ہوتی۔ آپ میری وجہ سے خوامخواہ فیملی پلاننگ کا تکلف نہ کیجیے گا۔" متوقع ملازمہ نے فراخ دلی سے کہا۔

مجبوری،

گھر کی ملازمت کے امیدوار کا انٹرویو لیتے ہوئے گھر کے مالک نے قدرے حیرت سے کہا۔
"پچھلے ایک سال میں تم آٹھ نوکریاں چھوڑ چکے ہو؟"
"بس جی... کیا کریں... مجبوری ہے۔" امیدوار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "آج کل اچھے مالک کہاں ملتے ہیں؟"

مطلب،

"میں راشد کو خط لکھ کر بتانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا، میرا وہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"
"تم نے راشد کو پچھلے خط میں کیا لکھا تھا؟"
"میں نے لکھا تھا کہ پچھلے خط میں جو کچھ میں نے لکھا تھا میرا وہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"
ثمرہ، اقرا۔ کراچی

یقین دہانی،

ایک کار سوار کو ٹریفک کانسٹیبل نے روکا اور کہا۔
"میں آپ کا ڈرائیونگ لائسنس دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"وہ تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ گھر بھول آیا ہوں۔" کار سوار نے جواب دیا۔ "لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا دوسری کار والوں کے پاس ہوتا ہے۔"
ایمن، لائبہ۔ آزاد کشمیر

ستم بالائے ستم،

بیوی نے شوہر سے کہا۔
"اے کاش میں چڑیا ہوتی تم جہاں جاتے میں فوراً وہاں پہنچ جاتی۔"
شوہر نے کہا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا تو پھر میں غلیل ہی سے کام چلا لیتا۔"
دینا مصطفیٰ۔ ملتان

سکون،

ایک دوست: "میرے جوتے بہت تنگ ہیں۔"
دوسرا دوست: "تم روزانہ یہی کہتے ہو اور ہمیشہ لنگڑا کر چلتے ہو۔ تم دوسرے جوتے کیوں نہیں لے لیتے؟"
پہلا دوست: "سنو! جب میں گھر پہنچتا ہوں تو عموماً کھانا تیار نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ میرے گھر میں میری ساس اور میرا سالا مع بیوی بچوں کے رہتا ہے۔ میری بیوی تو مریض ہے اور ہائے ہائے کرتی ملتی ہے۔ میری گلی میں گاڑیاں ہر وقت گزرتی ہیں اور ہر گھر میں اونچی آواز میں ڈیک چلتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب میں گھر جا کر جوتے اتارتا ہوں تو بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔"
ملیحہ طاہر۔ جہلم

قابل دید،

ایک صاحب کے پاس موبائل فون تو تھا لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ کارڈ کس طرح ری چارج کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک غلط نمبر ڈائل کیا تو انہیں مندرجہ ذیل ہدایات موصول ہوئیں۔
"براہ مہربانی اپنا حال جاننے کے لیے "1" اور نصرت کے لیے 2 ملائیں۔ شاہ رخ خان سے بات کرنے کے لیے 3، اور سلمان خان کو چھیڑنے کے لیے "4" اور ایشوریہ رائے سے بات یا دوستی کے لیے 5 ملائیں۔"
ان صاحب نے ہدایت سننے کے بعد "5" کا ہندسہ دبایا تو ایشوریہ رائے کے بجائے امیتابھ بچن آسمانی بجلی کی طرح گرج کر بولے۔
"بے شرم۔ دوسروں کی بہو کو چھیڑتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی!"
وہ صاحب گھبرا گئے۔ جلدی سے 4 نمبر ملایا تو سلمان خان کے رونے کی آواز آئی۔
"ارے یار! مجھے اور ٹینشن مت دو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ایک ہفتے سے نیند نہیں آ رہی ہے کیونکہ ایشوریہ رائے نے ابھیشک کے ساتھ شادی کر لی ہے۔"
ان صاحب نے "3" کا ہندسہ ملایا تو اچانک ایک آواز سنائی دی۔
"ک... ک... کاجل تم کہاں ہو؟"
مسلسل شور کی آواز سے وہ صاحب تنگ آ گئے اور "2" کا ہندسہ ملایا۔ اس دفعہ انہیں ایسی آواز سنائی دی جو کسی حادثے سے کم نہیں تھی۔
"ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ کال کرنے کے لیے آپ کے اکاؤنٹ میں کوئی رقم نہیں ہے۔ براہ مہربانی ایک نیا کارڈ دری چارج کریں۔ شکریہ۔ ٹوں... ٹوں... ٹوں۔"

مجبوری،

فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس کی اتنی شہرت ہو چکی تھی کہ مہینوں پہلے کی ایڈوانس بکنگ چل رہی تھی۔ فلم لگی تو پہلے شو میں — پچھلی قطار میں دو خواتین بیٹھی تھیں مگر ان کے درمیان سیٹ خالی تھی۔ انٹرول میں ایک خاتون نے بات چیت شروع کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہا۔
"میں نے یہ فلم دیکھنے کے لیے آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"
دوسری خاتون بولیں۔ "عجیب اتفاق ہے... میں نے بھی آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"
پہلی خاتون بیچ کی خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔
"لیکن نہ جانے یہ کون بدنصیب تھا جو بکنگ کرانے کے باوجود فلم دیکھنے نہیں آ سکا؟"
"یہ سیٹ بھی میری ہے۔" دوسری خاتون نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "دوسرا ٹکٹ میں نے اپنے شوہر کے لیے لیا تھا لیکن اس دوران ان کا انتقال ہو گیا۔"
"اوہ... بڑا افسوس ہوا سن کر۔" پہلی خاتون نے ہمدردی سے کہا۔
"لیکن آپ اپنی کسی دوست یا رشتے دار کو ساتھ لا سکتی تھیں۔"
"خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔" دوسری خاتون نے تاسف سے کہا۔ "لیکن کسی کو بھی ساتھ لانا مشکل تھا۔ وہ سب تو میرے شوہر کے جنازے میں شرکت کرنے گئے ہیں۔"
حنا سلیم اعوان۔ گاؤں اعوان ہانڈی ہری پور

مثال،

ایک ستر سالہ بوڑھے آدمی نے اپنی بیوی سے پوچھا۔
"جب تم مجھے جوان لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے دیکھتی ہو کیا اداس ہو جاتی ہو؟"
بیوی نے ایک نظر اپنے شوہر کو دیکھا اور جواب دیا۔
"قطعی نہیں، کیونکہ ہمیشہ کتے کاروں کے پیچھے بھاگتے

ہیں لیکن وہ انہیں چلا نہیں سکتے۔"

قصور،

گلوکار نے اپنے ہمسائے سے شکایت کی۔
"جب بھی میں گاتا ہوں آپ کا کتا بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔" ہمسائے نے جواب دیا۔
"دیکھیں جی اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے، شروعات تو آپ خود ہی کرتے ہیں نا!"

مصباح گل۔ سرگودھا

شریکِ حیات،

شوہر بے حد بیمار تھا جسے ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا اس کی بیوی بہت پریشان اور فکر مند رہتی تھی۔ وہ خدا سے دعا کرتی تھی کہ اے اللہ! میری جان لے لے اور میرے شوہر کی جان کو بخش دے۔ ابھی عورت یہ دعا مانگ ہی رہی تھی کہ کچن میں بلی نے دودھ میں منہ ڈالا جس سے برتن گر پڑا۔
عورت گھبرا گئی اور سمجھی کہ ملک الموت آ گئے ہیں۔ یہ خیال آیا کہ شاید میری دعا قبول ہو گئی ہو۔ بہت ڈری اور کہنے لگی کہ حضرت! ادھر خیال نہ کریں۔ جس کے لیے آپ آئے ہیں اسے ہی لے کر جائیں۔ وہ اندر پڑا ہے۔"

پروین افضل شاہین۔ بہاولنگر

ستم ظریفی،

بلبل نے جب جگنو کو اپنے پاس سے خاموشی سے گزرتے ہوئے دیکھا تو وہ بڑا حیران ہوا کیونکہ پہلے کی طرح اس نے اسے نہیں کہا تھا کہ آؤ بھائی میں آپ کو آپ کے گھونسلے تک چھوڑ آؤں۔ آخر بلبل خود ہی جگنو سے بولا۔
"بھائی جگنو! اندھیرا بہت ہے، مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔"
یہ سن کر جگنو بولا۔ "بھائی بلبل! پہلے تو میرا روشنی پر کوئی خرچ نہیں آتا تھا مگر جب سے واپڈا والوں نے مجھے روشن دیکھا ہے، انہوں نے مجھے بھی بل بھیجنا شروع کر دیا ہے۔"

صبا طارق۔ گوجرانوالہ

موجود مقام،

انٹرویو میں ایک امیدوار سے پوچھا گیا۔
"اگر ایک آدمی انگلینڈ میں پیدا ہوا ہو، اس نے چین میں شادی کی ہو، فرانس میں ملازمت کی ہو، ساؤتھ امریکا میں بزنس کیا ہو۔ آپ کے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"
"قبر میں۔" امیدوار نے سوچ کر جواب دیا۔

یوں بھی ہوتا ہے،

"میں کتاب خریدنے جا رہی ہوں۔" عینی نے کہا۔
"کیوں؟" عینی کی دوست اقصیٰ نے پوچھا۔
"دراصل میرے منگیتر نے مطالعے کے لیے مجھے ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ کا تحفہ دیا ہے۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

نیا ڈیزائن،

شہزاد کے نئے جوتے میں کتے نے دانت گاڑ دیے۔ جوتا مہنگا تھا، شاہد نے سوچا مرمت کرا لیا جائے۔ اس نے جوتا موچی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"اسے ٹھیک کر دو... اس پر کتے نے دانت مار دیے ہیں۔"
موچی نے جوتے کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"اس کی مرمت تو نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ آپ دوسرا جوتا بھی کتے کو چبانے کے لیے دے دیں۔ دونوں جوتے ایک جیسے ہو جائیں گے، لوگ سمجھیں گے نیا ڈیزائن ہے۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

چالیسواں،

خرم نے جوش سے احسن کو بتایا۔
"میں نے علم نجوم سیکھ لیا ہے۔"
احسن نے حیرانگی سے اسے دیکھ کر پوچھا۔
"اچھا یہ بتاؤ میرا چالیسواں کب ہوگا؟"
خرم نے کہا۔ "تمہارے مرنے کے چالیس دن بعد۔"

حورین زینب۔ کہروڑ پکا

معصومیت،

بارش میں ایک طالب علم اپنے ہاسٹل کے کمرے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا دوست اس کی برساتی پہن کر باہر نکلا ہوا تھا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔
"تم نے میری اجازت کے بغیر میری برساتی استعمال کرنے کی جرأت کیسے کی؟"
دوست معصومیت سے بولا۔ "کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارا سب سے خوبصورت سوٹ بارش میں بھیگ کر خراب ہو جائے؟"

صائمہ جیمی۔ کراچی

دھمکی،

ایک شخص کی بیوی گم ہو گئی تو اس نے اپنی بیوی کی گمشدگی کے بارے میں اخبار میں یوں اشتہار دیا۔
"میری بیوی پچھلے جمعے سے گم ہو گئی ہے۔ اگر کسی نے اطلاع دینے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

اعترافِ گناہ،

تین خواتین گپ شپ کر رہی تھیں۔ سنجیدہ موضوعات پر بحث آ گئے۔
ایک خاتون بولیں۔ "آج کل زندگی کا کوئی بھروسا نہیں بالکل اچانک آ سکتی ہے۔ ہمیں کم از کم ایک دوسرے کے سامنے اپنی سب سے بڑی برائی یا گناہ کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ ابتدا میں کرتی ہوں۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے جو رفاہی تنظیم بنائی ہے، اس کے تمام فنڈز میں خرد برد کر چکی ہوں۔"
دوسری خاتون نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔
"میرا گناہ یہ ہے کہ میں چھ سال سے اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں۔"
تیسری خاتون بولیں۔ "مجھ میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ مجھے جس کا راز معلوم ہوتا ہے وہ میں ادھر ادھر بتاتی ہوں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

جمہوریت،

منیجنگ ڈائریکٹر نے اپنی کمپنی کے بورڈ آف ممبران کے اجلاس میں کسی منصوبے کے بارے میں اپنی کئی تجاویز پیش کیں اور کہا۔
"میں اپنی رائے کسی پر مسلط کرنا نہیں چاہتا میری خواہش ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ لوگوں سے ووٹ لے کر اس کام کا آغاز کر دوں۔"
بورڈ کے ممبروں نے نہایت پسندیدگی سے اپنے منیجنگ ڈائریکٹر کو دیکھا تب ڈائریکٹر نے دوبارہ کہا۔
"ہاں تو اب وہ تمام ممبران جنہیں میری تجویز سے اتفاق نہ ہو اس اعلان کے ساتھ اپنے ہاتھ بلند کر دیں جو اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ استعفیٰ دینا چاہتے ہیں۔"

نمل تاج۔ کراچی

ملاقات،

ایک صاحب پٹی باندھے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا۔
"خیریت تو ہے، یہ پٹی کیوں بندھی ہے؟"
ان صاحب نے کہا۔ "میری کار سے ایک آدمی کو ٹکر لگ گئی تھی۔"
وہ صاحب بولے۔ "تو پھر چوٹ تو اس آدمی کو لگنا تھی اور پٹی بھی اس کے بندھی ہونا تھی؟"
ان صاحب نے کہا۔ "ہاں کل اس شخص سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔"

گھریلو ملازم،

میڈم کی ڈانٹ سن کر ملازم پکار اٹھا
ہر چند سنگ ریزہ ہوں گوہر نہیں ہوں میں
لیکن غلام سمجھے مجھ سے ادب کے ساتھ
نوکر ہوں آپ کا شوہر نہیں ہوں میں

شہلا گلزار۔ کراچی

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے
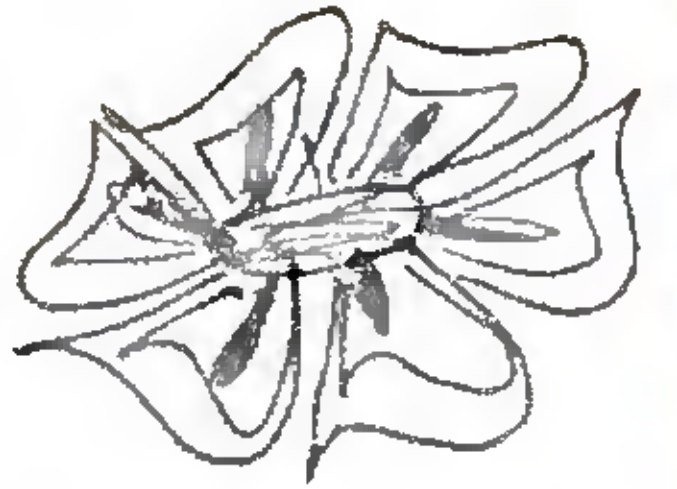
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بیماری کا متعدی ہونا کوئی چیز نہیں۔ بدفالی کچھ نہیں، اور میں اچھی فال کو پسند کرتا ہوں۔“

فوائد و مسائل:۔

1۔ اہلِ عرب کسی کام کے لیے جاتے تو راستے میں بیٹھے ہوئے کسی پرندے یا ہرن وغیرہ کو کنکر مارتے اور دیکھتے کہ وہ کس طرف جاتا ہے۔ اگر وہ دائیں طرف جاتا تو کہتے کام ہو جائے گا۔ اگر بائیں طرف جاتا تو کہتے یہ کام نہیں ہوگا، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اور کام کیے بغیر واپس ہو جاتے۔

2۔ اس انداز سے فال لینا شرعاً منع ہے۔

3۔ ہندسوں اور حرفوں پر انگلی رکھنا، طوطے سے فال نکلوانا اور اس قسم کے مختلف طریقوں سے فال نکالنا سب منع ہے۔

4۔ جائز فال صرف اس قدر ہے کہ بلاارادہ کوئی اچھا لفظ کان میں پڑے اور انسان اس کی وجہ سے یہ امید رکھے کہ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کر دے گا۔ اس میں سننے والے کے قصد و ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ابوجہل کا غرور توڑنے والے،

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

”جنگ بدر شروع تھی۔ میں نے میدان جنگ میں ادھر اُدھر دیکھا، میرے دائیں بائیں دو لڑکے معاذ اور معوذ تھے میں نے سوچا تھا کہ یہ کمسن لڑکے جنگ میں کیا کریں گے اور ان کا کیا کردار ہوگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکا میرے قریب آیا اور سرگوشی میں پوچھنے لگا۔

”چچا! ابوجہل کون ہے اور کہاں ہے؟“

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بات کا دوسرے لڑکے کو پتا نہ چلے۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دوسرا لڑکا بھی میری جانب دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے نے کیا تھا۔ میں حیران ہو کر ان دونوں بچوں کا منہ تک رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ ان بچوں کی ابوجہل جیسے جنگجو کے روبرو کیا بساط ہے۔

خیر میں نے اشارے سے بتایا کہ وہ ابوجہل ہے۔ بجلی کی تیزی سے یہ دونوں شاہین بچے جھپٹے اور آن کی آن میں کسی ایک بہادر جنگجوؤں کے درمیان سے صفیں چیرتے ہوئے ابوجہل پر پل پڑے اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

مصباح گل۔ سرگودھا

گناہ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

”اے گناہ کرنے والے! گناہ کے برے انجام سے مطمئن نہ ہو جانا کیونکہ گناہ کرنے کے بعد بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو گناہ سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ گناہ کرتے ہوئے تمہیں اپنے دائیں بائیں کے فرشتوں سے شرم نہ آئے تو تم نے جو گناہ کیا ہے یہ اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ کیا کریں گے اور پھر تم ہنستے ہو تمہارے گناہ سے بھی بڑا ہے اور جب تمہیں گناہ کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے اور تم اس گناہ پر خوش ہوتے ہو تو تمہاری یہ خوشی اس گناہ سے بھی بڑی ہے اور جب تم گناہ نہ کر سکو اور اس پر تم غمگین ہو جاؤ تو تمہارا یہ غمگین ہونا اس گناہ کر لینے سے زیادہ بڑا ہے۔ گناہ کرتے ہوئے ہوا کے چلنے سے تمہارے دروازے کا پردہ ہل جائے اس سے تم ڈرتے ہو اور اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے اس سے تمہارا دل پریشان نہیں ہوتا تو یہ کیفیت اس گناہ کے کر لینے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہارا بھلا ہو۔ کیا تم جانتے ہو۔

حضرت ایوب علیہ السلام سے کیا چوک ہوئی تھی جس کی وجہ سے اللہ نے ان کے جسم کو ایک بیماری میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کا سارا مال ختم کر دیا تھا۔ ان سے چوک یہ ہوئی تھی کہ ایک مسکین پر ظلم ہو رہا تھا۔ اس مسکین نے حضرت ایوبؑ سے مدد مانگی تھی اور کہا تھا کہ یہ ظلم رکوا دیں۔ حضرت ایوبؑ نے اس کی مدد نہیں کی تھی اور ظالم کو اس مسکین پر ظلم کرنے سے نہیں روکا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

لمحۂ فکریہ،

کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ انسانوں پر خطیب حکومت کریں، جو لمبی تقریروں سے اس طرح سے گونجتے رہتے ہیں جس طرح سے پیتل کے برتن، جو ضرب لگنے کے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں، جب تک ان پر کوئی ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔

(افلاطون)

سمیرا ارم۔ قمبر (سندھ)

مرحلہ در مرحلہ،

ایک شاہی دعوت کے موقع پر بادشاہ سلامت نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں سے سوال کیا۔

”ہر چند کہ ہم نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا ہے مگر اس کے باوجود سرکاری خزانے کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟“

ایک وزیر نے دست بستہ عرض کیا ”جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“

بادشاہ نے فرمایا ”کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

تب وزیر نے برف کا بڑا سا ایک ڈلا اٹھایا اور تجویز پیش کی کہ دعوت میں جتنے لوگ موجود ہیں، ان کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے یہ ڈلا بادشاہ سلامت تک پہنچے۔

اس طرح جب ڈلا ہاتھوں سے گزرتا ہوا بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہنچا تو وہ مٹر کے دانے کے برابر رہ گیا تھا۔

ثمرہ شعیب بٹ۔ گوندلانوالہ

اپنی تعظیم چاہنا،

دسویں عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے ایک دفعہ ملک کے بڑے بڑے علما کو بغداد بلا بھیجا۔ جب سب علما آ گئے اور ایک مجلس میں جمع ہوئے تو خلیفہ بھی اس کی مجلس میں شریک ہونے کے لیے آیا۔ ایک عالم کے سوا باقی سب علما خلیفہ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خلیفہ نے اپنے ساتھ آنے والے ایک وزیر سے کھڑے نہ ہونے والے عالم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”کیا اس شخص نے ہماری بیعت نہیں کی؟“

وزیر نے جواب دیا ”امیرالمومنین! انہوں نے بیعت ضرور کی ہے مگر ان کی نظر کمزور ہے۔ اس لیے کھڑے نہیں ہوئے۔“

یہ سن کر وہ عالم دین جن کا نام احمد بن معدل تھا، فوراً بولے۔

”امیرالمومنین! میری نظر بالکل درست ہے اور میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ میں اس لیے آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہوا کہ آپ کو اللہ کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں شاید آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا علم نہیں ہے کہ جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

یہ سن کر خلیفہ چپ چاپ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والے علما ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ لیکن ایسے فرماں روا بہت کم ہوئے ہیں جنہوں نے رعایا کے کسی فرد کی سچی اور کھری باتیں برداشت کر لی ہوں۔

ہمزہ، اقسراء۔ کراچی

یہ کائنات،

یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے۔ حادثے میں اس قدر حسن نہیں ہو سکتا کیونکہ حسن، حسنِ ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی ترتیب کے بکھر جانے کا نام ہے۔

(واصف علی واصف)

مہوش ملک۔ گنگاپور

مطالعہ،

مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے لیے ایک پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔ (سمرسٹ ماہم)

شازیہ آصف ملک، جنڈانوالہ

ترک کا اطلاق،

آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ جن کے نام حام، سام اور یافث تھے۔ یافث کی اولاد میں ایک شخص ترک نامی ہوا اس کی اولاد چین و ترکستان میں پھیل گئی اور وہ سب ترک کہلائے۔ ترک بن یافث کی اولاد چین و ترکستان و ختن وغیرہ میں خوب پھیل گئی تو انہوں نے امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک شخص کو اپنا سردار تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ رفتہ رفتہ ان کے بہت سے قبیلے اور گروہ پیدا ہو گئے۔ ہر قبیلے اور ہر گروہ نے اپنا اپنا ایک سردار بنایا اور یہ تمام سردار ایک سب سے بڑے سردار کے تحت سمجھے جاتے تھے لہٰذا ترک بن یافث کی اولاد کے ہر قبیلے پر ترک کا لفظ بولا جاتا ہے اور تمام باشندگان چین و ترکستان و ختن "ترک" کہلائے۔

ماخوذ از۔ تاریخ اسلام۔ جلد سوم
مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
اقراء امین۔ منڈو جان محمد

اخلاص،

بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک کے ایک بیٹے کا نام مسلمہ تھا۔ وہ بڑا بہادر اور لائق تھا اور نہ صرف ہر قسم کے ہتھیار چلانے کا ماہر تھا بلکہ دشمنوں سے لڑنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔ اسی لیے والد (عبدالملک) نے اسے اپنی فوج کے ایک حصے کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔

ایک دفعہ مسلمہ بن عبدالملک نے ایک رومی قلعے کا محاصرہ کیا لیکن کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود قلعہ فتح ہونے میں نہ آیا۔ ایک دن مسلمہ فوج کے ایک خاص دستے کو ساتھ لے کر قلعے پر ایک زوردار حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ قلعہ میں موجود رومی فوج نے اس دستے پر تیروں اور آگ کے گولوں کی بارش کر دی جس سے اس کے لیے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ ایک مجاہد جان ہتھیلی پر رکھ کر تیروں اور آگ کی بارش میں دیوانہ وار قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے جان کی بازی لگا کر دیوار میں نقب لگائی۔ یہاں تک کہ اس میں شگاف ہو گیا۔ اس اثنا میں حملہ کرنے والا فوجی دستہ بھی ڈھالوں کی آڑ لیتا ہوا مار کر قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ چند بہادروں نے اس شگاف سے قلعے کے اندر داخل ہو کر اس کا دروازہ کھول دیا۔ اب ساری فوج تکبیر کے نعرے لگاتی قلعے میں داخل ہو گئی۔ رومیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب سارے لوگوں کی نگاہیں اس بہادر مجاہد کو تلاش کر رہی تھیں جس نے جان پر کھیل کر قلعے کی دیوار میں نقب لگائی تھی لیکن کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ مسلمہ نے پورے لشکر کو جمع کیا اور اس کے سامنے اعلان کیا کہ جس مجاہد نے قلعے کی دیوار میں نقب لگائی وہ سامنے آئے۔ لیکن اعلان کے جواب میں پورے لشکر پر سناٹا چھایا رہا اور کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ اب مسلمہ نے بلند آواز سے کہا۔

"میں اس مجاہد کو اس کے رب کی قسم دیتا ہوں کہ وہ سامنے آ جائے۔"

اچانک فوج میں سے ایک نقاب پوش (چہرے کو کپڑے سے ڈھانپے ہوئے) مجاہد آگے بڑھا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ مسلمہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"اے امیر! نقب میں نے لگائی۔ اگر آپ مجھے رب کی قسم نہ دیتے تو میں کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا۔ اب میں آپ کو رب کی قسم دیتا ہوں کہ مجھ سے میرا نام نہ پوچھیے گا اور اگر آپ کو معلوم ہو بھی جائے تو کسی کو نہ بتائیے گا۔ کیونکہ میں نے جو کچھ کیا، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا۔ میں اس کام کا صلہ اللہ تعالیٰ ہی سے چاہتا ہوں اور کسی قسم کے انعام کی مجھے خواہش نہیں۔"

مسلمہ اب خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ جب دعا کرتا تو کہتا۔

"اے اللہ! مجھے نقب لگانے والے اس مجاہد کے ساتھ کر دیجیے گا۔"

راج نیتی،

دنیا میں صرف وہ قوم راج کرتی ہے۔

- جو دلیل سے قائل ہو جاتی ہے۔
- جو عذر کو قبول کر لیتی ہو۔
- جو اختلاف رائے کو تحمل کا حسن گردانتی ہو۔

- جو تحقیق کی مداح ہو۔
- جو تجربے کو ہمدم و ہم نشین رکھتی ہو۔
- جو سر پہ عزت نفس کا کلہ باندھتی ہو۔
- جو کوشش کے جوتے پاؤں سے لپٹائے رکھتی ہو۔
- جو قانون کو زیور کی طرح عزیز رکھتی ہو۔
- جو مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتی ہو۔
- جو ہر دماغ کو سوچنے اور ہر ہاتھ کو مثبت کام کرنے کی آزادی دیتی ہو۔
- جو چند لوگوں کو حکمران رکھتی ہو۔

نقش۔ صادق آباد

بڑے لوگوں کی سنہری باتیں،

○ دوست کی ناکامی پر غمگین ہونا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کی کامیابی پر مسرور ہونا۔
(آسکر وائلڈ)

○ جوش اور ہوش بہت کم یکجا ہوتے ہیں لیکن جس میں یہ دونوں وصف موجود ہوں اسے کبھی لغزش نہیں ہوتی۔
(ایمرسن)

○ میرے نزدیک صداقت ایک جامد یا طے شدہ امر نہیں۔ سچائی تغیر پذیر ہے جہاں یہ بڑھتی ہے وہیں بدلتی رہتی ہے۔
(ایمرسن)

○ حسن سیرت برائیوں سے پرہیز کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ذہن میں برائیوں کے ارتکاب کی خواہش نہ پیدا ہونے کا نام ہے۔
(برنارڈ شا)

○ بد بختی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کا خمیازہ زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔
(آسکر وائلڈ)

○ ادھورا علم خطرے کا موجب ہوتا ہے۔ علم کے چشمے کا پانی سیر ہو کر پیو یا پھر اس سے الگ ہی رہو، چند گھونٹ پینے سے آدمی مدہوش ہو جاتا ہے سیر ہو کر پینے سے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔
(پوپ الیگزینڈر)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

علم کے درجے،

حضرت فضیل ابن عیاض بہت عبادت گزار عالم تھے فرمایا کرتے تھے کہ علم کے پانچ درجے ہیں۔

- پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی خاموش رہنا سیکھے۔
- دوسرا درجہ یہ ہے کہ توجہ سے سننا سیکھے۔
- تیسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ سنے اسے یاد رکھے۔
- چوتھا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ معلوم ہو جائے اس پر عمل کرے۔
- پانچواں درجہ یہ ہے کہ جو علم حاصل ہو اسے دوسروں تک پھیلائے۔

ثمرہ احمد بٹ۔ پتوکی

مختصر مختصر،

- اگر کیفیت یا یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو بھی نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے کیفیت نہیں۔
- شکر کرو، نعمت محفوظ ہو جائے گی، دستر خوان کشادہ کر دو، رزق بڑھے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا۔ عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلا ٹل جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائیں گے۔
- انسان جس کیفیت اور عقیدے میں مرے گا اسی میں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقت رخصت کلمہ نصیب ہو۔
- جو شخص اس لیے اپنی اصلاح کر رہا ہے کہ دنیا اس کی تعریف و عزت کرے، اس کی اصلاح نہیں ہو گی۔ اپنی نیکیوں کا صلہ دنیا سے مانگنے والا انسان نیک نہیں ہو سکتا۔ ریا کار اس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے۔
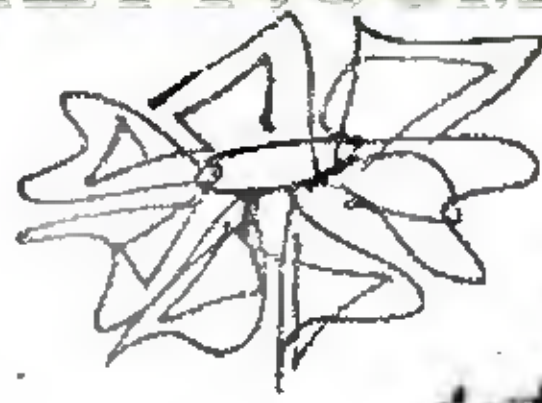
(واصف علی واصف)

شمائلہ عنایت چغتائی۔ لیہ ٹاؤن

سونیا رانی ـــــــــ کاقیاں

ہمیں پچھاڑ کے کیا حیثیت تمہاری تھی
وہ جنگ تم نے بھی نہ جیتی جو ہم نے ہاری تھی
اور اب تمہیں بھی ایک شخص اچھا لگتا ہے
گزشتہ دنوں میں یہی کیفیت ہماری تھی

ثمن چغتائی ـــــــــ خانیوال

شہروں کی دیواروں جیسے ہوتے ہیں
کچھ چہرے اخباروں جیسے ہوتے ہیں
کچھ لوگوں کو دیکھ کے منزل پائی ہے
کچھ انسان ستاروں جیسے ہوتے ہیں

یسریٰ فاطمہ ـــــــــ لاہور

اتنے بن ٹھن کے کب آپ آتے ہیں میرے گھر میں
با خدا اور کہیں آپ کو جانا ہو گا!
آپ کے میٹھے تکلم سے عیاں ہے بالکل
آپ نے پھر کوئی احسان چڑھانا ہو گا

صائمہ سعید ـــــــــ فیصل آباد

ڈال لے مت نقاب چہرے پر
روشنی پر زوال آتا ہے!
آئے تو عاجزوں پر ہی اکثر
حاکموں کو جلال آتا ہے

بشریٰ اقبال ـــــــــ کراچی

ذرے خوددار ہوں تو پاس ان کے
چل کے خود آفتاب آتے ہیں
ظلم جب انتہا سے بڑھ جائیں
لازماً انقلاب آتے ہیں

شازیہ افضال ملک ـــــــــ غزالی پارک

حیرت ہے وہ برسوں کی ہوا باندھ رہے ہیں
ہم کو تو بھر دسا نہیں آتے ہوئے دم کا

مقدس رباب ـــــــــ چکوال

آنکھیں مصروف ہو جاتی ہیں بھلا دیتے ہیں لوگ
بہت دور جا نکلتے ہیں منزلیں گنوا دیتے ہیں لوگ
دستِ طلب اٹھا کے مانگتے ہیں محبت خدا سے
جو ہو دسترس میں تو خود ہی گنوا دیتے ہیں لوگ

طیبہ کریم بخش ـــــــــ بدین

رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا
پھول اتنے بھی خوشنما نہیں تھے

حنا سلیم اعوان ـــــــــ آخون ہانڈی ہری پور ہزارہ

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اداسی کا
میں تجھ سے کیسے کہوں یارِ مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اداسی کا

ساجی چودھری ـــــــــ ٹنڈو آدم

ربطِ باہم پہ ہمیں کیا نہ کہیں گے دشمن
آشنا جب ترے پیغام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

شازیہ رحمٰن ـــــــــ کراچی

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے
تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

فاطمہ مبین ـــــــــ اسلام آباد

روز کی مسافت سے چور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینے پر تھک کے سو گئے دریا
بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

فرزانہ سہیل ـــــــــ میاں چنوں

حالِ دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا
جب گزر جاؤ سلگتی بستیوں سے ایک دن
قریۂ جاں میں بھی آنا یہ نگر بھی دیکھنا

درخشاں بی ـــــــــ جوٹالہ

شہر کی دھوپ سے پوچھیں کبھی گاؤں والے
کیا ہوئے لوگ وہ زلفوں کی گھٹاؤں والے
اب کے بستی نظر آتی نہیں اجڑی گلیاں
آؤ ڈھونڈیں کہیں درویش دعاؤں والے

اُمِ عمیر ـــــــــ ڈرگ روڈ کراچی

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

عائشہ رانا ـــــــــ خانیوال

شام ہوتے ہی یادیں اتر آتی ہیں
جیسے چڑیاں کہیں دور سے گھر آتی ہیں
روز نے جاتی ہیں اک خواب ہوا میں
اور ایک ہی شخص کی دہلیز پہ رکھ آتی ہیں

سلمیٰ ملک ـــــــــ قادر پور

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

ندا تاشیہ شیرازی ـــــــــ جڑانوالہ

مجھ سا جہان میں کوئی نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو
رونا تو یہی ہے کہ اسے چاہتے ہیں ہم
سعد جس کے ملنے کا امکان بھی نہ ہو

ثمرہ اقراء ـــــــــ کراچی

پہلے شکوہ تھا یہاں کوئی رونق بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پیالہ ہے مگر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار نہیں

عقیلہ گجانہ ـــــــــ حجرہ شاہ مقیم

مجھے اچھا لگے محسن
اسے پا کر گنوا دینا

عفت جبیں ـــــــــ فیصل آباد

کام آج گنوا دی عمروں کو جب مٹی میں مل جانا ہے
پھر کیوں رضا یہ پل بھر کے میلے اچھے لگتے ہیں

امبر گل ـــــــــ جھڈو (سندھ)

میری گفتگو کے گلاب سے ہو دلوں میں ایسی شگفتگی
کوئی ایسی نکہتِ خاص ہو کہ مہک اٹھیں در و بام سے
میری آرزو ہے کہ موم ہوں کبھی ان کے دل بھی مرے لیے
جنہیں بیر ہے میری ذات سے جو ہیں بدگماں مرے نام سے

اسماء عروج ـــــــــ گھوٹکی

دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں
ہر حسنِ سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

فوزیہ رحیم ـــــــــ کوٹ ادو

نگاہیں بولتی ہیں بے تحاشا
محبت پاگلوں کی گفتگو ہے
نکل آئے وہ میرے پاس شاید
تجھے کس شے کی اتنی جستجو ہے

شازیہ رانا ـــــــــ دیپال پور

تیری نفرتیں بھی عجیب تھیں ترا فیض بھی تھا کمال پر
کبھی سب کچھ ملا بنا طلب کبھی کچھ نہ ملا سوال پر

ثمینہ شیخ ـــــــــ منڈی بہاؤالدین

ہم لوگ تو خوشبو کی طرح ہیں ترے اطراف
ہم سادہ دلوں سے تو سیاست نہیں کرنا
میں خود کو میسر نہیں آیا ہوں ابھی تک
تم سے بھی نہ مل پاؤں تو حیرت نہیں کرنا

شاعری سچ بولتی ہے

سمیعہ لیاقت

زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب دل کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں شاعری مونس و غمگسار کی حیثیت سے ساتھ دیتی ہے۔ درد، دکھ، چبھن اور بے کلی نے جب لفظوں کا خوبصورت پیراہن زیب تن کیا تو شاعری نے جنم لیا۔
ابتدا ایک خوبصورت شعر سے۔ سب باذوق بہنوں کے لیے۔

کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک کہ کوئی اوجھل نہ ہو
پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ، آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں، رائیگاں کوئی پل نہ ہو

آج کے تیز رفتار زمانے میں جدید ٹیکنالوجی نے فاصلے تو سمیٹ لیے ہیں لیکن دلوں میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہوئی ندا فاضلی کی بہت خوبصورت غزل۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین تو کہیں آسماں نہیں ملتا

جسے بھی دیکھیے وہ اپنے آپ میں گم ہے
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

بجھا سکا ہے بھلا کون وقت کے شعلے
یہ ایسی آگ ہے جس میں دھواں نہیں ملتا

تیرے جہان میں ایسا نہیں کہ پیار نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی، وہاں نہیں ملتا

امجد اسلام امجد کی غزلوں کی خوبصورتی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" سے ایک خوبصورت غزل قارئین کی نذر۔

ہے محبت کا سلسلہ کچھ اور
درد کچھ اور ہے دوا کچھ اور

غم کا صحرا عجیب صحرا ہے
جتنا کاٹا یہ بڑھ گیا کچھ اور

عمر ساری تضاد میں گزری
ہونا کچھ اور، سوچنا کچھ اور

کیسی قسمت ہے آنکھ والوں کی
ہر تماشے میں دیکھنا کچھ اور

بھیڑ میں آنسوؤں کی سن نہ سکا
تم نے شاید کہا تو تھا کچھ اور

دل کسی شے پہ مطمئن ہی نہیں
مانگتا ہے یہ اژدہا، کچھ اور

تیرے غم میں حساب عمر رواں
جتنا جوڑا، بکھر گیا کچھ اور

یہ تو اصول فطرت ہے کہ دکھ کے بیج وہیں جان پکڑتے ہیں جہاں توقعات کے دریا ٹھاٹھیں مارتے نظر آتے ہیں۔ جہاں بہت زیادہ توقع اور مان ہو وہیں دل کا کانچ پیالہ ہر رت میں ٹوٹتا ہے۔

یونہی ہنسی ہنسی میں ہم
دلوں سے کھیل جاتے ہیں
کوئی چھوٹی سی تیکھی بات
کوئی چبھتا ہوا جملہ
کوئی زہر آلود لہجہ
کوئی بے ضرر سی ذو معنی بات
سننے والے کے دل پر گھاؤ لگا جاتی ہے
پھر کتنے ہی تلافی کے مرہم لگاؤ
قطرہ قطرہ خون ٹپکتا ہی رہتا ہے
وہ آنسو جو آنکھ سے گرتا ہی نہیں
اندر ہی اندر جم جاتا ہے
برف پر گرے موم کے قطرے کی طرح
اور وہ برف تو شاید وقت کی گرمی سے
پگھل جاتی ہے
مگر وہ قطرہ جب پگھلنے لگتا ہے
پھیل جاتا ہے، بڑھ جاتا ہے اور
یونہی ہنسی ہنسی میں ہم
دلوں سے کھیل جاتے ہیں

عالم انسانی پر کچھ عجیب وقت ٹھہر گیا ہے۔ چہار سو پھیلی دھندلی دبیز ہے کہ آنے والے کل کا چہرہ دیکھنا دشوار ہوا جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انسان کہاں کھڑا ہے۔ عجیب بے یقینی، لامکانی اور حیرانی کا عالم ہے۔ اس آج سے آنے والا ہر کل خوفزدہ ہے۔ اس خوف کی گونج فراق گورکھپوری کی اس غزل میں بازگشت بنی ہوئی ہے۔

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

وہ سر اٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج

اک موج درد سینے میں لرزاں ہے اس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

اور ایک خوبصورت سا شعر۔

اندھیروں کو برا کہنے سے کچھ نہیں ہو گا
اپنے حصے کا دیا خود ہی جلانا ہو گا

بشیر بدر کے اس شعر میں جو محرومی ہے جو تشنگی ہے اس کو پڑھ کر دل ڈوب سا جاتا ہے۔

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس ایک شخص کو مانگا وہی مجھے نہ ملا

اب ایک ایسی نظم جس میں خلوص کی چاشنی گھلی ہوئی ہے جو بے اختیار یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ کاش یہ سچ ہو" فرحت عباس شاہ کہتے ہیں۔

کبھی کبھی ایک شدید خواہش

چلو کسی کے گھر چلتے ہیں
جس کے گھر کے دروازے پر دربانوں کا راج نہ ہو
جس کے گھر یوں جانے میں ہم کو کوئی لاج نہ ہو
جس کے گھر کی دیواروں پر
اکتاہٹ کا رنگ نہ ہو
جس کے ہونٹوں پر خوشبو ہو
جس کی پیشانی کشادہ ہو
لیکن جس کا سینہ تنگ نہ ہو
جس کی روشن روشن آنکھیں ہم کو دیکھ کے کھل جائیں
اتنی خوشی سے وہ ملے ہم کو
جیسے صدیوں کے بچھڑے دو دوست اچانک مل جائیں
چلو کسی کے گھر چلتے ہیں

اب کچھ آپ کو اپنا تعارف بھی کروائے دیتی ہوں۔ نام وہی ہے جو آج سے اٹھارہ انیس سال قبل ہمارے والدین نے رکھا تھا یعنی سمیعہ لیاقت اور رہنے کا اعزاز بخشا ہے ہم نے ضلع قصور کے ایک پیارے گاؤں "کھتروڈانہ" کو۔ بی۔ اے کے پیپر دیے ہوئے ہیں اور رسائل و ڈائجسٹ کمل بن کر چکے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے مطالعہ کو فرض اولین سمجھتے ہیں۔ جیو اور جینے دو کو اپنا اصول سمجھتے ہیں۔ آج کل فارغ ہیں اور قائداعظم کے قول کام، کام اور کام پر عمل کرتے ہوئے کام ہی کرتے رہتے ہیں جن میں گھر کے کام کاج کے علاوہ ادھر ادھر پنگے لینے والا کام بھی شامل ہے۔

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
Shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ ہم کو' ہمارے شہر کو' ہمارے پیارے ملک کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ اور وہ لوگ جو پاکستان کے دشمن ہیں' اسے توڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں نیست و نابود کردے۔ آمین۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔

بیگم عائشہ فیاض فیصل آباد سے تشریف لائی ہیں۔

آج کل چڑیاں راجہنبہ' بابل کے گھر آنگن میں اترا ہوا ہے۔ سو شب و روز میں عجیب سا خمار ہے۔ امی کی گود میں سر رکھ کر' لیٹنا' اتنا اچھا تو کبھی کنوارپنے میں بھی نہیں لگتا تھا۔ جتنا پُرسکون اب لگتا ہے۔
ابھی تو جاتی بہار کے پھول باقی ہیں۔ کیا ہوتا جو انہی کے زیور سے سجی سنوری' کوئی کاٹن کا ہلکے رنگ کا جوڑا پہنے دوشیزہ کو لیا جاتا۔
کنیز نبوی' اتنا اچھا نام اور ایسا پیارا کام' سندھ' میرا پہلا عشق' میرے خوابوں کی زمین کا سب سے حسین پڑاؤ' کنیز! تمہارے لکھے ہر لفظ کو اول روز سے میری آنکھیں چوم کر پڑھتی ہیں کہ مجھے ان میں' اپنے سندھ کی خوشبو آتی ہے' محبت کی میٹھی اور سوندھی خوشبو' میں کبھی سندھ نہیں گئی لیکن پھر بھی' بند آنکھوں سے جان لیتی ہوں' پانچ دریاؤں کے سنگم سے بہا سندھو دریا اپنی لہروں میں تصوف کے کیسے راز چھپائے ہوئے ہے۔
"آنکھیں وہی رکھو جس سے محبوبِ حقیقی کا دیدار کر سکو۔ کسی دوسرے کی طرف مت دیکھنا کیونکہ محبوبِ حقیقی بہت غیرت مند ہے۔"
کاش کہ ہم اس بیت کو سمجھ لیں ورنہ اس دنیا کا عشق جتنا بھی شدید ہو انجام کربناک ہی ہوگا۔ سندھیا شاہ کی طرح۔ فائزہ افتخار نے کہانی کو ایسا موڑ دیا ہے کہ اب تو گل سے دوبارہ ہمدردی ہونے لگی ہے۔ "دیوارِ شب" میں' عالیہ نے انتہائی غریب گھرانوں کے مسائل کو مؤثر انداز میں بتایا ہے۔ ہاں معاذ اور جویا کی معصوم سی محبت' مجھے بے حد اچھی لگتی ہے۔
"دس فیصد" ایک ایسا سبق' جو میری نانی اماں نے ہمیشہ خود بھی یاد رکھا اور آج ان کی تیسری نسل تک اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ بات ہے دل کے پورے یقین اور

نیک نیتی کی۔ اسماء قادری کا "آشنائیاں کیا کیا" جانے کیوں دل کو چھوتے چھوتے رہ گیا۔ شاید حاذق اور شارق آپس میں گڈمڈ سے ہو گئے تھے' برا مت ماننا اسماء! میں جانتی ہوں تم اس سے بھی کہیں زیادہ اچھا لکھ سکتی ہو۔ ہے نا!
قانتہ رابعہ' ہمیشہ کی طرح' خاموشی سے میرا ہاتھ تھام کر اللہ جی کے سامنے کھڑا کر دیتی ہیں کہ لو' اب کہو' جو بھی کہنا ہے۔ دل کی ہر بات' آنکھ کا ہر خواب اور سانس کا ہر دھڑکا' اس سے جو تمہیں بے حد حساب چاہتا ہے۔

★ عائشہ! خوب صورت انداز میں تبصرے کا شکریہ۔ حیرت ہے کہ ابھی تک آپ نے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ خود احساس نہیں ہوا تو کیا کسی اور نے بھی احساس نہیں دلایا؟ ہمارا خیال ہے کہ آپ لکھنے کی فطری صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس طرف توجہ دیں۔
آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔
آئندہ تبصرے کے ساتھ ساتھ آپ کی کہانیوں کا بھی انتظار رہے گا۔

مسز عنبر سعید' ٹاؤن شپ لاہور سے لکھتی ہیں۔

مئی کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل پیارا تھا۔ محمود ریاض صاحب سے باتیں کرتے ہوئے تو میں ایک پل کو بالکل بھول گئی کہ یہ شخصیت اب ہم میں نہیں۔
"دس فیصد" بلاشبہ ایک اچھا افسانہ تھا۔ صبوحی جیسے لوگ جو تنگی میں بھی دس فیصد کا خیال رکھتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں اور خالہ جی جیسے خوار۔ لو جناب! اب ہم "زرد موسم" پر پہنچے تو حیرتوں کے پہاڑ ہمارے راستے میں کھڑے تھے' پہلی حیرت ایمن اچھی بیوی بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ تو ساتھ ہی کسی کانون اور بزادے کر جانا حیران کر گیا۔ "داجی ڈھولن یار وی" میں گل پر بہت ترس اور یا سر پر بہت غصہ آیا' ساتھ ہی چھنو پر پہلے غصہ اور آخر میں ہمدردی۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔
سب سے آخر میں ذکر کروں گی اپنے پسندیدہ ناول "تشنگی کا سفر" کا۔ پیارے صوبہ سندھ کے باسیوں پر مشتمل کہانی سندھ کی یاد تازہ کر گئی۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں پیدائشی طور پر میرا تعلق سندھ سے ہے اور بچپن سندھ ہی میں گزرا۔ بعد میں کچھ وجوہات کی بناء پر لاہور آ گئے۔ اب بھی سندھ کے حوالے سے کوئی کہانی' ناول' یا ڈرامہ واپس اپنے گوٹھ لے جاتا ہے۔ ناول پڑھ کر اپنا وہ بڑا سا گھر بے اختیار یاد آیا اور وہ اسکول جہاں نیم کے درخت اور لسوڑی کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ وہ دن یاد آئے۔
بہرحال شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بیتوں پر مبنی یہ ناول بہت اچھا رہا' بس انجام کچھ الجھا سا لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کراڑ جھیل پر ماروی گئی یا سندھیا اور ماروی کو کس سے محبت ہوئی؟

★ پیاری عنبر! ماروی کو کس سے محبت ہوئی؟ یہ آپ کنیز نبوی کے آئندہ ناول میں جان لیں گی۔ جب ماروی کی کہانی شائع ہوگی۔ کراڑ جھیل کے کنارے ماروی ہی گئی تھی سندھیا نہیں۔
شعاع کی محفل میں شرکت کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ٹنڈو محمد خان سے صاعقہ جیلانی شریک محفل ہیں۔

سب سے پہلے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھیں جو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ کنیز نبوی کا مکمل ناول زبردست تھا۔ کہانی طویل ہونے کے باوجود دلچسپ رہی انہوں نے سندھ کی ثقافت اور ماحول کی بہت اچھی طرح عکاسی کی' خاص طور پر جیجی کا کردار بہت خوب صورت تھا۔ اللہ اور اس کے حبیبؐ کا عشق ہی سچا عشق ہے' بندے کا عشق تو لاحاصل ہوتا ہے۔ شاہ لطیف کے بیتوں کو انہوں نے بہت خوب صورتی سے ناول میں استعمال کیا۔ شاہ سائیں کی شاعری کا لفظ لفظ بھید ہے۔ بندہ اس کی گہرائی میں جائے تو دنیا کا بھید پالیتا ہے۔ نور العارفین جیسے مرد ہمارے معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ اسماء قادری کا مکمل ناول بھی بہت اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔
★ پیاری صاعقہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ کنیز نبوی اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ایڈووکیٹ مدیحہ عدنان' راولپنڈی سے لکھتی ہیں۔

عالیہ بخاری کے ناول میں سالار کا کردار پراسرار سا لگا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ خیام کا تعلق کہیں نہ کہیں زدیہ کے والد سے ہوگا۔ "زرد موسم" میں شاید موموکی صورت میں قدرت نے مہر النساء سے انتقام لینے کی ٹھانی ہے۔ کنیز نبوی کے ناول میں کچھ باتیں ادھوری رہ گئیں۔ ماروی کے باپ اور اس کی ماں کے متعلق شروع میں ذکر کر کے بعد میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ مرتضیٰ کے اغوا کے متعلق بھی کچھ نہ بتایا گیا کہ اسے کس نے اور کیوں اغوا کیا تھا۔ بہرحال ناول میں تصوف کی جھلک نظر آئی جس نے ناول کو خوب صورت بنا دیا۔ اسماء قادری کی کہانی کی وہی پرانی تھیم تھی۔ ثانیہ اور دانیہ کے ناموں کی از حد مماثلت نے کہیں کہیں کنفیوژ

بھی کیا۔

★ پیاری مدیحہ! خوش آمدید' مرتضیٰ کو کسی نے غلط فہمی میں اغوا کر لیا تھا یہ وضاحت ناول میں موجود بھی تھی شاید آپ نے توجہ نہیں دی۔ ماروی کی کہانی علیحدہ مکمل ناول کی صورت شائع ہوگی۔

نامعلوم شہر سے ایبہا مسکان سعید نے لکھا ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لکھنے کی خواہش میرے اندر ننھی سی کونپل سے تناور درخت بنتی جا رہی ہے۔ آپ کے کوئی بھی رسپانس نہ دینے کے باوجود بھی بہت ہمت اور صبر سے اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب میرا کچھ لکھا ہوا شعاع میں جگہ پائے گا۔

★ ایبہا! دعائیں۔ ہمت نہ ہارنا ہی اصل کامیابی ہے۔ کوشش کرتی رہیں ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔

انیلا کلثوم' آزاد کشمیر سے تشریف لائی ہیں۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ بہت پیاری تھی۔ "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" پڑھ کر ایمان کو تازہ ہوا کا جھونکا ملا۔ بڑے عام فہم انداز میں قاتل و مقتول کے بارے میں لکھا گیا۔

"مقتول کے وارث اگر قاتل کو معاف کر دیں تو کیا دنیاوی سزا کے ساتھ آخرت کی سزا بھی معاف ہو جاتی ہے؟"

سلسلے وار ناولز میں سب سے پہلے "زرد موسم" راحت جبیں کا ناول پڑھا موجودہ ناولز میں سے یہ میرا فیورٹ بلکہ ہارٹ فیورٹ ناول ہے۔ جبیں سسٹرز کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایسے جان دار انداز میں منظر نگاری کرتی ہیں کہ ایک ایک لفظ ایک ایک سین آنکھوں کے سامنے پھرتا نظر آتا ہے۔ ایک اور بات مجھے اس ناول نے ابھی تک ذرہ برابر بور نہیں کیا۔ اور نہ ہی بے جا طوالت کا شکار محسوس ہوا۔

"دیوارِ شب" عالیہ بخاری کے ناول میں زوبیہ اور سلیمان نے جلد ہی اپنا آپ دکھا دیا۔ اور نامعلوم لاش یقیناً" روزی کی ہوگی۔ مکمل ناولز میں ' اسماء قادری کا "آشنائیاں کیا کیا" حاذق صاحب کا وہی روایتی انداز' پہلے شدید نفرت پھر اچانک معلوم ہوا کہ جدید احساسات میں یہ شدید محبت کا پہلا وار ہوتا ہے تو جھٹ سے عشق کا بخار چڑھ گیا۔ اور ثانیہ بی بی کیسے مس بے خبری "شارق ٹرسٹ" میں مدر ٹریسا بنی رہی۔ دانیہ بیگم سر جھاڑ منہ پہاڑ صحرا کی خاک چھاننے بیٹھ گئی۔ اور ناول کے آخر میں تو حاذق صاحب نے معصومیت کے سارے ریکارڈ ہی توڑ ڈالے۔ فنکشن شیرازی ہاؤس میں منعقد ہے اور صاحب بہادر کو خبر ہی نہیں۔ کنیز نبوی کا "تشنگی کا سفر" ہمارے لیے بھی تشنگی چھوڑ گیا۔ میں ماروی کو ہیروئن سمجھتی رہی۔ اور اس کی والدہ کی ٹریجڈی کو ختم کیے بغیر ناول ختم ہو گیا۔

زہرہ ممتاز کا ناولٹ "اندھیرے میں اجالا" اچھی کاوش تھی۔

افسانوں میں قانتہ رابعہ کا "احسان" بس اچھا تھا۔ متعاہل تابش کا "مکافات عمل" ایک زبردست تحریر تھی۔ سبق آموز اور قدم قدم پہ یاد رکھنے والی اس ماہ کی سب سے اچھی تحریر (میرے مطابق) سیما بنت عاصم "دس فیصد" کے ساتھ سو فیصد تھی۔ جتنی تعریف کروں کم ہے۔ زبردست بہت ہی زبردست۔

انٹرویوز میں 'ایف ایم 101 کے صداکار' سجاد نواز' کی باتیں پسند آئیں۔ ایف ایم کے صداکاروں سے انٹرویوز کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

محمود ریاض صاحب سے ناصرہ تسنیم کی ماضی میں ہونے والی ملاقات کا احوال پڑھا۔ اتنے بڑے انسان اور اتنی عاجزی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ برصغیر پاک و ہند کے ادب دوست خواتین و حضرات جو آج سے پچاس سال قبل ادب کو زندہ رکھے ہوئے تھے ان کے لیے گئے عرصہ قبل کے انٹرویو زان کی تصاویر کے ساتھ ایک بار پھر سے شائع کریں۔

★ انیلا! آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ ہم نے خواتین ڈائجسٹ کے آغاز میں جن ادیبوں کے انٹرویو شائع کیے ہیں۔ وہ انٹرویو اس سلسلے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

کنیز نبوی کے ناول میں آپ کو تشنگی اس لیے محسوس ہوئی کہ ماروی کی کہانی ابھی لکھی ہی نہیں گئی ہے۔ کنیز نبوی' ماروی کی کہانی لکھ رہی ہیں۔ یہ مکمل ناول کی صورت شائع ہوگی۔ اگر اسی ناول میں شامل کی جاتی تو ناول دو قسطوں پر محیط ہو جاتا۔

اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں تو دنیاوی سزا کے ساتھ آخرت کی سزا بھی معاف ہو جاتی ہے کیونکہ جن گناہوں کا تعلق بندے کے ساتھ ہے یا ان سے کسی بندے کو نقصان پہنچا ہے تو وہ گناہ اسی صورت معاف ہو سکتا ہے جب پہلے بندہ معاف کرے۔

ثمینہ نازدشانی' فتح جنگ (اٹک) سے شریک محفل ہیں۔

"زرد موسم" میں ایمن کا کردار مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ "داسی ڈھولن یاروی" فائزہ افتخار کا بڑا زبردست چل رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں کوئی ناول' یا افسانہ لکھ کر بھیجوں کیا آپ شائع کریں گے؟

★ پیاری ثمینہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا تبصرہ کچھ ادھورا سا لگا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئیے گا۔

کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے فوراً" بھجوائیں۔ اچھی تحریروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

حافظ آباد سے نوشی چوہدری لکھتی ہیں۔

مجھے شعاع پڑھتے ہوئے تقریباً" 10 سال ہو چلے ہیں اور آج میں فخر سے کہہ سکتی ہوں حقیقی معنوں میں زندگی کو برتنا' رشتوں کی نزاکتوں کو نبھانا مجھے شعاع نے سکھایا ہے۔ شعاع بلاشبہ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

فرحت اشتیاق' فائزہ' نمرہ' رخسانہ نگار' عمیرہ اور تازہ اضافہ ہیں نمرہ احمد۔ یہ تمام رائٹرز میری ہاٹ فیورٹ ہیں۔

مئی کے شمارے کا ٹائٹل بس ایویں سا ہی تھا۔ "زرد موسم" بہت ہی رینگ رینگ کے چل رہا ہے۔ راحت جی سے درخواست ہے تھوڑا پیٹرول ڈالیں۔

"دیوارِ شب" کی کہانی بھی رفتہ رفتہ واضح ہو رہی ہے۔ عالیہ جی کردار نگاری خوب کرتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پہ ناول اپنا سحر طاری کرنے میں ناکام ہے۔

مکمل ناول ہمیں اسماء قادری کا بہت پسند آیا۔ اسماء قادری کا طرز تحریر خوب ہے۔

"ڈھولن یاروی" میں ہماری تمام ترہمدردیاں گل کے ساتھ ہیں۔

زہرہ ممتاز اور سیما بنت عاصم ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر لائیں۔ آپی پلیز! تنزیلہ ریاض کو کہیں سے ڈھونڈ لائیں اور انیسہ سلیم سے کہنا ہے کہ ہم "ہمارا کیش ہے ترک رسوم" کی صورت ان کے قلم کی کاٹ اور جولانی کے منتظر ہیں۔

★ نوشی! تفصیلی تبصرہ کے لیے شکریہ۔ آپ کی تجاویز نوٹ کر لی ہیں۔ تنزیلہ ریاض اور انیسہ سلیم تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

امبر گل جھڈو سے تشریف لائی ہیں۔

ہم نے تو بہت کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مگر اس بار شائع ہونے والے ایک ناول نے ہماری ساری محنتوں پر پانی پھیر ڈالا ہے۔ بقول شاعر۔

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں
تیری یاد شاخِ گلاب ہے' جو ہوا چلی تو مچل اٹھی!

بالکل یہی حالت ہوئی تھی ہماری بھی جب ہم نے خوب صورت دل اور خوب صورت سچے جذبے رکھنے والی سوئٹ کنیز نبوی کا پیارا سا ناول پڑھا تھا "تشنگی کے سفر" کو پڑھ کر ایک طویل عرصے بعد ہماری بھی تشنگی دور ہو گئی اور ہمارا دل' ذہن اور روح' بے ساختہ چلائے کہ اب چھوڑ دو تم اپنی انا کو مار دو گولی اور اس پیاری رائٹر اور تحریر کی تعریف نہ کی تو ان کے ساتھ یہ زیادتی کرو گی' سو قلم تھام لیا ہے محبت جیسے عام اور پرانے موضوع پر بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں' مگر کنیز جی نے' جس طرح اپنی دھرتی سے اپنی

اعتذار

ناولٹ "داسی ڈھولن یاروی" اختتامی مراحل میں ہے۔ کہانی میں تجسس عروج پر ہے اور قارئین بے چینی سے قسط کی منتظر ہوں گی لیکن بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ فائزہ ناسازی طبع کے باعث اس ماہ قسط نہ لکھ سکیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ ناولٹ "داسی ڈھولن یاروی" کی قسط شامل اشاعت ہوگی۔

محبت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف اور قابلِ محبت ہے۔

مجھے بہت 'بہت 'بہت فخر محسوس ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ آئندہ بھی ایسی تحریریں لکھتی رہیں اور یہ بات بھی ان کی بہت پسند آئی تھی کہ انہوں نے اپنے ناول کے ذریعے جو میسج دیا ہے۔ وہ بھی اتنے اچھے طریقے سے کہ جس کی تعریف لفظوں میں ممکن نہیں۔ میں اس ناول کو اور لکھنے والی کو ان شاءاللہ تعالیٰ تاعمر نہ بھلاؤں گی۔

بیادِ محمود ریاض کو پڑھا تو اچھا بھی لگا اور دل اداس بھی ہوا یہ سوچ کر ایک اتنا اچھا انسان اب ہمارے درمیان نہیں 'ہماری پیاری مصنفہ راحت جبیں کے ناول کے بارے میں کچھ لوگوں نے سست روی کی شکایت کی ہے اگر یہ طوالت نہ اختیار کرتا تو پھر کہا جاتا کہ جی کچھ تشنگی سی رہ گئی ناول میں 'پلیز' اپنے تبصروں میں تنقید مثبت انداز میں کریں۔

★ پیاری امبر! ہمیں احساس ہے کہ آپ کے پچھلے کئی خط شائع نہ ہو سکے لیکن خط شامل نہ ہونے کی بنا پر آپ نے تبصرہ لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی 'ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ سارے خطوط شامل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا لیکن ہم سارے خط پڑھتے ضرور ہیں تاکہ آپ کی رائے جان سکیں۔

کنیز نبوی اور راحت جبیں تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

سونیا ربانی نے قاضیاں سے لکھا ہے۔

اس بار سارا شعاع کمال کا تھا۔ مجھے سجاد علی سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ اور "داسی ڈھولن یار دی" نے تو اس بار بھاگنا شروع کر دیا۔ لیکن بہت مزہ آیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب "زرد موسم" بھی جلد ہی ختم ہو گا۔

میرا خیال ہے کہ "مکافاتِ عمل" ایسا افسانہ تھا کہ کسی نہ کسی کو سبق ضرور حاصل ہوا ہو گا۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں عائشہ جمال کا انتخاب بہت پیارا تھا۔

★ پیاری سونیا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پہلا خط شائع نہیں ہوا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کومل زہرا نے شہدادپور سے لکھا ہے۔

دلہن کا سرورق دیکھا تو بہت بوریت ہوئی 'سب سے پہلے "پیارے نبی کی پیاری باتوں" سے فیض یاب ہوئے اس کے بعد سلسلے وار ناول میں "زرد موسم" کی قسط پڑھی۔ مجھے یہ ناول بہت پسند ہے۔ مکمل ناول میں کنیز نبوی کا "تشنگی کا سفر" بہت ہی اچھا لگا۔ حیرت ہوئی کہ کوئی سندھیوں کے بارے میں اتنا جان سکتا ہے۔ کیا کنیز نبوی سندھی ہیں؟ ویسے تو ناول مجھے ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ سیما بنت عاصم کا افسانہ "دس فیصد" بہت ہی پسند آیا اور اس بات پر اور زیادہ یقین پختہ ہوا کہ مال خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ میں کافی عرصے سے آپ کے اوران پرچوں کی خاموش قاری ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔

★ پیاری کومل! آپ نے خاموشی توڑ کر قلم اٹھایا اور شعاع کے لیے تبصرہ لکھا 'بہت خوشی ہوئی۔ کنیز نبوی کا تعلق سندھ سے ہے لیکن اس سے پہلے وہ مختلف موضوعات پر بھی لکھتی رہی ہیں۔

راحت جبیں تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سعدیہ حسن قادر پوراں 'ملتان

دس گیارہ سالوں سے میں آپ کے رسائل کی قاری ہوں مگر رائے دینے کی ہمت آج کر رہی ہوں۔ تو اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو جناب کنیز نبوی صاحبہ کا ناول ہے نام جو "تشنگی کا سفر" رکھا تو تشنگی چھوڑ ہی دی۔ خاص طور پر ماروی کے کردار میں 'جو کہ بہت پاور فل کردار تھا۔ اس پر زیادہ نہیں لکھا بہرحال بہت پیارا بہت خوب صورت ناول ہے۔ ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے اس میں بہت سارا سبق ہے۔ ایک بات جو میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ معذرت کے ساتھ کہ آپ نے صرف سندھ دھرتی کی بات کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جو کچھ آپ نے لکھا۔ وہ سچ ہے مگر صرف صوبائی حدوں کی بات نہ کریں 'ایک اکائی کی بات کریں۔ پاکستان کی بات کریں۔ خط لکھنے کی دوسری وجہ ہے ایک اہم مسئلے کی طرف نشاندہی کرنا 'ہم لوگ اللہ کے صفاتی ناموں کا احترام نہیں کرتے 'شکور 'غفور 'رحمان 'رحیم اور دوسرے ناموں

کے ساتھ عبدل نہیں لگاتے یہ سخت گناہ ہے۔ رائٹرز اس بارے میں توجہ دیں۔ ماہا ملک کے "ریگ زارِ تمنا" میں رافع 'نافع 'مومن ناموں کے ساتھ عبدل نہیں لگایا۔ یہ غلط بات ہے۔ پورا درست نام ہونا چاہیے اب بھی انہیں چاہیے کہ درست کر لیں۔ رائٹرز میں ثمینہ عظمت مجھے بہت پسند ہیں۔ عالیہ بخاری کی تو کیا ہی بات ہے۔ فائزہ افتخار 'رخسانہ نگار بہت اچھا لکھتی ہیں اور آپ کے ادارے کے اصول بہت اچھے ہیں۔ آپ سب کی محنت اور کاوشوں کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

★ پیاری سعدیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ایک طویل مدت بعد خاموشی توڑی ہے تو اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

کنیز نبوی کا ناول شاہ بھٹائی کے اشعار اور سندھ کے تہذیبی پس منظر میں لکھا گیا تھا 'اس لیے اس میں سندھ کا ذکر تھا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اس طرف توجہ دلائی۔ ہم خود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔

کنیز نبوی ماروی کی کہانی علیحدہ مکمل ناول کی صورت میں لکھیں گی۔ اگر اس ناول میں ماروی کی کہانی شروع کی جاتی تو یہ ناول دو قسطوں میں شائع ہوتا۔

عارف والا سے انیلا اکرم شریکِ محفل ہیں۔

شعاع میں سلسلے وار کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ خاص طور پر راحت جبیں کی "زرد موسم" یہ ایک رائٹر کا کریڈٹ ہے جو اتنے کم کرداروں کو ساتھ لے کر اتنی اچھی کہانی اتنے مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

"تشنگی کا سفر" کنیز نبوی نے کافی عرصے بعد محبت پہ اتنا زبردست لکھا کہ میں دنگ رہ گئی۔ بہت بہت مبارک ہو۔ آپ اس دفعہ کی بیسٹ کہانی رائٹر ہیں "آشنائیاں کیا کیا" بھی بہت اچھی تھی اور اس کا میسج بھی بہت اچھا تھا۔

فائزہ افتخار نے اس دفعہ تو میدان ہی مار لیا۔ وہ کہانی کو بہترین انداز میں سمیٹ رہی ہیں۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں مگر "دس فیصد" سیما بنت عاصم کا افسانہ انتہائی اچھا تھا۔ اس طرح کی اخلاقی کہانیاں ضرور چھاپا کریں۔ قتیل شفائی میرے پسندیدہ شاعر ہیں 'ان کی غزل پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔

★ پیاری انیلا! آپ نے خط لکھا 'بہت خوشی ہوئی متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

الماس لاہور سے لکھتی ہیں۔

اللہ کے کرم سے لکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ میرے پاس کچھ حقیقی کہانیاں ایسی موجود ہیں کہ اگر میں انہیں کاغذ پر اتار کر پڑھنے والوں تک پہنچاؤں تو یقیناً وہ پسند کریں گے۔

اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا لگا۔ اسماء قادری کا "آشنائیاں کیا کیا" پڑھا تو لگا کہ یہ اس ماہ کی بہترین کہانی ہے۔ مگر جب اس کے بعد "تشنگی کا سفر" پڑھا تو یقین کریں بہت اچھی کہانی لگی مگر دونوں کے پڑھنے کے بعد "آشنائیاں کیا کیا" کی کہانی بہترین تر لگی۔

★ پیاری الماس! کہانی لکھنے کا طریقہ تو آپ جانتی ہیں 'بھجوانے کا طریقہ یہ ہے کہ کہانی ایک لفافے میں ڈال کر اس پر ایڈریس لکھیں اور ارجنٹ میل سروس کے ذریعے بھجوا دیں۔ ایڈریس یہ ہے۔

خواتین ڈائجسٹ '37 اردو بازار کراچی۔

ام عمیرہ نے ڈرگ روڈ سے لکھا ہے۔

اگلے ماہ میری شادی ہے پتا نہیں اور جہاں میں شادی ہو کر جاؤں گی وہاں سے کوئی رابطہ برقرار نہ رکھ سکوں گی یا نہیں۔ پیاری سی ماڈل اس گرمی میں بھی اپنی خوب صورت جیولری 'میک اپ اور ہیوی لباس میں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اس بار موقع محل کے لحاظ سے بہت زبردست رہا۔ کاش مسلمان یہ جان سکیں کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔

"محمود ریاض سے ملاقات" کے کیا کہنے۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہمارے روبرو موجود ہیں۔

"سجاد نواز سے باتیں" آپ کی تعارفی تمہید سے ہم نے بھی سو فیصد اتفاق کیا۔ دستک اس بار کوئی خاص نہ تھا۔

عالیہ بخاری کے ناول نے بالآخر رفتار پکڑ ہی لی بہت مزہ آیا پڑھ کر۔

ناولٹ میں فائزہ افتخار جی نے "داسی ڈھولن یار دی"

میں کمال کر دیا۔ اس ماہ کا بیسٹ ناولٹ رہا۔ زہرہ ممتاز نے بھی اچھا لکھا لیکن کیا کوئی ماں ایسا بھی کر سکتی ہے؟ افسانے تینوں ہی اچھے تھے۔ سیما بنت عاصم اور متعائل تناوش صاحبہ کو مبارک باد۔

ناولز میں "آشنائیاں کیا کیا" اسماء قادری نے یقیناً اس ناول کو لکھنے میں بہت محنت کی' ایک بہت اچھی کاوش تھی یہ گو کہ بہت طویل ہو گیا تھا مگر کہیں بھی پڑھ کر بوریت محسوس نہیں ہوئی ویل ڈن اسماء صاحبہ! کنیز نبوی کے ناول "تشنگی کا سفر" جس کو بے جا طویل کیا گیا جبکہ ماروی کی کہانی ادھوری رہی' مطلب نہ اس کی نانی نے اس کی والدہ کی کہانی سنائی اور نہ ماروی کے کردار کو کھل کر بیان کر سکیں۔

کوشش اچھی تھی اور کہانی کا پلاٹ بھی نیا سا لگا یعنی انہوں نے سندھ کلچر کو خصہ بنایا اپنے ناول کا۔ اتنی جدوجہد کے بعد تو ہیپی اینڈ ہونا چاہیے تھا نہ کہ ایسا رونے والا۔

★ ام عمیرہ! بے حد معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ ہماری جانب سے شادی کی دلی مبارک باد اور دعائیں' زندگی کا یہ موڑ آپ کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

کنیز نبوی کے ناول میں اینڈ رونے والا نہیں تھا۔ یہ تو زندگی کی عمومی سچائیاں ہیں۔ ماروی کی کہانی ادھوری نہیں رہے گی۔ آپ جلد ہی ماروی کی مکمل کہانی پڑھیں گی۔

میر پور آزاد کشمیر سے ربیعہ حسین تشریف لائی ہیں

اس ماہ کا شعاع اول سے آخر تک زبردست رہا۔ سلسلے وار ناول تو چھائے ہوئے ہیں۔ تینوں ناولز اس قدر خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ "داسی ڈھولن" میں گل نے بول کر بہت اچھا کیا بہت خوب! یاسر کی تو ایسی کی تیسی! اس سے اچھا تو کم از کم صغیر احمد تھا..... مکمل ناول دونوں نے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ بہت خوب! کیونکہ دونوں میں پیغام تھا..... افسانوں میں سب سے زبردست بلکہ اس پورے شعاع کی جان "دس فیصد" تھا ماشاءاللہ! اس سے میں نے اتنا کچھ سیکھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ پلیز مجھے بتائیے کہ ایک ناول تھا جس کے کردار "زارون' ہارون' ثانیہ" شاید جبیں سسٹرز میں سے کسی نے لکھا تھا' پلیز بتائیے کب اور کس رسالے میں چھپا اور دوسرا تنزیلہ ریاض کی ایک کہانی تھی "صوفی دادا' تیمور' عائشہ" جس کے کردار تھے' یہ بھی کب اور کس رسالے میں شائع ہوا! ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ دونوں کہانیاں دوبارہ شائع کریں۔

★ پیاری ربیعہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے جن کہانیوں کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ ان کے مصنفین کے نام اور کہانیوں کے عنوان بتانے سے قاصر ہیں۔ ہر ماہ بے شمار کہانیاں نظر سے گزرتی ہیں۔ صرف کرداروں کے نام سے کسی کہانی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ اگر ہماری قارئین کو ان کہانیوں کے نام معلوم ہوں تو بتا دیں۔

لاہور سے شازیہ ملک تشریف لائی ہیں۔

ویسے تو ماڈل بہت خوب صورت تھی مگر گرمیوں میں ٹائٹل ہلکے پھلکے دیا کریں۔ ہمیشہ کی طرح سارا شمارہ ہی زبردست تھا۔ سلسلے وار کہانیاں کچھوے کی رفتار سے رینگ رہی ہیں۔ کچھ تو تیزی لائیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ قانتہ رابعہ کا افسانہ پسند آیا۔ کنیز نبوی نے بہت اچھا لکھا۔

★ شازیہ ملک! ہمیں افسوس ہے کہ ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

آپ نے صحیح لکھا' اسٹار پلس سے ناظرین کی دلچسپی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ لیکن ہمارے چینل بھی کسی طرح اسٹار پلس سے پیچھے نہیں ہیں۔

انٹرویو کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ فی الحال پوری کرنے سے قاصر ہیں۔

زنیرہ اور نایاب نے یہ ای میل ہمیں سیالکوٹ سے بھیجی ہے' لکھتی ہیں۔

میری آپ کو میل کرنے کی وجہ نمرہ احمد کا "قراقرم کا تاج محل" ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پریشے کا کردار فرضی ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ کہانی توماز ہومرکی ہے میں نے نیٹ پر سرچ کیا تھا۔ آپ نمرہ سے یہ ضرور پوچھیے گا۔ خبر میں تو بتایا گیا ہے کہ توماز ہومرسولو کلائمب کر رہا تھا تو اور پریشے کہاں سے آ گئیں؟ اس ماہ کی بہترین کہانی کنیز نبوی کی تھی۔ کیا خوب صورت لکھا اور شاہ لطیف کی بیتوں نے تو کہانی کو چار چاند لگا دیے اور افسانوں میں سب سے اچھا سیما بنت عاصم کا "دس فیصد" تھا۔ سلسلے وار ناولز تینوں ہی اچھے لگے۔ خاص طور پر "زرد موسم" اسے تو کتابی شکل میں ضرور آنا چاہیے کیونکہ اس کے کردار ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں فائزہ جی کے "داسی ڈھولن یار دی" میں یاسر کے ساتھ بھی برا ہونا چاہیے۔ اور ہاں ٹائٹل گرل کیا ماریہ ہے؟ باقی پورا شمارہ بہت اچھا تھا۔

★ زنیرہ اور نایاب! یاد آوری کا شکریہ۔ ٹائٹل پر عذرا صدیق کی تصویر تھی۔ نمرہ نے ایک ایسے موضوع پر ناول لکھا جس پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ انہوں نے بہت خوب صورتی سے موضوع سے انصاف کیا۔ قارئین نے بے حد پسند کیا' اب یہ سوال کہ کہانی سچی تھی یا جھوٹی پریشے تھی یا نہیں' بے معنی لگتے ہیں؟

اسلام آباد سے سدرہ اعجاز اپنی ای میل کے ساتھ رونق افروز ہیں۔

اس بار محمود ریاض صاحب کا انٹرویو پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ "زرد موسم" پڑھ کر راحت آپی کو داد دینے کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں شکر ہے کہ ایمن کو عقل تو آئی۔ "دیوارِ شب" میں ایک ہی وقت میں معاشرے کی کتنی ہی خامیاں گنوائی ہیں۔ یہ منفرد انداز صرف اور صرف عائشہ بخاری ہی کا کام ہے۔ کنیز نبوی نے محبت کی ایک نئی تعریف سے روشناس کروایا اور بے اختیار آنکھیں بھیگ گئیں۔ نجانے "داسی ڈھولن یار دی" میں انجام کیا ہو گا۔ مجھے سوچ کر بہت ڈر لگتا ہے۔ خیر' باقی اس بار پورا پرچا شاندار رہا۔ البتہ کچھ مہینوں سے شاعری کا انتخاب پسند نہیں آ رہا۔

★ سدرہ! یاد آوری کا شکریہ' متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رسالہ فورڈ ڈسٹرکٹ اوکاڑہ سے صبا افضل بٹ اپنی ای میل کے ساتھ تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں۔

اس بار ٹائٹل گرل دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد اسکیچز دیکھے ان میں "آشنائیاں کیا کیا" کے اسکیچز اچھے لگے۔ اس کے بعد حمد و نعت سے دل کو تر و تازہ کیا۔ "پیاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں" پڑھ کر ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔ مکمل ناول میں اسماء قادری کا ناول بہت زبردست تھا اور کنیز نبوی کا "تشنگی کا سفر" بھی بہت اچھا تھا۔ "داسی ڈھولن یار دی" میں شکر ہے کہ گل کو تھوڑی عقل تو آئی۔ لیکن اب اس نے یہ کیوں کہا کہ وہی زمین کو کہیں لے کر گئی تھی؟ اور چھنو کا انجام تو بہت اچھا ہوا۔ زہرہ ممتاز کا "اندھیرے میں اجالا" بہت اچھا لگا۔ سلسلے وار ناولز میں "زرد موسم" راحت جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانوں میں "مکافاتِ عمل" اور "دس فیصد" بہت ہی اچھے تھے۔ میں اور اسکیچز بنا کر بھیجوں تو آپ شائع کریں گی؟

★ صبا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے جو اسکیچز بنا کر بھیجے تھے۔ وہ شائع نہیں ہو سکتے۔ آپ مزید اسکیچ نہ بھجوائیں۔ دراصل اس کے لیے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خاص قسم کے قلم اور انک سے بنائے جاتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	مونا لیزا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا

کچھ یادیں کچھ باتیں

مرینہ خان

شاہین رشید

ابتدائی زندگی

میں 26 دسمبر 1962ء کو پشاور میں پیدا ہوئی۔ میرا نام میرے والدین نے رکھا اور میرے نام کا مطلب "سمندر سے تعلق رکھنے والی" ہے۔ ویسے بھی میرا نام بہت یونیک ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اس زمانے میں بھی "مرینہ" نام کی لڑکیاں بہت کم ہیں۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں سب سے منفرد رہوں۔ چنانچہ نام کے معاملے میں تو میں منفرد ہوں ہی۔ کام کے معاملے میں بھی میں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہوئی ہے۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی ہوں اور بھائی چھوٹا اس کا نام "زرک" ہے۔ بھائی کو بھی پیار سے کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن مجھے میری ماں "ماڈی" اور میرے والد "پپی" کہہ کر پکارتے ہیں۔

میرے والد کا نام "رحمت خان ہے" جبکہ والدہ کا نام "اینا" ہے۔ والد فضائیہ میں "ایئر وائس مارشل" کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ میری والدہ کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ میرے والدین کی لو میرج تھی اور انہوں نے ایک انتہائی بھرپور اور خوشحال زندگی گزاری اور اس بات کو جھوٹ ثابت کر دکھایا کہ لو میرج کامیاب نہیں ہوتیں اور یہ بات بھی سچ ثابت ہوئی کہ جوڑے اللہ تعالیٰ خود بناتا ہے۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میری والدہ میرے چچا کی کلاس فیلو تھیں اور ایک مرتبہ میرے چچا سے ملنے انڈیا آئی تھیں جہاں ان کی ملاقات میرے والد محترم سے ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور اللہ کا بنایا ہوا جوڑا زمین پر مکمل ہوا۔

بچپن

بچپن بہت اچھا گزرا' چونکہ ابا ہمارے ایئر فورس میں تھے تو بہت ساری جگہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری تعلیم اس لیے مختلف اسکولوں میں ہوئی کہ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر' لیکن بھائی کے لیے والدین نے یہ عقلمندی کی کہ اسے بورڈنگ میں داخل کرا دیا تاکہ اس کی پڑھائی متاثر نہ ہو' بھائی چھٹیوں میں گھر آتا تھا اس کے ساتھ شرارتیں کرنے اور لڑنے جھگڑنے کو بہت دل چاہتا تھا لیکن میں ایسا کچھ نہیں کرتی تھی کیونکہ میرے دل میں یہی خیال آتا تھا کہ ہائے میرا بھائی چند دنوں کے لیے تو آیا ہے اب اس معصوم سے کیا لڑنا جھگڑنا۔ میں پڑھائی میں زیادہ اچھی نہیں تھی اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی اس شہر اور کبھی اس شہر' اور چونکہ ہمارے گھر میں پڑھائی کی بہت اہمیت تھی اس لیے میں نے بھی گریجویشن کر ہی لیا۔ گریجویشن میں نے پی ای سی ایچ ایس کراچی سے کیا۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ بچپن بہت اچھا گزرا۔ شہر شہر گھومنے کی وجہ سے سیاحت کی شوقین بھی ہو گئی تھی لیکن جب بہت چھوٹی تھی تو گڑیوں سے کھیلنا' ان کے گھر بنانا۔ دوستوں کے ساتھ شرارتیں کرنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور ان شرارتوں کی وجہ سے اکثر میں اپنے والدین سے مار بھی خوب کھایا کرتی تھی۔ امی زیادہ تر ڈانٹتی تھیں جبکہ ابا زیادہ تر مارتے تھے۔ امی نے مجھے مارنے کے لیے ایک بڑا سا ڈنڈا رکھا ہوا تھا مگر مجھے اس سے مارا کبھی نہیں مگر میں اس ڈنڈے سے ڈرتی بہت تھی۔ امی کی اور بھی بہت سی سختیاں تھیں کہ گھر کو صاف ستھرا رکھوں' اپنا خیال رکھوں' صاف ستھری رہوں مگر یہ سب کچھ مجھ سے کہاں ہوتا تھا۔ بس اسی وجہ سے امی تو زیادہ تر ناراض ہی رہتی تھیں۔

یادگار لمحے

بہت سے یادگار لمحے ہیں۔ مثلاً "سمندر کے کنارے گیلی ریت پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنانا۔ پھر انہیں خود ہی توڑ دینا۔ کبھی گھروندے بنانا پھر مٹی کے کھلونے بنا کر ان گھروں میں سجانا اور جب پانی کی لہر آ کر سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی تھی تو دیر تک رونا کہ ایسا کیوں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارا گھر چھوٹی سی پہاڑی پر ہوا کرتا تھا' اس وقت ابا جیس کمانڈر تھے ان دونوں سیکٹر پر جنگ ہو رہی تھی تو ابا کہتے تھے کہ گھر میں رہا کرو۔ مگر مجھے کہاں چین تھا۔ میں گولہ باری میں بھی گھومتی رہتی تھی۔ تب مجھے یاد ہے کہ ابا نے ایک دن مجھے بہت مارا تھا کہ اب میں تمہیں گھر سے باہر نہ دیکھوں۔ بچپن کی وہ مار مجھے آج تک یاد ہے۔ تو ایسی چھوٹی موٹی یادیں تو بہت ساری ہیں اور یہی یادیں تو انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ انہیں کبھی بھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ٹی وی پہ آمد

باوجود اس کے کہ میں نے بچپن میں بہت ڈانٹ مار کھائی ہے میرے اندر کی شرارتوں میں تھوڑی کمی تو آ گئی مگر ختم نہیں ہوئیں' بس شرارتوں کے لیے کسی کے چنگی بھرنے کی دیر ہوتی ہے اور میرا شرارتوں بھرا بچپن اور اندر کی شرارتی لڑکی جاگ جاتی ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد تھوڑی سمجھ دار ہوئی تو طبیعت میں پتا نہیں کہاں سے سنجیدگی آ گئی اور میں زیادہ بولتی بھی نہیں تھی۔ شاید ایسا سب لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ جب وہ جوانی کی سیڑھی پہ قدم رکھتی ہیں تو ان میں نہ جانے کہاں سے سنجیدگی اور بردباری آ جاتی ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوتا بلکہ ایک آدھ سال کے بعد ہی لڑکی اپنی روٹین میں واپس آ جاتی ہے۔ شاید اس کے اندر جو اچانک تبدیلی آئی ہے وہ اسے تھوڑا سا سنجیدہ بنا دیتی ہے۔

تو جب میری طبیعت میں سنجیدگی آئی تو مجھے "راشد منہاس" میں کام کرنے کی پیشکش آئی۔ چونکہ میں فوجیوں کی زندگی کے کافی قریب رہ چکی تھی' شاید اس لیے مجھے یہ کردار آفر ہوا تھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا' لیکن والدین کی وجہ سے میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے رضامندی دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک ہی ڈرامے میں کام کروں گی' پھر نہیں۔ مگر جب کام کیا اور پہچان ملی تو دل چاہا کہ مزید کام کروں۔ اس کے بعد حسینہ معین صاحبہ کے ڈراموں میں کام کرنے کا موقع ملا اور ڈراموں میں وہ کردار کیے جو میری نیچر کے بہت قریب تھے اور ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ ہوسٹنگ کے پروگرام بھی پرائیویٹ چینل اے آر وائی سے کافی کیے۔ آج کل اپنے میاں صاحب کے ساتھ پروڈکشن میں ہوں۔

شادی

لڑکیوں کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔ ابتداء میں وہ اس بات کو نہیں سمجھتیں لیکن شادی کے بعد یا بہت عرصہ غیر شادی شدہ رہنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے شادی کتنی ضروری ہے۔ بے شک بیٹی والدین پر بوجھ نہیں ہوتی اور اگر وہ خود کما رہی ہو تب بھی کسی پہ بوجھ نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی.... میرا بھی شادی کا کوئی ارادہ اور خواہش نہیں تھی' میں تو اپنے گھر میں اپنے جانوروں کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ والدین کہتے بھی تھے کہ شادی کر لو مگر میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی تھی۔

لیکن جب میری ملاقات جلیل اختر سے ہوئی تو احساس ہوا کہ شادی نہ کرنا یا کسی کو اپنا لائف پارٹنر نہ بنانا کتنی بڑی

بے وقوفی ہے۔ 1989ء میں میری شادی ہوئی۔ بچے نہیں ہیں میرے پاس۔ یہ اللہ کی دین ہے وہ جس کو نوازے۔ مجھے اپنے کتوں اور بلیوں سے بہت پیار ہے۔ وہ میرے ساتھ میرے بیڈ پر میری اولاد کی طرح بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔

جلیل اختر سے میری ملاقات 1987ء میں میری ایک دوست کے گھر ہوئی۔ میں اپنی دوست کی منگنی میں گئی ہوئی تھی۔ وہاں جلیل بھی آئے ہوئے تھے۔ دعا سلام ہوئی اور آہستہ آہستہ دوستی پروان چڑھتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ جلیل بہت ہی ذہین ہیں۔ اندازِ گفتگو اور خیالات بہت عمدہ ہیں۔ میں آہستہ آہستہ ان سے بے انتہا متاثر ہوتی گئی۔ انسان جب ایک دوسرے کے قریب رہتا ہے تو اسے اس کی زیادہ قدر نہیں ہوتی' لیکن جب وہ اس سے دور ہوتا ہے' درمیان میں فاصلہ آجاتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ ہم تو ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ اس کا احساس مجھے اس وقت شدت سے ہوا جب میں انٹیریر ڈیزائننگ کا کورس کرنے انگلینڈ گئی جب تک میں انگلینڈ میں رہی جلیل سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ فون بھی کتنا بہترین ذریعہ ہے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا۔ دلوں کا حال بتانے کا۔ ان دو سالوں میں ہماری آپس میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی اور جب میں پاکستان آئی تو میں نے خود جلیل سے کہا کہ "میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

والدین کو اپنی پسند بتائی تو وہ اس بات پر راضی نہیں تھے۔ مگر پھر وہ کسی نے سچ کہا ہے کہ والدین کے لیے اولاد سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ اور یوں سب کی رضامندی سے ہماری شادی ہو گئی۔ آج 19 سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم بہت مطمئن اور بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

جلیل ہر لحاظ سے ایک بہترین شوہر ہیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میرے کام کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں' نہ صرف تعریف کرتے ہیں بلکہ مزید کچھ کرنے کے لیے میری حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ جلیل کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ بات کو سمجھتے ہیں اور بہت کمپرومائزنگ ہیں۔ جلیل ایک بہت اچھے ڈائریکٹر ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ کام کرواتی ہوں کیونکہ ہم دونوں کی سوچ ایک ہی ہے۔

ہم دونوں کا مشترکہ بینک اکاؤنٹ ہے اور خرچ کے معاملے میں ہم بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اندازہ ہے کہ کمانا کتنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہم دونوں کی فیلڈ بھی ایک ہی ہے۔

مزاج

میرے بارے میں تو آپ سب کو معلوم ہے کہ میں ہنس مکھ طبیعت کی مالک ہوں لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب سے ہی اس انداز میں بات کروں۔ میں کسی سے جلدی فری نہیں ہوتی اور جس سے میری دوستی ہو جاتی ہے پھر اس کو چھوڑتی نہیں ہوں۔ میری طبیعت میں غصہ ہے۔ مگر بہت زیادہ نہیں اور عموماً" اس وقت غصہ آتا ہے جب کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو رہا ہوتا ہے۔ جلیل بھی مزاج کے بہت اچھے ہیں' انہیں بھی غصہ کم آتا ہے اور کسی سے دیر تک تو ناراض رہ ہی نہیں سکتے اور مجھ سے تو ناراض ہونے کا تصور بھی نہیں کرتے۔

جو گزر گیا سو گزر گیا

جی ہاں۔ میرا بھی یہی نظریہ ہے کہ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ حال کی فکر کرنی چاہیے۔ مستقبل کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ جو کچھ کرے گا ہمارے حق میں بہتر ہی کرے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں جو فیصلے کیے مجھے ان پر کوئی پچھتاوا نہیں کیونکہ میرا کیا ہوا کوئی فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت مصروف رکھا ہوا ہے۔ اس لیے تنہائی میں بیٹھ کر فضول باتیں سوچنے کا مجھے ٹائم ہی نہیں ملتا۔ شوبز کی مصروفیت نے میرے جسم میں چستی سی بھر دی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں ایک اچھی اداکارہ' اچھی ہوسٹ' اچھی خاتون خانہ اور اچھی بیوی ہوں۔ اچھی اداکارہ اور اچھی ہوسٹ میں خود اپنے آپ کو نہیں کہہ رہی بلکہ یہ میرے ناظرین مجھے کہتے ہیں اور اچھی بیوی اور اچھی خاتونِ خانہ کا خطاب میرے شوہر نے مجھے دیا ہے۔

غزل قمر

نابغہ روزگار

بعض لوگوں کو مٹی کو سونا بنانے کا فن آتا ہے۔ جہاں جاتے ہیں جھنڈے گاڑتے ہیں۔ سہیل رانا بھی فن موسیقی کی تاریخ کے ایسے ہی چراغ ہیں' جنہوں نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں سے روشنی بکھیری۔ فلم "دوراہا' ارمان' احسان' میرے ہم سفر' دل دیوانہ" کے گانے آج بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں' جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ نازیہ حسن' زوہیب حسن' محمد علی شہکی' امجد حسین' مونا سسٹرز' عدنان سمیع خان' حدیقہ کیانی جیسے نام ان کی بدولت منظرِ عام پر آئے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔ "پرانی کہاوت ہے کہ پتھروں کے ڈھیر سے چاہیں تو گرجا بنا لیں یا قلعہ' بات صرف ان پتھروں کی ترتیب کی ہے۔ میں نے اس کلیے کو موسیقی پر لاگو کیا۔ سات سُروں سے آپ سمفنی بھی بنا سکتے ہیں۔ ملی نغمہ بھی اور بچوں کا گیت بھی۔ حقیقت میں میں نے بچوں کے لیے کام سے بہت سیکھا۔ میرا مقصد محض آدھا گھنٹے کی تفریح دینا نہیں تھا بلکہ باتوں باتوں میں تاریخ' اقدار' محبت' اور اخلاقیات سے متعارف کرواتا تھا۔ مجھے بارہ اسلامی مہینے یاد نہیں ہوتے تھے اس لیے میں نے "بارہ مہینے اسلامی مہینے کے یاد رکھیں۔" بنایا۔ میرے بنائے گیت اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔ میرے خیال سے مجھے اسی کام کے لیے چنا گیا' اس کے لیے میں نے کلاسیکل' فوک' ملی نغموں غرضیکہ ہر رنگ میں نئی اختراع لانی چاہی اور اس میں جتنی کامیابی ملی وہ اللہ کی دین ہے۔" (دوسروں کے لیے راہ نکالنے والوں کو خدا ایسے ہی نوازتا ہے۔)

خراجِ تحسین

اقبال بانو اب اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن ان کی غزل' سریلی آواز کی تانیں' سننے والوں کو ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔ موسیقی کے ممتاز ریسرچر ڈاکٹر عمر عادل ان کے حوالے سے یاد تازہ کرتے ہیں کہ "ٹھمری گانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ایسی آواز صدیوں بعد جنم لیتی ہے۔ بیگم اختر کے بعد

ٹھمری گانے والیوں میں انہی کا نام لیا جاتا تھا۔ اپنے وقت کے بہترین موسیقار ماسٹر عنایت حسین، بابا اے چشتی نے ان کے لیے زبردست دھنیں ترتیب دیں اور نامور شعراء نے نا صرف ان کے لیے شعر کہے۔ قتیل شفائی اپنی ہر فلم میں ان کے لیے ایک خاص گانا لکھتے تھے جو ٹھمری انگ میں ہوتا تھا۔ فیض احمد فیض کی نظم "ہم دیکھیں گے" نے نا صرف انہیں شہرت دی، بلکہ فیض احمد فیض کو بھی عام لوگوں میں متعارف کروایا۔ بعد میں فیض صاحب نے ان کے لیے دشت تنہائی بطورِ خاص لکھی۔

انہیں فارسی کی بے شمار غزلیں ازبر تھیں۔ مجھے ان کی موت کا غم اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ میری مریضہ بھی تھیں۔ وہ اپنی پرانی یادیں میرے سامنے دُہراتی رہتی تھیں۔ جن اداروں کے لیے انہوں نے بے مثل گانے گائے ان کی بے حسی پر شدید افسوس ہوتا ہے۔ جس قدر جزئیات سے اقبال بانو کے دور کے فنکار کام کرتے تھے آج کل کے گلوکاروں میں دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ فاسٹ فوڈ میوزک کے اس دور میں یوں لگتا ہے کہ ہر چیز روبہ زوال ہے۔" (موجودہ موسیقی پر اس سے بہتر تبصرہ ہو بھی نہیں سکتا)

اسکینڈل

سعدیہ امام ان دنوں پس منظر میں ہیں لیکن منظر عام پر

رہنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں جو فن کاروں کو خوب ازبر رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں سعدیہ امام کی اداکار فیصل قریشی سے شادی کی خبریں خوب گردش میں رہیں۔ جس پر فیصل تو چپ رہے لیکن سعدیہ امام نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری شادی اور فیصل کے ساتھ؟ ایسا کس طرح ممکن ہے؟ وہ تو بالکل میرے بھائیوں کی طرح ہے (منہ بولے بھائی بنانے کی عادت گئی نہیں) شادی ہو رہی ہے لیکن میری نہیں بلکہ میری بہن کی۔ ابھی میری شادی کی عمر نہیں ہے۔ (خیر سے ابھی تو آپ کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے) ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میری زندگی میں ابھی شادی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر میرا اسکینڈل امریکی صدر اوباما کے ساتھ بنایا جاتا تو کچھ بات بھی تھی۔ (اوباما نے تو اپنے ہم نسل اور ہم وطن کو عزت دی، آپ بھی یہ اعزاز یہاں کے کسی بندے کو بخش دیں۔)

نئی تازی

پاکستانی فلم نگری میں مستقل مندی چھائی ہے۔ اسی لیے زیادہ تر فنکاروں نے چھوٹی اسکرین پر جگہ بنائی ہے۔ اور وہ جو عرصے سے سینما اسکرین سے غائب ہیں نئی انٹری ٹی وی پر دینا چاہتے ہیں۔ اب ماضی کے مقبول اداکارہ صاحبہ کو ہی لیں جو دوبارہ سے شوبز کی دنیا میں قدم رکھنے والی ہیں۔ کیمرے کے سامنے نہیں بلکہ پیچھے یعنی جویریہ سعود کی طرح ان کا ارادہ بھی ذاتی پروڈکشن ہاؤس میں ڈرامے

بنانے کا ہے اور اس کام میں شوہر ریمبو ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ صاحبہ کا کہنا ہے کہ ان دنوں وہ اسکرپٹ پر کام کروا رہی ہیں اس کے بعد ہی ہدایت کار سمیت دیگر فنکاروں کا تعین بھی ہوگا۔ یوں لگتا ہے کہ جویریہ سعود کے کامیاب تجربے نے انہیں یہ حوصلہ بخشا ہے۔ جس میں شہرت بھی ہے اور پیسہ بھی لیکن بھولی بھالی گھر گرہستی کرنے والی صاحبہ کو ابھی اس چکا چوند سے نبرد آزما ہونے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔

پابندی

پاکستانی کرکٹ پر مایوسی کا موسم بدستور طاری ہے۔ سانحہ لاہور نے چیمپئن ٹرافی کا انعقاد ناممکن بنایا تو تھا ہی اب 2011ء کے کرکٹ ورلڈ کپ سے بھی محروم کر دیا ہے۔ جس سے سب سے زیادہ فائدہ پڑوسی ملک بھارت کو ہوا ہے۔ ظاہر ہے پاکستان مخالف کیمپ میں بھارت بھی شامل تھا۔ ایشیائی ممالک نے مشکل کی اس گھڑی میں پاکستان کا ساتھ دینے کے بجائے مجرمانہ خاموشی میں عافیت جانی۔ اس معاملے کے متعلق سابق ٹیسٹ کرکٹر معین خان کا کہنا ہے کہ "بھارت نے جس طرح پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے اس پر بورڈ کو چاہیے کہ وہ آئی سی ایل کھیلنے والے تمام کھلاڑیوں پر سے پابندی اٹھائے۔ ویسے بھی یہ پابندی سابقہ چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف نے بھارتی بورڈ کے دباؤ میں آ کر لگائی تھی۔ آئی سی سی نے پابندی کو ہر ملک کا اندرونی معاملہ قرار دے دیا ہے۔ جس کے بعد ان پر پابندی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔" (ممکن ہے قومی حمیت پر لگنے والی اس چوٹ پر انتظامیہ کے سوئے جذبات جاگ ہی جائیں۔ آخر معجزات اسی دنیا میں ہوتے ہیں)

کچھ ادھر ادھر سے

★ تمام مسلمان بھارت سے دفع ہو جائیں۔

(اندرا گاندھی کا نواسہ ارون گاندھی)

★ پاکستانی عوام ڈرون حملوں کو نہ دیکھیں، امریکی امداد کو دیکھیں۔

(گورنر پنجاب سلمان تاثیر)

★ مخدوم جاوید ہاشمی نے این آر او کے تحت کسی رعایت سے انکار کر دیا۔ این آر او کے بعد بھی وہ قید میں رہے۔

(عبدالقادر حسن)

★ لال مسجد میں بہت سی عورتیں اور بچے مارے گئے تھے۔ اگر اکبر بگٹی کے قتل کی تحقیقات ہوئیں تو عدالت میں جا کر گواہی دوں گا کہ اکبر بگٹی معاملات طے کرنے پر رضامند ہو چکے تھے لیکن مشرف کے حکم پر ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔

(چوہدری شجاعت حسین)

★ راہول گاندھی نے اچھوت لوگوں کی بستی میں کچھ وقت گزارا اس کے بعد دو گھنٹے تک نہاتے رہے۔

(مایاوتی اچھوت لیڈر)

پھرتی

راحت فتح علی خان باکمال گلوکار ہیں اور ان دنوں سرحد کے دونوں جانب مقبول بھی خاصے ہیں۔ اس لیے اپنی شہرت کو خوب کیش کروا رہے ہیں۔ اچھی آفر قبول کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ گزشتہ دنوں ایسی ہی پھرتی انہوں نے اس وقت دکھائی جب پڑوسی ملک سے فلم "لو آج کل" کے لیے موسیقار پریتم اور ہدایت کار امتیاز علی نے انہیں ایمرجنسی میں گانے کی پیش کش کی۔ جسے محض دو گھنٹے میں یہاں کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کر کے بذریعہ ای میل وہاں روانہ بھی کر دیا گیا۔ اس سے ایک بات تو ثابت ہوئی کہ چاہے زلزلہ آئے یا طوفان ہمارے فنکار وہاں کی آفرز کو "نعمت" سے کم نہیں سمجھتے۔ اس لیے معیار اور عزتِ نفس کسی چیز کی پروا بھی نہیں کرتے۔ آخر گھر بیٹھے آیا مال کسے برا لگتا ہے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دال پوری

ضروری اجزاء :

آٹے کے لیے

آٹا یا میدہ	چار پیالی
تیل	آدھی پیالی
نمک	چائے کا ایک چمچہ
نیم گرم پانی	حسبِ ضرورت

بھرائی کے لیے

ابلی مونگ دال	ایک پاؤ
سبز دھنیا	آدھی پیالی
سبز مرچیں	آدھی پیالی
سرخ مرچ	آدھی پیالی
سرخ مرچ پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
کچلی سبز مرچیں	چائے کا ایک چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ

ترکیب :

دال میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گلا لیں۔ جب ٹھنڈی ہو جائے تو بھرتہ سا بنا لیں، اب تمام مسالا بھرائی والا اس میں شامل کر کے دال دو حصوں میں کر لیں۔ آٹے یا میدے میں تمام اشیاء ملا کر گوندھ لیں۔ تھوڑی دیر رکھنے کے بعد چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لیں۔ اب ہر پیڑے کو ہتھیلی پہ پھیلا کر اس میں تھوڑی سی دال بھر کر دوبارہ پیڑا بنا لیں۔ اب حسبِ پسند بیل کر گرم تیل میں یہ پوریاں تل لیں۔ چٹنی یا اچار کے ساتھ دال بھری پوریاں بہت مزہ دیں گی۔

دال کے مزیدار کباب

ضروری اجزا :

مونگ کی دال	آدھی پیالی
چنے کی دال	آدھی پیالی
ریشہ دار مرغی	ایک پیالی
ابلے آلو	دو عدد
لیموں کا رس	کھانے کے دو چمچے
ابلا انڈا	ایک عدد (ٹکڑے کر لیں)
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
کاٹیج چیز	کھانے کے چار چمچے
سبز مرچیں	4 عدد (کتری ہوئی)
نمک	حسبِ ذائقہ
رائی کے دانے	چائے کا ڈیڑھ چمچہ
چلی گارلک سوس	چائے کے چار چمچے
سیاہ مرچ (کٹی ہوئی)	چائے کا ایک چمچہ
انڈا ایک عدد	(پھینٹ لیں)
ڈبل روٹی کا چورا	ایک پیالی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

بھیگی ہوئی دالوں کو اتنا ابالیں کہ تقریباً گل جائیں۔ پھر انہیں موٹا موٹا پیس لیں۔ ابلی ہوئی مرغی کے ریشے کر لیں۔ انڈے، تیل اور چورے کے علاوہ تمام اجزاء ملا کر کباب بنا لیں۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر چورے میں لپیٹ کر گرم تیل میں تل لیں۔ اور سبز چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

آلو اور دال کے لذیذ پراٹھے

ضروری اجزا :

مونگ کی دال	آدھی پیالی
آلو	دو عدد
آٹا	دو پیالی
ہرا دھنیا	چند پتے

ہری مرچ (کتری ہوئی)	چائے کے دو چمچے	ہرا دھنیا	ایک گٹھی باریک کٹا ہوا
لیموں کا رس	حسبِ ضرورت	میٹھا سوڈا	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ	تیل	ایک پیالی
سیاہ مرچ پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ	لال مرچ (پسی ہوئی)	کھانے کا آدھا چمچہ
چائنیز نمک	چائے کا آدھا چمچہ	دھنیا (پسا ہوا)	کھانے کا ایک چمچہ
تیل	حسبِ ضرورت	نمک	حسبِ ذائقہ
		اجوائن	چائے کا آدھا چمچہ
		ہری مرچ	چار عدد
		پیاز	تین ڈلی (کچی پسی ہوئی)

ترکیب :

آٹے میں تھوڑا نمک ڈال کر گوندھ لیں۔ آلو کو ابال کر چھیل کر کچل لیں۔ دال کو ابال کر آلو کے ساتھ اچھی طرح ملا لیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس، سیاہ مرچ پاؤڈر، چائنیز نمک اور نمک بھی ملا دیں۔ جب اچھی طرح مکس ہو جائے تو آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ایک پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا آمیزہ رکھیں، دوسرے پیڑے کو اس کے اوپر رکھیں پھر کنارے دبا کر روٹی کی طرح بیل لیں۔ توے پر تیل ڈال کر پراٹھے کی طرح گھی لگا کر سینک لیں۔ تیار ہونے پر رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

مونگ کی دال کے منگورے

ضروری اجزا :

مونگ کی دال	ایک پیالی
ہلدی	چائے کا ایک چمچہ
گرم مسالا (پسا ہوا)	چائے کا ایک چمچہ
ادرک لہسن (پسا ہوا)	کھانے کا ایک چمچہ

ترکیب :

سب سے پہلے بھیگی ہوئی مونگ کی دال کو سِل پر یا بلینڈر پر پیس لیں۔ پھر اس میں سوڈا، نمک، اجوائن، تھوڑی سی لال مرچ اور آدھا گرم مسالا ملا کر خوب اچھی طرح ہاتھ سے پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کریں۔ کچی پسی پیاز ڈال کر ہلکی گلابی کر لیں، پھر ہلدی، دھنیا، مرچ، گرم مسالا، ادرک، لہسن ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور تین سے چار پیالی پانی ڈال دیں۔ اب ایک کڑاہی لے کر تیل گرم کریں۔ دال کے پکوڑے تل لیں۔ جب سنہری مائل ہو جائیں تو تیار سالن میں ڈال دیں۔ جب سب پکوڑے شامل ہو جائیں تو ایک پیالی میں پانی شامل کریں۔ ہرا مسالا ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ جب تیل اوپر آ جائے تو منگورے تیار ہیں۔ منگورے ہمیشہ چھوٹے تلیں کیونکہ سالن میں یہ پھولتے ہیں۔

امتہ الصبور

التمبرہ کا غار

التمبرہ اسپین کا ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ اس کی وجہ شہرت اس میں موجود ایک تاریخی غار ہے، جسے التمبرہ کے غار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس غار کی وجہ شہرت اس میں موجود مختلف جانوروں کی دیدہ زیب تصاویر ہیں۔ التمبرہ کے غار میں قریب قریب ایک سو ستر جانوروں کی تصاویر صحیح سالم حالت میں موجود ہیں۔ غار کے سب سے کھلے حصے میں جہاں چھت چار، پانچ فٹ اونچی ہے، چھت پر پندرہ گز لمبا ایک منظر دکھایا گیا ہے، یہ ایک ہرن اور بیس ارنا بھینسوں کی جنگ کا منظر ہے، صرف دو گھوڑے اور دو سور ہرن کے حامی ہیں اور ہرن فتح حاصل کر چکا ہے، یہ تصویر پتھر کے زمانے کی مصوری کا ایک شاہکار ہے۔

اس غار میں مکمل طور پر اندھیرا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں اتنی حسین تصویریں بنانا آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے، مگر اس غار میں سے ایسی چیزیں بھی ملی ہیں۔ جن سے اس زمانے کے مصور چراغ کا کام لیتے تھے۔ ان تصویروں میں تین رنگ سرخ، زرد اور سیاہ استعمال ہوئے ہیں اور یہ تصویر صرف انسانی انگلیوں اور درخت کی شاخوں سے بنائی گئی ہیں۔

تصویروں کا باریک کام ہڈی کی پتلی پتلی تیلیوں سے لیا گیا ہے، ماہرین کا خیال ہے کہ التمبرہ کی یہ تصویریں آج سے بیس ہزار سے لے کر چالیس ہزار سال پرانی ہیں۔ ان کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے، ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناظر بالکل حقیقی ہیں اور ہزاروں سال گزرنے کے باوجود ان کی خوبصورتی ماند نہیں پڑی اور آج کا ترقی یافتہ انسان بھی ایسے شاہکار بنانے سے عاجز ہے۔

مصباح گل۔ سرگودھا

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی چھٹی نسل سے حضرت ادریس علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے کئی نام ہیں، یونانی زبان میں انہیں "ہرس" عبرانی میں "حنوک" عربی میں "اخنوخ" اور قرآن کی زبان میں ادریس (علیہ السلام) کے نام سے پکارا گیا ہے۔

ان کے وطن کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ ان کا تعلق مصر سے تھا۔ دوسرے کا خیال ہے کہ یہ بابل میں پیدا ہوئے اور ان کا تعلق دجلہ و فرات کے دوآبہ سے موجودہ کوفہ ان کا وطن تھا اور اسی پر اکثریت کا اتفاق ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کو بہت سے علوم حاصل تھے، انہیں علم نجوم، علم ریاضی، فن کتابت، کپڑے سینے کا فن، ناپ تول کے آلات اور اسلحہ سازی کے فن کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک فرشتہ آپ کے ساتھ 300 سال رہا اور کائنات کی تمام اشیاء کا علم آپ کو سکھایا۔ آپ کے پیروکاروں میں چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے ایک شخص کو سائے کی طرح آپ کے ساتھ دیکھا۔ اسے خلوت میں بھی دیکھا گیا اور جلوت میں بھی، انہوں نے اس کو باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ایسا لگتا تھا کہ یہ شخص گونگا، بہرہ ہے، مگر تخلیے میں اس کے ہونٹوں کو ہلتے دیکھا گیا۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ جس حصے میں حضرت ادریس علیہ السلام بیٹھے ہوتے تھے یہ شخص ٹہل بھی رہا ہے کچھ بول بھی رہا ہے، مگر اس کی آواز باہر نہیں آ رہی، یہ شخص گھنٹوں ٹہلتا رہتا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تک نظر نہ آتے، حضرت ادریس علیہ السلام شاگرد لگتے تھے اور یہ شخص ان کا معلم، لوگوں نے اس شخص کے بارے میں حضرت ادریس علیہ السلام سے سوال کیے مگر ان کے جواب نہیں ملے۔

حضرت ادریس علیہ السلام، اللہ کے حکم پر اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہجرت کر کے مصر تشریف لے آئے۔ مصر میں کم و بیش سترہ زبانیں رائج تھیں، ان تمام زبانوں کا جاننا نہایت مشکل تھا، مگر آپ کے پیروکار حیران تھے کہ آپ کو ان تمام زبانوں پر عبور حاصل تھا، آپ نے اپنے پیروکاروں کو جو تعلیم دی وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ کے طالبہ جب کامل و ماہر قرار پائے، انہوں نے تقریباً "دو سو" شہر آباد کیے، ان میں "رہا" نامی شہر اپنے آثار کی وجہ سے آج بھی موجود ہے۔

انسانوں نے سلائی کا فن بھی ادریس علیہ السلام سے سیکھا۔ علم نجوم کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے ذریعے ہی رائج ہوا۔ انہیں "ہرمیس الہرامسہ" بھی کہتے ہیں' جس کا مطلب ہے علم نجوم کا استاد اول' کیونکہ ہرمیس نامی شخص یونان میں مشہور منجم گزرا ہے' مصر میں جو اہرام پائے جاتے ہیں ان کی تعمیر میں جس فن سے کام لیا گیا ہے حضرت ادریس علیہ السلام اس کے بانی ہیں۔ اسے علم "جر ثقیل" بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے بڑی اور بھاری چیزوں کو بلندی پر لے جایا جا سکتا ہے' اور مصر کے بادشاہوں نے اس علم سے خوب فائدہ اٹھایا' آپ نے یہ علم مصر کے معماروں کو بخش دیا۔ اس لیے وہاں یہ علم عام ہو گیا' اور وہ خطہ "ممفس" کہلایا اور یہاں دنیا کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئیں' جنہیں اہرام کا نام دیا گیا' آج بھی ان عمارتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعمیر میں غیر انسانی ہاتھ ہیں' یہاں دیواروں پر جو تحریریں ملتی ہیں' وہ آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے حیران کن ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ نے ہمیں جو کچھ بتایا' آج نسل انسانی میں اس کی تائید و تردید کرنے والا کوئی بھی موجود نہیں ہے' لیکن اس بات پر سب ہی کا اتفاق ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں غیر انسانی ہاتھ ہیں اور یہ غیر انسانی مخلوق وہی فرشتہ یا فرشتے ہیں' جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے۔

ان کی قوم کے لوگ شاندار دینی و دنیاوی زندگی گزار رہے تھے۔ عبادت کا سلسلہ بھی جاری و ساری تھا' اللہ کے حضور قربانیاں بھی دی جا رہی تھیں' سال میں کئی عیدیں بھی منائی جاتی تھیں۔

دنیا کو اس قوم پر رشک تھا اور اس قوم کے لوگ زمانے کے استاد مانے جاتے تھے' آپ کے عہد کے مصوروں نے آپ کی شبیہ تیار کی اور آپ کا حلیہ محفوظ کیا اور آپ کی زندگی کے مختلف ادوار کو پتھروں میں محفوظ کر دیا' اور ان ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رنگ گندمی' قد و قامت پورا' سر پر بال کم تھے۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی' چہرے پر ملاحت اور رنگ و روپ و چہرے کے خطوط بہت خوبصورت تھے۔

آپ کی وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے' آپ نے ایک دفعہ اپنے رفیق فرشتے سے پوچھا کہ۔ "ابھی میری کتنی زندگی باقی ہے۔"

تو فرشتے نے جواب دیا کہ۔

"آپ میرے بازؤں پر بیٹھ جائیں' میں آپ کو موت کے فرشتے کے پاس لے جاتا ہوں' وہ آپ کو اس کا جواب بہتر طور پر دے سکتا ہے۔" چنانچہ آپ اس کے بازوؤں پر بیٹھ گئے اور وہ انہیں لے اڑا۔ جب وہ چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو دوسری طرف سے موت کا فرشتہ زمین کی طرف آ رہا تھا' دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو موت کے فرشتے نے پوچھا "کہاں کا قصد ہے؟" دوسرے فرشتے نے جواب دیا:

"کہ میں تیری طرف ہی جا رہا تھا' جسے ادریس علیہ السلام نے اپنی عمر معلوم کرنے پر مامور کیا ہے' اس کا علم تجھی کو ہو گا۔"

موت کے فرشتے نے کہا "جناب ادریس علیہ السلام اس وقت کہاں ہیں؟" "فرشتے نے کہا' میرے بازوؤں پر سوار ہیں۔" موت کے فرشتے نے کہا۔

"ابھی ابھی مجھے بارگاہ الٰہی سے یہ حکم ہوا کہ ادریس علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کر لوں' مجھے حیرت ہوئی یہ کیسے ممکن ہے' جبکہ ادریس زمین پر ہیں۔"

اسی وقت ادریس علیہ السلام کی روح موت کے فرشتے نے قبض کر لی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں کسی کو نہ پتا چل سکا کہ وہ کہاں گئے' آپ کی چوتھے آسمان پر موجودگی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شب اسراء کے واقعہ سے تصدیق ہوتی ہے۔

آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی قوم کے لوگ گریہ وزاری کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے پاس ایک شخص آیا' اس نے سب کو رونے سے منع کیا اور کہا کہ۔

"میں تمہارے باپ کی سی ایک صورت بنا دیتا ہوں' تم اس کو شب و روز دیکھتے رہو' اس طرح تمہارا غم جاتا رہے گا اور تم سب خوش رہو گے۔"

اس شخص نے کچھ عرصے بعد حضرت ادریس علیہ السلام کی بہترین شبیہہ تیار کر دی اور بالکل حضرت ادریس علیہ السلام جیسی تھی۔ لوگ اس شبیہہ کی پرستش کرنے لگے اور یوں رفتہ رفتہ دنیا میں بت پرستی عام ہو گئی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی شبیہہ تیار کرنے والا شخص ابلیس یعنی کہ شیطان تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی عمر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ 365 سال زندہ رہے۔ (واللہ و اعلم)

صائمہ بدر کھلابٹ ہری پور

ادارہ

خوبصورت بنیے

چہرے اور جلد کی نگہداشت

شخصیت کے نکھار کے لیے دو چیزیں زیادہ اہم ہیں ایک آپ کا چہرہ اور آپ کے بال' لہٰذا ان دونوں کی دیکھ بھال لازمی ہے' مہینے میں ایک بار کم از کم فیشل کریں اور بالوں کی نگہداشت کے لیے ان میں تیل لگانے کے ساتھ مناسب تراش خراش کراتی رہیں۔ تراش خراش ان معنوں میں کہ وقت کے ساتھ اور عدم توجہی کے باعث بالوں کی نوکیں پھٹ جاتی ہیں اور ان کے دو منہ بن جاتے ہیں جو بالوں کی صحت کے لیے خاص طور پر نقصان دہ ہیں۔ اس لیے مہینے میں ایک بار نوکوں کی تراش خراش لازمی ہے۔ پھر ہفتے میں ایک دو بار تیل لگانا بھی ضروری ہے۔ اس طرح آپ کے بال اندر سے صحت مند ہوں گے۔ جبکہ اگر آپ گھر سے روزانہ باہر نکل رہی ہیں تو ان کی مناسب صفائی بھی ضروری ہے۔ لہٰذا روزانہ انہیں کسی اچھے شیمپو سے دھو لیا کریں۔

بے رونق بالوں کے لیے

اگر آپ کے بال روکھے اور بے رونق ہیں یا ان میں خشکی ہے تو آپ اس طریقے سے ایک پیسٹ بنائیں۔

☆ کھانے کے چار چمچے دہی میں کھانے کے دو چمچے سرسوں یا زیتون یا کھوپرے کا تیل اچھی طرح ملائیں' پھر انہیں بالوں کی جڑوں میں اور چاروں طرف اچھی طرح لگا کر ایک گھنٹہ چھوڑ دیں' اس کے بعد اسے کسی اچھے شیمپو سے دھو لیں۔ اگر آپ ہفتے میں ایک بار یہ طریقہ آزمائیں تو آپ کے بالوں کی رنگت بدل جائے گی اور یہ ہمیشہ صحت مند اور چمکدار نظر آئیں گے' اگر ان میں خشکی ہو گی تو وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

جلد کی خوبصورتی کے لیے

چہرے کی جلد کو خوبصورت اور صحت مند بنانے کے ایک مفید نسخہ یہ ہے کہ آپ دو بڑے چمچے فیس واش میں ایک چمچہ شہد ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں اور اسے اپنے چہرے پہ لگا کے تھوڑی دیر چھوڑ دیں۔ پھر منہ دھو لیں۔ آپ دیکھیے گا آپ کا چہرہ کتنا نرم و ملائم اور تر و تازہ ہو جائے گا۔ آپ چاہیں تو فیس واش کی پوری ٹیوب کسی برتن میں نکال لیں اور اس سے آدھی مقدار شہد ملا کر پھینٹ لیں اور اسے کسی بوتل میں بند کر کے فریج میں رکھ لیں اور روزانہ اسی سے منہ دھوئیں' اگر آپ اسے اپنی عادت بنا لیں گی تو پھر آپ خود دیکھیں گی کہ آپ کا چہرہ کتنا نکھر جائے گا۔

☆ اس کے علاوہ آپ جو کا آٹا لے لیں اور اس میں سوکھا دودھ برابر مقدار میں ملا کر پانی سے پیسٹ بنائیں اور اس پیسٹ کو چہرے پہ لگا کر چھوڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد منہ دھو لیں' پھر دیکھیں چہرے پہ کتنا نکھار آتا ہے۔

اگر آپ کو اپنے چہرے کی جلد مستقل طور پر صحت مند اور خوبصورت بنانا ہے تو آپ ان چند باتوں پر سختی سے عمل کریں۔

☆ پانی آپ کے جسم کے لیے ایک ٹانک کا کام کرتا ہے'

آپ سب سے پہلے خوب سارا پانی پینے کو اپنی عادت بنالیں۔ آپ کا جسم اندر سے صحت مند ہوتا ہے تو آپ کی جلد چمک اٹھتی ہے۔

☆ پیٹ کی گرمی ہمیشہ چہرے پہ دانوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے' لہٰذا آپ دن بھر میں خوب سارا پانی پئیں' کم از کم بارہ سے اٹھارہ گلاس۔ اس کے علاوہ آپ اپنی غذا میں سبزی اور پھل کا استعمال بڑھادیں' کچی سبزی زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اس طرح آپ کے چہرے کی جلد کو اندر سے ایک طاقت ملے گی اور یہ دانوں اور داغ دھبوں سے پاک ہوجائے گی۔

گھریلو نسخے

چہرے اور بالوں کو خوبصورت اور تندرست بنانے کے لیے چند گھریلو نسخے پیش خدمت ہیں۔

☆ چہرے کی رنگت صاف کرنے کے لیے ایلوویرا کے رس میں بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اور ہفتے میں دو سے تین بار لگائیں۔ جب یہ پیسٹ آپ کی جلد پر اچھی طرح جذب ہوجائے تو تازہ پانی سے منہ دھولیں۔ اسے لگانے کے بعد سکون سے آنکھیں بند کرکے لیٹ جائیں' کسی سے بات نہ کریں۔

☆ بالوں کو لمبا کرنے کے لیے میتھی دانہ' ماش کی دال اور سنا کائی تینوں کو ملا کر پاؤڈر بنالیں۔ رات بھر بھگو دیں' صبح نہانے سے ایک گھنٹہ پہلے سر پہ لگا کر اچھی طرح مساج کریں اور صاف پانی سے دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم دوبار ضرور کریں' پھر نتیجہ دیکھیں۔

میک اپ کے ضروری نکات

میک اپ کرنے سے پہلے اس کے ضروری اور اہم نکات کو ضرور بہ نظر رکھیں تاکہ آپ کا میک اپ زیادہ خوب صورت اور موثر دکھائی دے۔ مثلاً"

☆ لپ اسٹک اور نیل پالش ہم رنگ استعمال کیجیے۔ اس سے میک اپ کے باوجود شخصیت میں وقار پیدا ہوگا۔ یعنی شخصیت مزید دلکش محسوس ہوگی۔ آنکھوں کا میک اپ گہرا ہے تو لپ اسٹک بھی گہرے رنگ کی استعمال کریں تو زیادہ بہتر لگتی ہے۔

☆ ہاتھ' پیروں اور گردن کی مکمل صفائی کے بغیر کیا جانے والا میک اپ بے تاثر نظر آتا ہے' عید سے ایک دن قبل ہاتھوں اور پیروں کی صفائی پر توجہ دیں۔

☆ ہاتھوں اور پیروں کے ناخن بھی ایک دو روز پہلے تراش لیں۔ نیم گرم پانی میں ڈیٹول' لیموں کا رس اور شیمپو ملائیں' اب اس میں دس منٹ پیروں کو ڈبو کر رکھنے کے بعد صاف کریں پھر جھانوے سے رگڑ کر پیروں کو دھولیں۔ اس کے بعد لیموں کے ٹکڑے لیجیے انہیں چینی لگائیں اور ہاتھوں' بازوؤں اور کہنیوں کو رگڑیں' اس عمل سے جلد کی رنگت نکھر جائے گی۔

☆ اگر آپ کے میک اپ کے سامان میں بلشر نہیں ہے تو کوئی بات نہیں' آپ لپ اسٹک استعمال کر سکتی ہیں' وہ اس طرح کہ اپنی ہتھیلیوں پر لپ اسٹک لیں' تھوڑی سی کولڈ کریم کے ساتھ ملا کر یک جان کرلیں۔ اب اسے بلشر کی جگہ بخوبی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆ اگر آپ چاہتی ہیں کہ عید کے دن آپ کے بال چمکدار نظر آئیں تو ایک دن پہلے بالوں میں کنڈیشنگ کیجیے۔ بال دھو کر ان میں جڑوں سے سروں تک کنڈیشنر لگا کر اور ٹھنڈے پانی سے بال دھولیں۔ قدرتی ہوا میں خشک ہونے دیں اور سر لٹکا کر بالوں میں گردن سے ماتھے کی جانب برش کریں اس عمل سے سر کا دوران خون بڑھے گا اور بال چمکدار جاندار اور خوب صورت نظر آئیں گے۔

☆